جُدا ہو دیں سیاست سے ...!

۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء کے سیاسی تجزیے

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور
36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501
email: maktaba@tanzeem.org

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتابوں' تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے' قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے' تحریری اجازت بلامعاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کرلے۔ اگر کوئی فرد/ پبلشر معیّن کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب ——— جُدا ہو دیں سیاست سے......!

طبع اوّل (دسمبر 2022ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشرو اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ——— مکتبہ جدید پریس' لاہور

قیمت ——— 600 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 087 - 1

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

فہرست

پاکستانی سیاست ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی نظر میں (پیش لفظ)	4
خوشی اور غم کا بیک وقت اجتماع	7
فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز	11
اندیشہ ہائے دُور دراز	25
آپریشن فیئر پلے: دورِ ثانی	27
پندرھویں صدی ہجری کا آغاز	32
اسلامی قانون کی تنفیذ اور فقہی اختلاف	72
سیاست میں اسلام دوست طبقہ	88
مجلس شوریٰ میں شمولیت	117
مجلس شوریٰ سے خطاب اور استعفاء	146
قومی ترانے کے لیے ''قیام'' اور پرچم کو ''سلام''	151
محترم جناب جنرل محمد ضیاء الحق!	159
سیاسی تعطل کا خاتمہ: ایک تجویز	166
کرکٹ: ایک وضاحتی بیان	175
سندھ کی صورتِ حال اور اصلاحِ احوال	177
''عرب نیوز'' کو صدرِ مملکت کے انٹرویو پر وضاحتی بیان	203
دورۂ حیدر آباد (دکن) + قادیانیوں سے متعلق آرڈیننس	207
اسلام آ رہا ہے! کیا واقعی؟	227
قصاص اور دیت کا مسودۂ قانون	260

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

پاکستانی سیاست
ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی نظر میں

یہ کتاب بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے اُن سیاسی تجزیوں اور حالاتِ حاضرہ پر تبصروں کے ایک انتخاب پر مشتمل ہے جو مارچ ۱۹۷۴ء سے نومبر ۱۹۸۴ء کے دوران ماہنامہ ''میثاق'' میں تصریحات و توضیحات' خطابات اور خطباتِ جمعہ کے طور پر شائع ہوئے۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے پُرمغز اداریے ''اسلام اور پاکستان'' نامی کتاب کی صورت میں دستیاب ہیں جبکہ جنوری ۱۹۶۹ء سے فروری ۱۹۷۳ء کے دوران ''میثاق' میں کیے گئے سیاسی تجزیوں کو ''پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور'' کے نام سے مطبوعہ شکل میں ڈھالا گیا۔ ''جدا ہو دیں سیاست سے'' کو اسی سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم اور سیرت رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں نصح و خیرخواہی کے جذبے کے تحت حالاتِ حاضرہ کا مبنی بر عدل تجزیہ کرنا اور قومی' مذہبی سیاسی جماعتوں کے لیے باہمی تعاون کی فضا برقرار رکھتے ہوئے اپنا اپنا ''کرنے کا اصل کام'' تجویز کرتے رہنا محترم ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک اہم مشن تھا۔ سابق امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید ﷾ نے آج سے ٹھیک ۲۶ سال قبل ستمبر ۱۹۹۶ء میں بطور مرکزی ناظم نشر و اشاعت ''پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور'' کے ''عرضِ ناشر'' میں تحریر فرمایا تھا:

> ''حقیقت یہ ہے کہ کسی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے لیے جہاں دینی و اخلاقی تربیت کا اہتمام ضروری ہوتا ہے وہاں ان کی سیاسی تربیت یعنی ملکی سیاسی حالات کا واضح شعور' کارفرما سیاسی قوتوں کے پس منظر اور شجرۂ نسب کا صحیح صحیح ادراک بھی ایک ناگزیر ضرورت ہوتا ہے۔''

آج ہم اپنے ملک کی سیاسی صورت حال بالخصوص انقلاب کی داعی جماعتوں کے کارکنان کی سیاسی بصیرت پر نظر ڈالیں تو محولہ بالا الفاظ کی حقانیت پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اسی تحریر میں اپنے والد گرامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

> ''ملک اور قوم کے معاملات پر غور وفکر اور ان کو درپیش مسائل کے لیے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دامے، درمے، سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرضِ عین ہے اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بدعہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے......''

تاریخ کے کسی ایسے طالب علم کے لیے جو اپنے ملک وقوم کی خیر خواہی کا حقیقی جذبہ رکھتا ہو' یہ امر انتہائی اہم ہے کہ اسے غیر جانب دارانہ' غیر متعصبانہ اور معتدل مواد میسر آئے لیکن فی زمانہ ان خصوصیات کی حامل تحریریں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی دردمند نوجوان اس راہ پر جستجو کرتا ہے تو اسے زیادہ تر مغربی مؤرخین پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنی ملت پر اقوامِ مغرب سے قیاس کرنے لگتا ہے' اور یہی تمام مسائل کی بنیاد ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک ایسی تاریخ ساز شخصیت ہیں جنہوں نے پہلے پاکستان کی تحریک میں اور پھر اس کے قیام کے بعد یہاں اسلام کے لیے اپنی تمام توانائیاں وقف کر دی تھیں۔ ان کی زیر ادارت ماہنامہ ''میثاق'' میں سیاسی تجزیوں کا سلسلہ ۱۹۶۷ء میں شروع ہوا۔ اس دَور میں انہوں نے نہ صرف تحریکِ پاکستان کا سیاسی پس منظر پیش کیا بلکہ ''ہونا کیا چاہیے تھا اور ہوا کیا؟'' کے عنوان سے مرض کا اصل علاج بھی تجویز کیا۔ ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب خان کے زوال کا باعث بننے والے سیاسی تناؤ کے بارے میں لکھا۔ ۱۹۶۹ء میں شروع ہونے والے ایک نئے سیاسی دَور کا اختتام ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان پر ہوا تو ملک میں اسلام پسند طبقہ کی پہلے برسر اقتدار طبقہ اور پھر سوشل ازم کے ساتھ کشمکش زیر بحث لائے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستانی سیاست کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا' جس میں بائیں بازو کی ایک جماعت کے ہاتھوں ملک اور اسلام کے حوالے سے کئی اہم کاموں کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر ایک ''اسلام پسند'' فوجی ڈکٹیٹر کا عہد آیا' جس نے اسلام کے فلاحی تصور کے بجائے اس کے تعزیراتی پہلو کو مقدم رکھتے ہوئے کئی قوانین جاری کیے۔ اس دَور کے تجزیے اس اعتبار سے بھی انتہائی اہم ہیں کہ محترم بانیٔ تنظیم کو

اربابِ حل وعقد کے ساتھ براہِ راست رابطے کے مواقع میسر آئے۔

اول و آخر شکر تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُس رب العزت ہی کا واجب ہے جس کی توفیق سے یہ مشکل کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس منصوبے کا ابتدائی خاکہ شعبہ نشر و اشاعت کی ایک میٹنگ میں پیش کیا گیا تھا۔ مرکزی ناظم نشر و اشاعت جناب ایوب بیگ مرزا نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کام شروع کرنے کی ہدایت کی۔ حسن اتفاق سے قرآن اکیڈمی لاہور کی لائبریری میں متعلقہ دَور کے ''میثاق'' کی فائلیں موجود تھیں' جن میں سے مطلوب مواد کو فوٹو کاپی کروا کر کام کا آغاز کیا گیا۔ مضامین منتخب کرنے کے بعد تمام مسودے ڈائریکٹر اکیڈمی جناب حافظ عاکف سعید ﷾ کو دکھائے گئے۔ ان کی منظوری کے بعد یہ منصوبہ شعبہ مطبوعات کے حوالے کیا گیا جہاں ادارتی' طباعتی اور اشاعتی حوالے سے تمام مراحل مکمل کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ایک انقلابی جماعت کے کارکنوں بلکہ عوام الناس کی بھی سیاسی تربیت کا باعث بنے اور وہ ملک و ملت کو درپیش مسائل پر غور و فکر کر کے ان کے حل کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ آمین!

ڈاکٹر حافظ محمد حسیب اسلم
معاون' شعبہ نشر و اشاعت
تنظیم اسلامی

۶ ستمبر ۲۰۲۲ء

خوشی اور غم کا بیک وقت اجتماع

* تذکرہ وتبصرہ

* ''میثاق'' مارچ ۱۹۷۴ء

جمعہ ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کا دن اس اعتبار سے عرصہ دراز تک یاد رہے گا کہ اس دن جملہ مسلمانانِ پاکستان کو بالعموم اور ''زندہ دلانِ لاہور'' کو بالخصوص ایک طرف حد درجہ مسرت' فرحت اور انتہائی نشاط وانبساط کا احساس ہوا تو دوسری طرف اسی قدر شدید رنج و غم اور اتنی ہی سخت افسردگی اور مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

یوں تو انسانی زندگی میں مسرت وشادمانی اور رنج وغم کچھ لازم وملزوم ہی سے ہیں' اور زندگی کا سفر مستقلاً اسی کیفیت میں گزرتا ہے کہ ؏ ''چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محو یاس رہتا ہوں'' تاہم اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ ایک مسرت بخش واقعہ پیش آیا' خوشی حاصل ہوئی وہ تدریجاً اپنی انتہا کو پہنچی۔ پھر فطری طور پر اس کے احساس کی شدت میں کمی ہونی شروع ہوئی اور جب اس کے اثرات بالکل زائل ہو گئے تو یا تو کوئی نیا رنج دہ واقعہ پیش آ گیا یا کوئی پرانا غم جاگ اُٹھا اور کسی نیم مندمل شدہ زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ اس طرح خوشی وغم اور راحت واَلم کے دَور آتے رہے اور زندگی اپنی منزلیں طے کرتی گئی۔

جو کچھ ۲۲ فروری کو ہوا' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہو گیا یا ایک طے شدہ پروگرام کے تحت کیا گیا۔ بہرحال تھا اس کے بالکل برعکس: یعنی یہ کہ خوشی ومسرت اور راحت وشادمانی کے احساسات، تدریجاً ترقی کرتے ہوئے جیسے ہی اپنے نقطۂ عروج (climax) کو پہنچے' فوراً ہی غم اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہو گیا اور دفعتاً رنج والم کا

ایک مہیب پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بعض دوسرے معاملات میں تو فوری تقابل اور اجتماعِ ضدین (simultaneous contrast) کا تجربہ اس سے پہلے بھی ہوا ہے لیکن خوشی اور غم کا اتنا فوری و بیک وقت اجتماع کم از کم راقم کی یادداشت کے ذخیرے میں موجود نہیں!

اس کا ایک فائدہ البتہ ہوا' جسے اگر یہ سب کچھ از خود ہوا تو رحمتِ خداوندی سے تعبیر کرنا چاہیے اور اگر یہ جان بوجھ کر کیا گیا تو کسی کے تدبر اور حکمتِ عملی کا شاہکار قرار دیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ کہ نتیجۃً مسرت و غم اور راحت والم کے احساسات کچھ اس طرح مل جل بلکہ گھل مل سے گئے کہ اکثر و بیشتر لوگ کچھ کھوئے کھوئے سے تو رہے لیکن متعین طور پر خود بھی یہ طے نہ کر پائے کہ انہیں خوشی زیادہ ہے یا غم' یا دونوں کے حاصل ضرب میں غلبہ مثبت فرحت و مسرت کو ہے یا منفی رنج والم کو!

''عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس'' کا پاکستان کے دل یعنی ارضِ لاہور میں انعقاد یقیناً ایک حد درجہ نشاط انگیز' وجد آگیں اور کیف آور واقعہ تھا۔ جیسے جیسے اس کے دن قریب آتے گئے' دلوں کی کلیاں چٹکنی شروع ہو گئیں۔ دکھ درد کا احساس ماند پڑتا گیا اور اِنشراح و اِنبساط کی ایک کیفیت رفتہ رفتہ قلوب کی دنیا پر طاری ہوتی چلی گئی۔ ملّت کے اجتماعی شعور نے کچھ ایسے محسوس کیا جیسے کم و بیش ایک صدی کے دوران متعدد بار دیکھے گئے خواب کی تعبیر قریب آرہی ہے۔ چنانچہ اجتماعی یادداشت کے ذخیرے سے کبھی جمال الدین افغانی کا ہیولیٰ اُبھرتا تھا' کبھی تحریکِ خلافت کی یادیں تازہ ہوتی تھیں اور کبھی قافلہ ملّی کے اس آخری حدی خواں کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی تھی جو اسی ارضِ لاہور میں خوابیدہ ہے۔

۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو روئے ارضی کی وسیع ترین مسجد میں کرۂ ارضی کے کم و بیش تین درجن مسلمان ممالک کے سربراہوں یا نمائندوں کا اجتماع یقیناً اس خوشی اور مسرت و انبساط کا نقطۂ عروج تھا! ہر اس مسلمان کی فرحت و شادمانی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھی جس کے دل کی کسی دُور دراز گہرائی میں جذبہ ملّی کی کوئی چنگاری خواہ امتدادِ زمانہ کی خاکستر اور تلخ حالات و واقعات کی راکھ کی دبیز تہوں میں دبی ہوئی ہی سہی' بہرحال کسی درجے میں سلگتی ہوئی موجود تھی ——— کہ دفعتاً غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ٹیلیویژن کے ناظرین نے دیکھا اور ریڈیو کے سامعین نے سنا کہ وزیر اعظم بھٹو نے گورنروں، وزرائے اعلیٰ اور ممبران سینٹ و اسمبلی کے مشترکہ اجتماع میں ''بنگلہ دیش'' کی تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا! جوش و خروش ایک دم ختم ہو گیا۔ جذبات سرد پڑ گئے۔ خوشی کی جگہ غم نے لے لی۔ فی الجملہ ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا! یہ کیفیت اس درجہ محیط و ہمہ گیر تھی کہ وہ لوگ بھی اس کے تسلط سے بچ نہ پائے جو خود ''بنگلہ دیش'' کی ''تلخ حقیقت'' کو تسلیم کرنے کے پُرزور حامی تھے!

بعد میں کانفرنس کی دو روزہ کارروائی کے دوران خوشی اور غم کا احساس ملا جلا سا رہا اور ہر صاحب احساس کے قلب کی گہرائیوں میں راحت و کلفت اور امید و بیم کی کیفیات گھلی ملی سی رہیں! یہاں تک کہ آخری وقت تک اگر خوشی غم پر غالب نہ آ سکی تو غم بھی خوشی کو بالکلیہ زائل نہ کر پایا۔ یہ معاملہ یقیناً بہت غنیمت رہا، ورنہ غالباً یہ غم سہا نہ جا سکتا اور کوئی شدید جذباتی ردِعمل ایک آتش فشاں کے مانند پھٹ پڑتا۔

بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے پر شدید غم و غصہ اور عالمی اسلامی کانفرنس کے انعقاد پر اتنی ہی مسرت و خوشی نرے سطحی اور جذباتی احساسات نہیں بلکہ ان دونوں کا گہرا تعلق اس تحریک سے ہے جس کا ایک اہم مظہر قیامِ پاکستان تھا۔ چنانچہ جہاں بنگلہ دیش کا قیام اور اب اس کا پاکستان کی جانب سے تسلیم کر لیا جانا ایک پہلو سے اس تحریک کی پسپائی کی علامت ہے وہاں لاہور کانفرنس کا انعقاد اسی کی شاندار پیش قدمی کا نشان اور ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کا اعلان ہے۔

ہمارے نزدیک جغرافیائی حقائق کو بالکل نظر انداز کر کے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ایک مملکت کے بندھن میں باندھ دینا اگرچہ حد درجہ نیک نیتی سے ہوا، تاہم یہ تھا ایک غلط اقدام جس کی ''تصحیح'' (rectification) اگر ہم سیاسی اعتبار سے ایک باشعور قوم ہوتے تو بحسن و خوبی کر لیتے، لیکن چونکہ معاملہ بالکل برعکس تھا لہٰذا ع ''ہر چہ دانا کند، کند ناداں، لیک بعد از خرابی بسیار'' کے مصداق وہ تصحیح ہو کر تو رہی اگرچہ نہایت بھدے اور بھونڈے طریق پر اور سخت تکلیف دہ انداز میں! اب مصلحت کا تقاضا

یہی تھا کہ اس تلخ حقیقت کو ''تسلیم'' کرنے کا کڑوا گھونٹ بھی بھر ہی لیا جاتا' اس لیے کہ اب اس کے سوا اور کوئی صورت بنگلہ دیش کو بھارت کے حلقہ اثر سے کسی نہ کسی درجے میں نکالنے کی موجود نہیں۔ ہم اس مرحلہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کم از کم ظاہری صورت یہ بنی کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا یہ اقدام بھارت کے دباؤ سے ہوا نہ کسی اور عالمی طاقت کے زیر اثر بلکہ ہمیں یہ قدم بعض مسلمان ممالک کے محبت بھرے اور خلوص آمیز اصرار پر اٹھانا پڑا۔ بہر نوع' یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ تحریک پاکستان کے اعتبار سے یہ ایک ہزیمت ہی ہے چاہے کتنی ہی وقتی ہو اور کیسی ہی جزوی!

اس کے بالکل برعکس' لاہور کانفرنس کے انعقاد کے اگرچہ بہت سے دوسرے فوری' سیاسی اور معاشی عوامل بھی موجود ہیں اور اس سے کسی بڑے ڈرامائی نتیجے کی توقع بھی عبث ہے' تاہم ہے یہ اسی تحریک تجدید ملّی کے سلسلے کی ایک کڑی جس کا ایک اہم مظہر قیامِ پاکستان تھا۔ تحریک پاکستان کے عوامل بھی بہت سے تھے لیکن آخری تجزیے میں یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ اس قوم کی اساس بہر حال مذہب ہی ہے جس کے معاشی مفادات کا تحفظ پیش نظر ہے۔ اسی طرح اس کانفرنس میں شرکت کی بنا بہر حال اسلام اور صرف اسلام تھی اور مشرق بعید سے مغرب اقصیٰ تک کے زرد رُو' گندمی' سانولے اور سیاہ فام لوگوں کا ایک شہر میں جمع ہونا تھا بہر حال صرف مذہب کی بنیاد پر — اور ''قرارداد لاہور'' کے کم و بیش چونتیس سال بعد ایک وسیع تر سطح پر عالمی ملت اسلامیہ کے اتحاد کا نعرہ اسی ارضِ لاہور سے بلند ہونا یقیناً بہت معنی خیز (significant) ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اثرات و نتائج کے ظہور میں وقت لگے اور یہ وقت بھی خدائی تقویم کے مطابق ہو!

***

فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز

* تذکرہ وتبصرہ
* ''میثاق'' اکتوبر/نومبر ۱۹۷۴ء

جس وقت ''میثاق'' کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا' اس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کا فیصلہ خاصا پرانا ہو چکا ہو گا۔ تاہم جی نہیں مانتا کہ ''میثاق'' کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اُس احسانِ عظیم پر اس کی جناب میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملّتِ اسلامیہ پر ہوا ہے۔ اگرچہ عالم اسباب میں اس تاریخی فیصلہ کے بہت سے عوامل ہیں' تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا جس نے جملہ اسباب وعوامل کو طوعاً و کرہاً اس طرح ایک ہی رخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لیے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

اگرچہ آنحضور ﷺ کے فرمانِ مبارک کے مطابق کہ ((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ)) ''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا'' پوری ملّتِ اسلامی کی جانب سے مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمل اور نظم وضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پھر علماء کرام اور دینی وسیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں سخت محنت اور مشقت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لیے' یہاں تک کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور

ضعف ونقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند نوجوانوں کے لیے بھی مشکل ہو۔ مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں ارکانِ پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی۔ حکومتِ وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا' نہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا' خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبر اور فہم وفراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے۔ لیکن ہمارے شکر وسپاس کا اصل حق دار اور ہمارے تشکر وامتنان کا سزاوارِ حقیقی ہے اللہ رب العالمین جو ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' بھی ہے اور ''غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ'' بھی اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں تمام اسباب وعلل اور جملہ وسائل وعوامل۔ فله الحمد فی السموت والارض وله الحمد فی الدنیا والاخرة۔

راقم الحروف ۲۴ مئی سے ۳۰ جون تک لاہور سے تقریباً مسلسل باہر رہا۔ پہلے کچھ بحالیٔ صحت اور کچھ بعض معاملات ومسائل پر گوشہ تنہائی میں غور وفکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادیٔ کاغان کا ہوا۔ پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا۔ اسی دوران میں جب ''حادثہ ربوہ'' کی خبر پڑھی تو فوراً یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ غالباً تقدیر الٰہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسّی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق: ''This is the beginning of their end!'' تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار' کیاذ' شاطر گروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا۔ جب ۲۸ جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماعِ جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص خدائی تدبیر ہے اور اس بار یہ مسئلہ ان شاء اللہ العزیز ضرور تسلی بخش طریقے پر طے ہو جائے گا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ جولائی کو جامع مسجد خضراء'

سمن آباد میں جمعہ پڑھایا تو ایک مفصل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر ریکارڈ کر لی گئی تھی، اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اسے صفحہ قرطاس پر بھی منتقل کر لیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے ''میثاق'' میں شائع کر دیا جائے لیکن اس وقت سنسر کی پابندی کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصّہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک تو ان کی خواہش پوری ہو جائے اور دوسرے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے یہ خیالات وقوعہ کے پیش آچکنے کے بعد کی خیال آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصّہ جو ''عقیدۂ ختم نبوت اور قرآنِ حکیم'' کے موضوع پر اظہار خیال پر مشتمل ہے، ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!)

''حمد وثنا اور تلاوتِ آیات کے بعد:

''حضرات! ۲۴ مئی کے بعد آج ۵ جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اِدھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور اُدھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا، یعنی حادثہ ربوہ۔ اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اس مسئلے نے سر اٹھا لیا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدت کے ساتھ احساس ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے حوادث کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا۔ بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کاشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے یا بعض ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے، کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے حادثہ نے اس کو ازسرِنو زندہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی، سازشی فطرت اور مکاری کا ملک گیر احساس اجاگر ہوا اور ایوانِ حکومت سے خواص و عوام تک سب کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل

ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا!

یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور انتہائی مہارت کے ساتھ خاموشی سے جسدِ ملّت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملّت اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اس کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر اس سے بالکل ناواقف تھے' یا اس کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تتمہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے اُبھرنے اور اُٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ' بلکہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس بار کوئی شخص اور سیاسی پارٹی یہ کریڈٹ لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سٹیشن پر جو اقدام ہوا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے' بنیادی طریق کار اور سابق طرزِ عمل سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسی' مدح سرائی اور ثنا خوانی کر کے اس سے مراعات حاصل کرو۔ پھر ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ اُمتِ مسلمہ کے ساتھ براہِ راست تصادم سے ہمیشہ کنی کترانا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے' یہی ان کا طریق کار ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لیے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی ملک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہنے میں تو پھر بھی ان کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے

ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی، اس کی خوشامد، اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر اس کو بقاو ترقی کی دعائیں دے کر، اس کے مقاصد و مفادات میں ممد و معاون ہو کر، اس کے زیر سایہ اور زیر عاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کر کے جسدِ ملّت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسر اقتدار ہو، خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی حماقت کر کے حکومت وقت کو اپنے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ یوں حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہٰذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آئے بغیر یہ اُمید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ ان شاء اللہ اس مسئلے کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو اُمّت کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورتِ حال رونما نہیں ہوئی۔ بحمد اللہ، اس حد تک تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے Terms of Reference کافی وسیع کر دیے گئے ہیں۔ تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ یوں اس گروہ کا گھناؤنا کردار تحقیقاتی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملّت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے سب سے بااختیار ادارے یعنی پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور و فکر شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لیے نہایت مناسب ہیں۔ اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجیے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد

وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں! ان سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے قانونی اور دستوری طور پر ممکنہ صحیح اقدامات کر لیے گئے ہیں اور یہ اُمید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ ان شاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی ضرورت ہے:

* ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ ایجی ٹیشن اور دنگے فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے‘ اس لیے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہوگا۔ بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے۔ جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور مارشل لاء لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا‘ یوں ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ایک ہنگامہ خیز اور دھماکا خیز صورت بنا کر حالات کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں امن وامان کا گمبھیر مسئلہ اُٹھ کھڑا ہو تاکہ حکومت اور عوام میں خوف ناک تصادم ہو جائے۔ نتیجۃً موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر امن وامان قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھتی ہے۔ لہٰذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے۔ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ ”خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے۔“ گویا انہوں نے اپنی طرف

سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیل ہو جائے اور فوج انتظامیہ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تا کہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور طریقوں سے فوج کو متاثر کر کے فائدہ اٹھا سکیں۔ لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی بھی معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہوگی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

* دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیے کہ اس مسئلہ کے اُٹھانے اور اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی ہے' لہٰذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیے' انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

* تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزبِ اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت versus حزبِ اختلاف کا مسئلہ بنا دیا' جس کے نتیجہ میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لاینحل بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت امید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو سونپی گئی ہے' جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں۔ چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں' بہر حال وہ عملی سیاست کے میدان سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا' بلکہ میں تو یہاں

تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں' مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ قادیانیوں کی حماقت سے اور پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھالیں۔ اگر ہم نے کفرانِ نعمت کیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لیے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُرامن ذرائع سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیے۔ دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اُجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعتاً ضرورت ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی اطمینان بخش ہے۔ لہٰذا ہمیں موقع دینا چاہیے کہ ایوانِ نمائندگان پُرامن فضا میں اس مسئلہ کو اس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری اُمتِ مسلمہ کے لیے قابل قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ نرم کوئی اور مطالبہ نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ کسی کمیونٹی کو باقاعدہ اقلیت (minority) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیے جائیں! یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا تعین اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت کی

حیثیت سے تسلیم کر لے تو گویا اقوام متحدہ کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہوگئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ طے کرنے ہوں گے اور ان کو اپنی کتابِ دستور میں مندرج کرنا ہوگا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینی ہوگی اور آپ کے ملک کی عدالتیں ان حقوق کی نگہداشت کریں گی۔ قادیانیوں کے لیے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت اُمتِ مسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا دراڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتل مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے اُمت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی ''برکات'' ہیں' بقول اکبر الٰہ آبادی:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ — گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر — ''اناالحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا! مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوئے۔ یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشارِ فکر ونظر اس کو عین مطلوب تھا' لہٰذا وہ کیوں ان کا نوٹس لیتا! اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی۔ اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں' جھاڑ جھنکار نشوونما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافتِ راشدہ کا دَور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت ہوتی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کا مقام دار ورسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لیے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو متحارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم

ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعین افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی خاص شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہو گیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو۔ پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معمولی' چھوٹی اور بالکل فروعی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ البتہ قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرف نظر کیا گیا تو ملت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔

دعویٰ نبوت درحقیقت ایسا فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اُٹھتے رہے اور اُمت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کے دروازے کو اگر ایک ہی بار کھول دیا گیا تو اُمت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی پھر کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعویٰ نبوت کرے گا تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مؤمن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے۔ وہ کفر و ایمان کا معیار بن کر آتا ہے۔ جو اس کو نہ مانے چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو خالص توحید کے ساتھ مانتا ہو' آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفاصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں' حضرت آدمؑ سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو' تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو' ملائکہ کو مانتا ہو' بڑا ہی متقی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا' اس پر کفر کا ٹھپہ لگ جائے گا اور وہ مؤمن نہیں بلکہ

کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجیے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز ما بہ الاختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لیے پھرتے ہیں' اس میں انجیل (New Testament) کے ساتھ عہد نامہ عتیق (Old Testament) کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں۔ گویا عیسائی تورات' زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لیے کہ یہود نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے ان کو مانا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا امتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجیے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے! یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیحؑ کے متبع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں لیکن یہ "متبعین حضرت مسیحؑ" ہمارے نبی سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کو نہیں مانتے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر۔ گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچایا ہے۔ جب وہ ایک نئی نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نئی نبوت کا کھڑاک مول لیا گیا! دراصل نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا' اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرماں برداری میں دے دیا اور خود کو بالکلیہ سرنڈر کر دیا۔ اب اس نبی کے مقابلے میں اس کا فکر' اس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے۔ کوئی شخص جب ظلی طور پر' بروزی طور پر یا کسی اور اعتبار

سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوا لے تو اب وہ ماننے والے کے لیے امام معصوم بھی ہو گیا‘ واجب الاطاعت بھی ہو گیا۔ اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا‘ حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر کے زمرے میں آئے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے‘ امیر سے‘ سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں‘ ان کے خلاف سوءِ ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں‘ ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا‘ لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس برصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی ”نبوت“ کا تصور ہے۔ یہ فائدہ نبوت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ‘ نمازیں علیحدہ‘ یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے[1]۔ حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود سے پوچھا گیا: بچے تو معصوم ہوتے ہیں‘ اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں شرکت کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ جواب دیا گیا: کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نمازِ جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح ناجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا

---

(۱) مشہور ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خاں نے جو وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی کابینہ میں وزیر امور خارجہ تھے‘ اپنے محسن‘ مربی اور بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ کو منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچائیں' اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح کریں اور پھر اس کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے' یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو یہ اس پر واویلا کریں۔ اس میں آخر کیا معقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اعتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ اُمت قرار دے چکے ہیں لیکن اس کے مقدرات کو اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسندانہ عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں' اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیے جائیں گے۔ حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں میں عددی تناسب کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرِ مبادلہ کثیر مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں' اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب سے فوج' سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کو جو پہنچ اور دسترس حاصل ہے اس پر پابندی عائد ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آکاس بیل کی طرح شجرِ ملّت سے لپٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی کا باعث ہوں۔ اسی لیے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو ''مسلمان'' ثابت کرنے کے لیے اپنے روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ موقف کے اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ اُمت اپنا تشخص تین چوتھائی صدی قبل ہی طے کر لیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ پر بہ ادنیٰ تامل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ انتہائی نرم' معقول اور ہلکا نیز ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان کو نئی نبوت کے اجراء اور اس کو ماننے کے جو نتائج بھگتنے پڑتے وہ ان کے لیے کہیں زیادہ سخت ہوتے۔ یہ تو لادینیت کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالفعل انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے' اسی لیے

ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کے زمانے میں ہوا۔ ان کو ارتداد کی ایسی سزاؤں سے واسطہ پڑتا جو خلافتِ راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں دی جاتی رہیں۔ یہ تو اکبرالٰہ آبادی کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ ''انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!'' کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعاوی کیے گئے' حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جما دیے گئے۔ اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا' ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑ سکا بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ بھی کرتے رہے۔ اپنے خالص سازشی کردار اور ''انجمن امدادِ باہمی'' کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں۔ بہرحال یہ نرم ترین اور انتہائی وسعتِ قلبی کا سلوک ہے جو اُمتِ مسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے' یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لیے جسدِ ملّت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔''

ہمارے نزدیک قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا یہ فیصلہ ان ''معجزات'' کے سلسلے کی تازہ ترین اور اہم ترین کڑی ہے جن کی بنا پر ہمیں یہ یقین حاصل ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کے احیاء اور دینِ حق کے اس عالمی غلبے کی خدائی سکیم کا ایک اہم جزو ہے جس کی خبر مخبرِ صادق ﷺ نے دی تھی۔

***

اندیشہ ہائے دُور دراز

* عرض احوال
* ''میثاق'' ستمبر ۱۹۷۷ء

ملکی حالات میں عظیم انقلاب برپا ہو چکا ہے۔کل کے حاکم آج کے اسیر ہیں اور کل کے ممدوح آج کے ملوم و مطعون' اگرچہ ان کے لیے ابھی موقع ہے کہ زبان حال سے کہیں:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے

واقعہ یہ ہے کہ کسی نئے اور تباہ کن دورِ فلک کا اندیشہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں فوج کے زیر انتظام منعقد ہونے والے پہلے ''آزاد و غیر جانبدارانہ'' انتخابات کے بارے میں لندن کے کسی روزنامے نے پیشگی کہا تھا:

" The first and Perhaps the last general elections in Pakistan "

اور ہماری بدقسمتی سے وہ واقعی متحدہ پاکستان کا آخری الیکشن ثابت ہوا۔اب اندیشہ ہے کہ فوج کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۷۷ء کے دوسرے آزاد و غیر جانبدارانہ انتخابات' خاکم بدہن' اس بچے کُھچے پاکستان کے بھی آخری انتخابات نہ بن جائیں۔واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنے اعمال کو دیکھیں تو اس انجامِ بد کے ہم کبھی کے مستحق ہو چکے۔اب تک بھی اللہ کی رحمت و مغفرت اور مشیت خصوصی ہی دستگیری فرماتی رہی ہے اور آئندہ بھی کوئی بھروسا ہے تو صرف اس کا۔﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ (المائدہ) ویسے اس بار خود ہمیں بھی امید کا دامن ہاتھ

سے چھوٹا سا محسوس ہو رہا ہے اور جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھی اپنی دوسری نشری تقریر کا آغاز اس جملے سے کر کے مزید ہلا کر رکھ دیا ہے کہ: ''اس مغالطے میں نہیں رہنا چاہیے کہ پاکستان کو اللہ ہی نے وجود بخشا ہے اور وہی اسے قائم رکھے گا۔''

سبب ان ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کا یہ ہے کہ جس طرح ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے نتیجے میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں خالص علاقائی قیادتیں ابھر آئی تھیں اسی طرح اب نظر آ رہا ہے کہ اس الیکشن کے ذریعے یہ بچا کھچا پاکستان بھی قیادت میں regional polarisation کا شکار ہو جائے گا اور اس کی ایک مزید تقسیم شمالی و جنوبی خطوں میں ہو جائے گی۔ چنانچہ PNA کی جانب سے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ٹکٹوں کی تقسیم میں اس ''آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر'' موجود ہے۔ ایک دوسری بڑی علامت باچا خان کی باسی کڑھی میں دفعتاً اُبال' بلوچستان اور سندھ میں ان کی پُراسرار نقل و حرکت' خان آف قلات اور جی ایم سید سے ان کے طویل مذاکرات اور بالآخر دونوں صوبوں کی حکومتوں کی طرف سے ان کو ان صوبوں کی حدود سے نکل جانے کے احکام کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ اگر ایک طرف یہ احساس دل کو ڈھارس دیتا ہے کہ:

نہ ہو نومید' نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

تو دوسری طرف فوراً ہی یہ احساس بھی دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ (یوسف)

* * *

آپریشن فیئر پلے: دورِ ثانی

* تذکرہ و تبصرہ

* ''میثاق'' اکتوبر ۱۹۷۷ء

انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی ہو گئے ہیں اور نہ صرف انتخابی بلکہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمی پر پابندی لگ گئی ہے۔ اس طرح پاکستان کی تیس سالہ تاریخ کے تیسرے مارشل لاء کا دورِ اوّل ختم ہو گیا اور دورِ ثانی شروع ہو گیا۔

موجودہ مارشل لاء کا نفاذ ابتداءً محدود مقاصد اور متعین مدت کے لیے ہوا تھا۔ اس کی نوعیت ملک کے سیاسی و جمہوری عمل میں ایک وقتی رکاوٹ (impasse) کو دور کرنے والی فوری و عارضی اصلاحی تدبیر کی تھی۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے ''آپریشن فیئر پلے'' کے تحت اقتدار سنبھالتے ہی انتخابات کے لیے نوے دنوں کی مدت بھی معین کر دی تھی اور اس عزم کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ وہ سیاسی عمل کے اہم مرحلے یعنی عام انتخابات میں صرف ریفری کا کردار سرانجام دیں گے اور اپنی جملہ مساعی کو صرف آزاد اور غیر جانبدار انتخاب منعقد کرانے پر ہی مرتکز رکھیں گے۔

جلد ہی صورتحال تبدیل ہو گئی' اور بقول خود ان کے جو حقائق و واقعات ان کے سامنے آئے انہوں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ وہ احتساب کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہو گئے' جو بالآخر اس پر منتج ہوا کہ انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی جبکہ احتساب کے ساتھ ساتھ اصلاحِ حال اور تعمیرِ نو کی جدوجہد شروع ہو گئی! اب مارشل لاء کے جس دور کا آغاز ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہے اس پہلے مارشل لاء سے جو ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے نافذ کیا تھا' اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی مدت کتنی طویل ہو گی!

اندریں حالات دو سوالات ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ: اب کیا ہو گا؟ کیا حالات واقعتاً درست ہو جائیں گے؟ یا یہ بھی ایک عارضی وقفہ ہی ثابت

ہوگا اور ملک، پھر دو متحارب قوتوں کے تصادم کی جولان گاہ بن جائے گا؟ آیا یہ ملک قائم بھی رہے گا یا نہیں؟ وقس علی ھذا۔ دوسرے یہ کہ: آخر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہماری قومی و ملی زندگی کو استحکام کیوں نصیب نہیں ہو رہا؟ ہماری ملکی سیاست کی گاڑی کا انجن بار بار کیوں بند ہو جاتا ہے؟ ہم ایک دائرے ہی میں کیوں حرکت کیے چلے جا رہے ہیں؟ پھر ایک اہم سوال وہ ہے جس پر ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو اپنی سوچ کو مرتکز کر دینا چاہیے کہ: ان حالات میں کرنا کیا چاہیے؟ اس مخمصے سے نجات کی سبیل کون سی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اگرچہ آئندہ کے حالات امورِ غیبی کے ذیل میں آتے ہیں' تاہم حالات کی رفتار اور موجود الوقت ظروف و احوال کے تجزیے سے ایک اندازہ ہر سوچنے سمجھنے والا انسان خود بھی قائم کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ دوسروں کی رائے بھی معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سے بھی بہت سے رفقاء و احباب نے اس قسم کے سوالات کیے جن کا جواب گفتگوؤں میں بھی عرض کیا جاتا رہا ہے اور اب اختصار کے ساتھ تحریراً بھی پیش خدمت ہے۔

ہماری رائے میں صورت حال اس سے بہت زیادہ خراب اور مایوس کن ہے جتنی کہ وہ بظاہر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی نیت پر کوئی شبہ نہیں بلکہ ہم انہیں ایک نہایت شریف' دین دار اور مخلص مسلمان سمجھتے ہیں' ہمیں مستقبل قریب میں اصلاحِ احوال کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ آئندہ کم از کم دس برس تک تو یہی نظر آتا ہے کہ ہماری ملکی و قومی زندگی کی ناؤ ڈولتے ہی چلے گی' بلکہ کوئی عجب نہیں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان ایسے کسی بڑے حادثے سے بھی دوچار ہو جائے!

قومی و اجتماعی سطح پر احتساب کا ہمہ گیر عمل' ترویج شریعت کی مبارک و مسعود کوشش اور نظامِ تعلیم کی اصلاح اور تعمیر نو ایسے اقدامات جن کے لیے سر توڑ کوشش اس وقت جنرل ضیاء الحق صاحب کر رہے ہیں' کاش کہ ان کا آغاز قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہو جاتا۔ اُس وقت فضا حد درجہ ساز گار تھی اور قلوب و اذہان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ افسوس کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ وہ موقع کھو دیا بلکہ پورے تیس سال بالکل مخالف سمت میں تیزی

کے ساتھ دوڑنے میں صَرف کردیے۔ اب جبکہ ایک انگریزی مقولے کے مطابق وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہ کر گزر چکا ہے اور حالات بالکل دوسری انتہا کو پہنچ چکے ہیں' ہم اگر جاگے بھی تو اس جاگنے سے کیا حاصل! بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ﴿٢٣﴾﴾ (الفجر) یعنی ''اس روز ہوش آئے گا انسان کو! لیکن تب ہوش میں آنے کا کیا فائدہ؟'' یا بقولِ سودا ؏: ''جب چشم کھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا!''

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ملک و ملت کو اس کے اصل نصب العین سے منحرف کرنے اور قوم کی سیاسی واجتماعی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے کے جرم کا اصل مجرم کون ہے! وہ قیادتِ عظمیٰ جو اس ملک کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی یا اُس کے وہ حواری اور ہم سفر جن کی اکثریت کو خود اس نے ''کھوٹے سکوں'' سے تشبیہ دی تھی؟ یا وہ نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں جنہوں نے چھوٹتے ہی قصرِ قیادت و سیادت اور ایوانِ حکومت پر ہلہ بولنا لازمی و ناگزیر سمجھا؟ یا وہ علماء و مذہبی پیشوا جنہوں نے صرف تنقید ہی کو کل فرض سمجھا؟ یا وہ مہاجر جو آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت پر بالکل گِدھوں کے سے انداز میں ٹوٹ کر گرے؟ یا وہ مقامی آبادی جس نے پاکستان کے قیام کو اپنے حق میں بالکل ''مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ'' کے مترادف جانا اور اس خوانِ نعمت کی ذمہ داریوں کی جانب نگاہ ہی نہ کی؟ واقعہ یہی ہے کہ یہ جرم کسی ایک فرد یا جماعت کا نہیں ہے' اس حمام میں پوری قوم اور اس کے تمام طبقات ننگے ہیں۔ یہ ہمارا وہ اجتماعی جرم ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بھگتیں گے! اس موضوع پر جناب زیڈ اے سلہری صاحب کے ایک مضمون کا عنوان بڑا ہی پیارا تھا: "The Learned also Failed!"

الغرض مجرم اور قصور وار خواہ کوئی بھی ہو' اس سے اُس اصل صورتِ واقعہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو اب بالفعل موجود ہے۔ یعنی یہ کہ مادّہ پرستی اور لادینیت نے سرطان کے پھوڑے کی طرح ہمارے پورے جسدِ ملی میں گہری جڑیں جمالی ہیں۔ اب سے لگ بھگ

دس سال قبل تک مادیت اور الحاد کو معاشرے کے صرف پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقات یعنی Intellectual cult کے فکری انداز کی حیثیت حاصل تھی لیکن ماضی قریب میں ذرائع ابلاغ عامہ کے طفیل سیکولرائزیشن کا یہ عمل قوم کے انتہائی نچلے طبقات تک نفوذ کر گیا ہے۔ اب عوام کی ایک عظیم اکثریت کے قلوب واذہان شعوری یا غیر شعوری طور پر اس زہر سے مسموم ہو چکے ہیں۔ مادیت کے سیلاب کا فطری رُخ جدلیاتی مادیت ہی کی جانب ہوتا ہے' لہٰذا آپ چاہیں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی قرار دے لیں' بہر حال واقعہ یہی ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور جسے دورِ جدید میں اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا وہ عوامی سطح پر تیزی کے ساتھ خالص مادیت ہی نہیں جدلیاتی مادیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر اس دھارے کا رخ حقیقی روحانیت اور واقعی خدا پرستی کی طرف نہ موڑا جاسکا تو کوئی سطحی اور مصنوعی تدبیر حالات کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔ بقول علامہ اقبال ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں مختلف دینی تحریکوں اور مذہبی جماعتوں کے زیر اثر قوم کے متوسط طبقہ میں مذہبی رجحان اور شعائر دینی کے ساتھ عملی وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ افسوس کہ یہ مذہبیت اکثر وبیشتر ایک ایسے خالی خول کے مانند ہے جس میں نہ حقیقی روحانیت کی چاشنی موجود ہے اور نہ واقعی خدا پرستی اور آخرت طلبی کی روح۔ چنانچہ وہ یا تو نری رسم پرستی (ritualism) ہے یا صرف ایک عقلی وذہنی ورزش اور ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی انداز' اِلّا ماشاء اللہ!

بنظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں اس وقت اصل تصادم ان ہی نچلے اور متوسط طبقات کے مابین ہے۔ ان دونوں طبقوں کے اصل دھاروں کا رُخ بالکل مخالف سمت میں ہو گیا ہے۔ چنانچہ نچلے طبقات تیزی کے ساتھ مادیت' لادینیت اور سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں جبکہ طبقۂ متوسطہ کے فعال عناصر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر منظم ہو رہے ہیں۔ خاکم بدہن' ہمارے تجزیے کے مطابق ان کے مابین ایک فیصلہ کن تصادم ناگزیر

ہو چکا ہے۔ اس پورے معاملے میں دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ سب سے اوپر کا طبقہ فی الحال بندر کے مانند ترازو ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے اور دو طرفہ فوائد حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ غریبوں کی قیادت کی اجارہ داری بھی اسی کے پاس ہے اور مذہب کی سرپرستی کی ٹھیکہ داری بھی! ہمارا اندازہ ہے کہ یہ کھیلا اب زیادہ دیر نہیں چل سکے گا اور اصل متحارب قوتوں کی یہ تقطیب (polarisation) تیزی کے ساتھ اپنی منطقی انتہا کو پہنچ کر رہے گی۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین بھی ایک بالکل نئی صف بندی (re-alignment) دائیں بائیں بازوؤں کی تقسیم اور مرکزیت پسند مرکز گریز رجحانات کے تصادم کی بنیاد پر ہو گی۔ یوں ہمارا معاشرہ بقول شخصے افقی اور عمودی دونوں قسم کی تقسیموں کی زد میں آجائے گا۔ یہ عمل بالآخر کس انتہائی ماحصل تک منتج ہوگا' یہ اللہ ہی کو معلوم ہے!

ہمارے نزدیک پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کا نقشہ اب پھر کم وبیش وہی ہوگا جو ۶۹ – ۱۹۶۸ء میں تھا۔ وہ عمل اب پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ دوبارہ جاری ہو جائے گا جسے مسٹر بھٹو نے اولاً خود برسر اقتدار آنے کے لیے بطور زینہ استعمال کیا لیکن بعد میں حکومت کے تمام ذرائع و وسائل کو بروئے کار لا کر پوری قوت سے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی اور اس میں وقتی طور پر کامیاب بھی رہے تھے۔ واللہ اعلم!

ہمیں تسلیم ہے کہ افتادِ طبع کے اعتبار سے ہم کسی قدر مائل بہ قنوطیت (pessimist) واقع ہوئے ہیں لیکن اگر رائے کا اظہار کرنا ہی ہو تو دیانت کا تقاضا ہے کہ انسان دوسروں کو وہی کچھ دکھائے جو وہ خود دیکھتا ہو۔ ہماری خواہش یہی ہے کہ ایسا نہ ہو' لیکن دکھائی یہی دے رہا ہے کہ ہم اپنی ہمالیہ ایسی عظیم غلطیوں اور پے در پے کوتاہیوں کے طفیل اس انجامِ بد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

یہ تو ہے ہمارا اندازہ حالات کے آئندہ رخ کے بارے میں۔ رہے وہ دو سوال کہ: ایسا کیوں ہے؟ اب نجات کی کوئی سبیل ہے کہ نہیں؟ ان کے ضمن میں ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی!

***

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز

* خطاب' مسجد شہداء' لاہور (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

* ''میثاق'' جنوری/فروری ۱۹۸۱ء

خطبہ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کو ہمارے ملک اور دوسرے ممالک میں بھی سرکاری سطح پر منایا جا رہا ہے اور اس کے استقبال کے لیے کافی پہلے سے مختلف الانواع تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ عوام الناس ہی میں نہیں بلکہ ہمارے خواص کے بھی قابل ذکر حصے میں چودھویں اور پندرھویں صدی ہجری کے متعلق عجیب و غریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کچھ تو ہمارے ان بعض واعظین کے باعث پھیلی ہیں جن کا مبلغ علم صرف سنی سنائی باتیں اور سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی معلومات ہوتا ہے جبکہ اس میں کافی دخل عوام الناس کی لاعلمی اور اس بات کا بھی ہے کہ ایسے لوگ سنی سنائی باتوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح بات کا بتنگڑ بن جایا کرتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ چودہ سو سال میں عروج و زوال کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی ہے؟ فی الحال ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور فی الوقت کس صورتِ حال سے دوچار ہیں؟ اس حوالے سے میں پہلے بھی مفصل تقریریں کر چکا ہوں' اور میرے مطالعے کا حاصل مطبوعہ شکل میں بھی موجود ہے۔ (۱) لیکن علم' مطالعہ اور مشاہدہ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض نئی باتیں حال ہی میں میرے سامنے آئی ہیں جن کو مَیں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کا سبب یہ حسن اتفاق ہوا کہ شمالی امریکہ

(۱) ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ مقالہ ''سرافگندیم'' نامی کتاب میں شامل ہے۔ (مرتب)

میں کافی عرصہ سے ایک اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کا امریکہ کے مختلف شہروں میں ہر سال ایک کنونشن منعقد ہوتا ہے۔ سال گزشتہ میں جب پہلی بار امریکہ گیا تھا تو ڈیلاس میں ان کے سالانہ کنونشن کا انعقاد ہو رہا تھا جس میں ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے مہمان و مقررِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ امسال مَیں جب دوسری مرتبہ دعوتی دورے پر شمالی امریکہ گیا تو ان کا سالانہ کنونشن آبشار نیاگرا کے سامنے ''نیاگرا سٹی'' میں منعقد ہونے والا تھا' جس میں شریک ہونے اور آخری اجلاس میں ''پندرھویں صدی ہجری کے چیلنج' خطرات اور توقعات'' کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ مَیں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق سے اس موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا۔ اس دوران کچھ پہلو اور نکات ایسے ذہن میں آئے کہ مَیں نے چاہا کہ ان کو آپ کے سامنے بھی بیان کروں۔

کائنات کی تخلیق اور اس کے نظم و تدبیر کا ہمارے ایمان باللہ سے گہرا تعلق ہے۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق یہ کائنات ایک اجل مسمّٰی کی طرف رواں دواں ہے جس کو کسی صدی کی رفت اور کسی صدی کی آمد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس کائنات اور اس کرۂ ارض کے متعلق جس پر ہم بستے ہیں وہ بنیادی حقائق جو ایمان باللہ کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہونے چاہئیں' ہمارے ذہنوں میں مستحضر نہیں رہتے۔ پھر مغرب سے Metaphysical Science (مابعد الطبیعیات) کے درآمد شدہ نظریات نے ہمارے تعلیم یافتہ ذہنوں کو اتنا قابو یا فتح کر لیا ہے کہ ایمان باللہ کے ذریعہ جو علم و عرفان حاصل ہوتا ہے وہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ پہلے ان حقائق کو اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں جو ایمان باللہ کا حاصل ہیں۔

ایمان باللہ کا حاصل

ہمارا ایمان ہے کہ یہ کائنات جس کی وسعتوں کا ایک دھندلا سا اندازہ کرنے سے بھی سائنس کی بے شمار ترقیات و ایجادات کے باوجود انسان تا حال قاصر ہے اور جس کے مقابلے میں ہمارا یہ کرۂ ارض ایک دھبہ بھی نہیں بنتا بلکہ پوری کائنات کی وسعت کے اعتبار

سے اسے معدوم کے درجے میں بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا' نہ ہمیشہ سے تھی نہ ہمیشہ رہے گی۔ یہ نہ خود بخود وجود میں آئی نہ ہی خود بخود رواں دواں ہے۔ یہ کائنات حادث اور فانی ہے۔ صرف ایک ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے' ہمیشہ رہنے والی ہے اور وہ ہے اللہ تبارک و تعالیٰ۔ صرف اس ذات سبحانہ عزوجل کو بقاو دوام ہے جبکہ اس کی تمام مخلوقات کو فنا ہے۔ بمصداق الفاظ قرآنی: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾﴾ (الرحمٰن) یہ ہے پہلی اصولی اور کانٹے کی بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید بار بار اور مختلف اسالیب سے یہ خبر دیتا ہے کہ کائنات کی یہ تخلیق بالحق یعنی بامقصد ہے اور ایک وقت معین تک ﴿اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ کے لیے ہے۔ ﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ﴾ (الاحقاف: ۳) اور ﴿كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (لقمٰن: ۲۹) [1]۔ قرآن مجید باعادہ اس حقیقت کبریٰ کا اظہار کرتا ہے کہ کائنات کی یہ عریض و بسیط اور وسیع بساط جو اللہ تعالیٰ نے بچھائی اور پھیلائی ہے' ایک وقت آئے گا کہ وہ اس کو اس طرح لپیٹ لے گا جیسے ہم اپنے بستر گول کر لیتے ہیں۔ قدیم دور میں کتابیں اس طرح مجلد نہیں ہوتی تھیں جیسے فی زمانہ ہوتی ہیں بلکہ دستور یہ تھا کہ ایک کاغذ پر لکھا اور اس کے نیچے دوسرے لکھے ہوئے کاغذ چسپاں کرتے چلے گئے۔ پھر ان تمام کاغذوں کو رول (roll) کی شکل میں لپیٹ لیا۔ اس طرح scroles بنتے تھے۔ حسبِ ضرورت ان کو بچھا کر مطالعہ کیا جاتا اور پھر تہ کر لیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں کائنات کے خاتمے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ﴾ (الانبیاء: ۱۰۴) ''ایک دن آئے گا جب ہم اس کائنات کو اس کی وسعتوں اور پہنائیوں اور اس کی بلندیوں اور پستیوں سمیت اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے تم کتابوں کے طومار کو لپیٹ لیا کرتے ہو۔'' ایک مقام پر یوں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَالْاَرْضُ

---

(۱) سورۃ الدخان میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿٣٨﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾

جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (الزمر : ٦٧)
''قیامت کے روز یہ زمین پوری کی پوری اُس (تعالیٰ) کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان (اور خلا و فضا کی سب بلندیاں) اس کے دستِ راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔''
ہمارے ایمانیات کی اصطلاح میں اس کیفیت و حالت اور اس دن کو قیامت کہا جاتا ہے۔

اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت قیامت ہے' لیکن یہی حقیقت ذہن سے اوجھل اور شعور و ادراک سے دور ہے۔ اس بات کو انسان کی زندگی کے انفرادی طرزِ عمل سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ موت زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔ ہر نظریہ' خیال اور بات میں اختلاف بھی ممکن ہے اور شک بھی لیکن موت وہ حقیقت ہے جس میں نہ اختلاف کی گنجائش ہے نہ شک کی۔ بایں ہمہ ''موت'' ہی وہ چیز ہے جسے ہم اپنے شعور اور ذہن سے دور رکھتے ہیں۔ اس کے شدنی ہونے کی حقیقت کے ادراک کو پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ جسے دیکھو وہ دُنیا میں اس طرح زندگی بسر کرتا ہے جیسے اس کو دائمی طور پر یہاں رہنا ہے' اِلّا ماشاء اللہ۔ اسی میں عافیت نظر آتی ہے' ورنہ یہاں کی ساری لذتیں اور عیش و آرام اجیرن بن جائیں۔ انسان کی اس کیفیت اور جہول کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر کہیں تمہیں معلوم ہو جائے تو تمہارے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہ آئے۔'' یعنی اس دنیا کی ساری لذتیں' چہل پہل اور چمک دمک انسان کو ہیچ نظر آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر موت کی حقیقت انسان کے فکر و نظر اور قلب و ذہن میں ایک شدنی اور بدیہہ حقیقت کی طرح مستحضر رہے تو یہ دُنیا اس کو قید خانہ معلوم ہو۔ اسی طرح اس کائنات کی سب سے بڑی اور شدنی حقیقت قیامت کا ظہور ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے کہ ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ)) (صحیح البخاری) حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک کی دو انگلیوں کو جوڑ کر اور اشارہ کر کے فرمایا کہ ''مَیں اور قیامت اس طرح مبعوث کیے گئے ہیں۔'' یعنی حضور ﷺ کے بعد تو بس قیامت ہی آنے والی ہے اور حضور ﷺ کی بعثت قربِ قیامت کی ایک علامت ہے۔ اسی حقیقت کی حضور ﷺ نے ان الفاظِ مبارکہ سے بھی تعلیم فرمائی کہ ((اَنَا آخِرُ الرُّسُلِ وَاَنْتُمْ آخِرُ

الْأُمَمِ)) ''مَیں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔'' یعنی اب نہ کوئی نبی و رسول مبعوث ہوگا اور نہ کوئی دوسری اُمت برپا ہوگی۔ اب قیامت قریب تر آ گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں اس درجے کا یقین پیدا فرمایا کہ جب کبھی تیز ہوا چلتی تھی تو صحابہ کرامؓ یہ سمجھتے تھے کہ قیامت آنے والی ہے۔ انہیں وہ صدی یا دو صدی پیچھے نظر نہیں آتی تھی کہ ابھی تو ''یہ'' ہونا ہے''وہ'' ہونا ہے' ابھی قیامت کہاں! یا بقولِ حفیظ جالندھری کہ ع 'ابھی تو میں جوان ہوں!'' یعنی ابھی موت کے تصور کا کیا موقع' اس کو کیوں قریب آنے دیا جائے۔ قیامت کا خیال آنا تو بہت ہی دور کی بات ہے۔ لیکن صحابہ کرامؓ کا جو تصور تھا' ان کی دینی زندگی میں جو اصل روح تھی 'ان کو جو فکر ہر وقت لاحق رہتا تھا' ان میں جو حرارت و جوش تھا اور ایثار و قربانی کا جو جذبہ ان کے رگ و پے میں موجزن تھا' وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کامل ایمان' رسالت پر ایقان' قیامت پر یقینِ محکم اور محاسبہ اُخروی کے خوف کا رہین منت تھا۔ اس کے بالکل برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ قیامت تو کجا ہم اپنی موت کے تصور کو بھی اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ دور رکھتے ہیں۔ یہی ہمارے دینی' اخلاقی اور عملی لحاظ سے اضمحلال و زوال اور انحطاط کا اصل سبب ہے! اسی حقیقت کے صحیح ادراک کے فقدان یا اس میں ضعف کے باعث آج پورے عالم اسلام میں ہمارا معاشرہ دینی و اخلاقی طور پر بے عملی اور بد عملی سے دوچار ہے۔

قیامت کی نشانیاں

قیامت کے ضمن میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے صراحتاً یہ ثابت ہے کہ اس کے وقوع کا قطعی علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان کی آخری آیت ان الفاظِ مبارکہ سے شروع ہوتی ہے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ﴾ (لقمٰن: ۳۴) ''قیامت کی گھڑی (وقت) کا علم بلاشبہ صرف اللہ کے پاس ہے۔'' اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو ہوتا تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوتا اور جبریل امین علیہ السلام کو ہوتا۔ چنانچہ حدیث جبریلؑ میں جس کو احادیث کے ذخیرے میں وہی اہمیت حاصل ہے جو

قرآن مجید میں سورۃ الفاتحہ کا مقام ہے —— سورۃ الفاتحہ کو اُم القرآن کہا جاتا ہے اور حدیث جبریلؑ کو اُم السنۃ —— بیان کیا گیا ہے کہ مسجد نبوی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ رونق افروز تھے کہ انسانی شکل میں حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چار سوال کیے۔ (اُس وقت کسی کو علم نہیں تھا کہ انسانی شکل میں آنے والے یہ صاحب جبریل ہیں) أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِسْلَامِ —— أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ —— أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِحْسَانِ! اور أَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے تینوں سوالوں کے مفصل جوابات ارشاد فرمائے۔ چوتھے سوال کے جواب میں جو قیامت سے متعلق تھا' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) یعنی جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ اس پوچھنے والے سے زیادہ واقف نہیں ہے! سورۂ لقمان کی آخری آیت کے ابتدائی حصے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجاتا ہے کہ قیامت کے وقوع پذیر ہونے کی گھڑی کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

آخر میں حضرت جبریلؑ پوچھتے ہیں: أَخْبِرْنِيْ عَنْ أَمَارَاتِهَا! تو اس (ساعت) کی کچھ نشانیاں بتایئے! جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ((أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا' وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ)) ''اس کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ اور آقا کو جنے گی اور دوسری نشانی یہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا اور تن پر کپڑا نہیں ہے' جو تہی دست اور بکریاں چرانے والے ہیں وہ بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں گے اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔'' پہلی نشانی کہ جب لونڈی اپنی مالکہ کو جننے لگے استعارہ ہے اس صورت واقعہ کے لیے کہ بیٹیاں جن کی سرشت میں ماؤں کی فرماں برداری کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے' اتنی سرکش ہو جائیں گی کہ ماؤں کے ساتھ وہ سلوک کرنے لگیں گی جو مالکہ اپنی لونڈی کے ساتھ کرتی ہے۔ مائیں اپنی بیٹیوں کی نافرمانی سے ڈرنے لگیں گی اور اس خوف میں مبتلا رہنے لگیں گی کہ پتہ نہیں بیٹی منہ سے کس وقت کیا کہہ دے اور کس قسم کی

گستاخی سے پیش آئے۔ اولاد میں بیٹے کی نسبت بیٹی کمزور صنف ہے۔ وہ فطرتاً شرمیلی، باحیا اور ماں باپ کے سامنے کم گو ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا یہ حال ہوگا کہ ماؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے لگے گی، اتنی جری ہوگی کہ ماں اس سے خوف کھانے لگے گی اور اس کا سلوک اپنی ماں کے ساتھ وہ ہوگا جو مالکہ کا اپنی لونڈی کے ساتھ ہوتا ہے تو بیٹوں کے اطوار اور ان کی نافرمانیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا، اس کا بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال قربِ قیامت کی پہلی بڑی نشانی ہے۔ یہ حالات ہمارے معاشرے میں اب نظر آنے لگے ہیں۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی لیکن آج جو صورتِ حال ہے اس کے لیے تصور کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بگاڑ اور فساد کا یہ نقشہ ہم کو چشم سر سے نظر آ رہا ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو دوسری علامت بتائی تھی اس کا نقشہ بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ خاص طور پر جن عرب ممالک میں تیل نکل آیا ہے وہاں یہ منظر ہے کہ آج سے چالیس پچاس سال قبل ننگے بدن رہنے والے چرواہے اور مفلس و قلاش لوگ آج دس دس، بیس بیس بلکہ اس سے بھی بلند بالا بلڈنگیں بنانے اور اس مقابلے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ یہ صورتِ حال قربِ قیامت کی دوسری بڑی علامت ہے۔ اب ہم ان دونوں بڑی علامتوں کا چشم سر سے اپنے معاشرے میں مشاہدہ کر سکتے ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ قیامت دُور نہیں۔ اس موقع پر میرا ذہن جگر ہی کے ایک شعر کی طرف منتقل ہوا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دُنیا سے قیامت دُور سہی، دُنیا کی قیامت دُور نہیں

ہمیں اس دُنیا میں بھی مکافات و مجازاتِ عمل کا ایک درجے میں ظہور نظر آتا ہے۔ یہاں بھی کچھ معاملات کسی قدر چکتے ہیں۔ بعض ظالموں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا قہر ٹوٹتا ہے۔ اس دنیا میں عبرت اور سبق آموزی کے لیے یہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر وہ بڑی قیامت دور بھی ہو جس میں کائنات کی یہ تمام بساط لپیٹ دی جائے گی، نئے قوانینِ قدرت کے ساتھ عالم

آخرت بپا ہوگا اور پوری نوع انسانی عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لیے کھڑی ہوگی' تو بھی اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی قیامتیں واقع ہوتی رہتی ہیں تاکہ خواب غفلت میں سرشار بنی آدم کو تنبیہ ہو۔ احادیث شریفہ میں اس النبا العظیم یعنی قیامت کی جو علامات بتائی گئی ہیں' ان کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنیں اور ہم چوکس و ہوشیار رہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اور کوئی مغالطہ لاحق ہو تو اس کو دور کر لیجیے کہ کسی صدی کا حساب لگا کر خواہ وہ چودھویں صدی ہو خواہ پندرھویں صدی' کوئی خبر نہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے نہ احادیث شریفہ میں۔ علاماتِ قیامت کے باب میں احادیث نبویہ میں غور و فکر کرنے سے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ڈرامہ اپنے ڈراپ سین یعنی اختتام سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ stage is being set تو دنیا میں وہ نقشہ اور وہ حالات تیار ہوتے نظر آ رہے ہیں جن کی خبریں دی تھیں الصادق والمصدوق جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے۔ میں ان حالات کا جن سے اس کرۂ ارض کو فی الوقت سابقہ پیش آ رہا ہے' ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس ضمن میں مولانا حامد میاں صاحب مدظلہ سے بہت مدد ملی ہے۔

قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث نبویہ میں جو کیفیات بیان ہوئی ہیں' ان سے ذہن میں آنے والے واقعات و حالات کی ایک ترتیب اور sequence بنتا ہے۔ اس میں کسی صدی' کسی سال' کسی وقت اور کسی مدت کا تعین کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعات کب رونما ہوں گے البتہ یہ قیاس ممکن ہے کہ ایسے واقعات مختلف مراحل میں رونما ہوں گے۔ ہر مرحلے میں کتنی مدت صرف ہوگی' کتنا عرصہ لگے گا' اس کا تعین بھی ممکن نہیں۔ البتہ قربِ قیامت کے متعلق مختلف احادیث نبویہ کو جمع کر کے غور و تدبر کیا جائے تو ایک اجمالی نقشہ اور خاکہ ذہن میں ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔

ہولناک جنگیں

احادیث شریفہ سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وقوعِ قیامت کے قریب کچھ جنگیں ہوں گی جن کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ایسی وسعت کی حامل ہوں گی جن کے

سامنے سابقہ جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ماند پڑ جائیں گی۔ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے۔ اس جنگ میں بے پناہ خوں ریزی ہو گی۔ نتیجتاً مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوت کو فتح حاصل ہو گی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کی طرف احادیث شریفہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے۔ عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب' عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔ نتیجتاً یہ تفرقہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلح معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر لے گا جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ ترکی' لبنان' شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ میرا گمان ہے کہ اس جنگ میں یہودیوں کی تمام دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہو گا۔ ان کا سرمایہ' ان کی ٹیکنیکل مہارت' ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مہلک اسلحہ' ان کے پراپیگنڈے کے ہتھیار سب عیسائیوں کی پشت پر ہوں گے۔ احادیث کے مطابق اس مرحلہ پر امام مہدی کا ظہور ہو گا۔

امام مہدی کی اس شخصیت اور شیعوں کی مفروضہ وتصوراتی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صرف نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ وہ جس مہدی کے ماننے والے ہیں' وہ ان کے بارہویں امام ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق غائب ہو گئے اور کسی غار میں مقیم ہیں۔ پھر وہی ظاہر ہوں گے اور وہی امام غائب' امام ظاہر ہوں گے۔ اس ضمن میں شیعوں میں بھی عقائد میں اختلافات ہیں' جن کی بنا پر ان کے ہاں بھی بے شمار فرقے موجود ہیں۔ ایسے بھی فرقے موجود ہیں جن کے نزدیک امام ہر وقت موجود رہتا ہے اور اس میں سابقہ امام کی روح حلول کرتی رہتی ہے (استغفر اللہ)۔ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

احادیث نبویہ سے ہمارے سامنے امام مہدی کی شخصیت اور ان کے ظہور کا یہ نقشہ آتا ہے کہ وہ ایک قائد اور رہنما کی حیثیت سے ابھریں گے۔ ان کا نام محمد ہوگا اور ان کے والد کا نام عبداللہ۔ وہ بیت اللہ شریف میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی امام مہدی موعود ہیں۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ ایک آسمانی ندا بھی ان کی نشان دہی کرے گی۔ وہ خود مہدی ہونے کے دعوے دار نہیں ہوں گے بلکہ لوگ ان کو از خود پہچانیں گے اور کوئی ندائے غیبی اس امر کی تائید کرے گی۔ مسلمان ان کی قیادت میں متحد ہو کر عیسائی قوتوں سے جنگ کریں گے اور ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ جائیں گے۔

پھر ایک اور مرحلہ آئے گا جس کو ہم تیسرا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ دجالِ اکبر کے ظہور کا وقت ہوگا۔ یہ خبر اس کے قبضے میں غیر معمولی اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آناً فاناً پھیل جائے گی۔ بعض احادیث میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران کا شہر) بتائی گئی ہے لیکن وہ خود بھی یہودی النسل ہوگا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہر ناقابلِ تسخیر قوت اس کی پشت پر ہوگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوگا۔ عیسائی قوتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اور مسلمانوں کو شدید ہزیمت و شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ شدید نقصانات اٹھاتے ہوئے امام مہدی کی قیادت میں وہ دِمشق کی طرف پلٹیں گے۔ احادیث نبویہؐ کی رو سے یہ عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کا وقت ہوگا۔

یہاں تھوڑا سا توقف کر کے یہ سمجھئے کہ احادیث کی روشنی میں کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں، جس کے جلو میں تباہی، ہلاکت اور خوں ریزی کے طوفان اُٹھنے والے ہیں۔ ہمیں یہ کہہ کر تھپکی دی جاتی ہے کہ پندرھویں صدی غلبہ اسلام کی صدی ہے اور اب روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان امانیوں سے بہل جاتے ہیں۔ ہمیں ان فرائض کا احساس ہی نہیں ہوتا جو اعلائے کلمۃ اللہ، احقاقِ حق، ابطالِ باطل اور غلبہ دین متین کی سعی و جہد کے حوالے سے ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی کٹھن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور قطرے کے گہر ہونے تک اس پر کیا کچھ بیتنے والی ہے۔ ان امتحانوں سے گزرنے کے لیے ہمارے پاس حقیقی دولتِ ایمان ہونی کتنی ضروری ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے قیام‘ دنیا بھر سے لاتعداد یہودیوں کی وہاں منتقلی‘ پھر ان ممالک کی طرف سے جو اکثریت کے لحاظ سے عقیدتاً عیسائی ہیں اسرائیل کی سرپرستی اور اس کی توسیع پسندانہ پالیسی کو پیش نظر رکھیے۔ غور کیجیے کہ اس کی سرحدیں کہاں تک پہنچی ہیں اور مستقبل کے لیے کون کون سے مقامات محاذِ جنگ بننے والے ہیں۔ بہرحال‘ صحاحِ ستہ جیسی بلند پایہ کتب کے علاوہ احادیث کے بے شمار مجموعوں سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں‘ ان میں قطعیت اور صراحت کے ساتھ دجالِ اکبر کے ظہور اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی سال وسن اور صدی کے تعین کے بغیر اُمت کو خبریں دی گئی ہیں۔ ان احادیث صریحہ کی روشنی میں ہمارا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بنفس نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ کسی ''مثیل مسیح'' یا ''بروزِ مسیح'' کے آنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ خیال وعقیدہ گمراہی ہے‘ ضلالت ہے‘ زیغ ہے بلکہ کفر ہے۔

نزولِ مسیحؑ

صحیح مسلم‘ جامع ترمذی‘ سنن ابوداؤد‘ سنن ابن ماجہ میں نزولِ مسیحؑ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ''دجال جب مسلمانوں کو پامال کرتا ہوا دِمشق کا محاصرہ کر لے گا تو اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریمؑ کو بھیجے گا۔ وہ دِمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا حدِ نظر تک جائے گی اور جس کافر تک پہنچے گی وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔'' ایک اور حدیث میں دجال کے ظہور کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ''پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو اَفیق کی گھاٹی

کے قریب ہلاک کر دے گا۔'' ان حدیثوں میں دجال کے قتل کا مقام لُدّ اور اَفیق کی گھاٹی کا قرب بیان کیا گیا ہے۔ لُدّ (Lydda) اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس وقت یہ یہودیوں کی سب سے بڑی ایئر بیس ہے۔ اَفیق آج کل فیق کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شام اور اسرائیل کی سرحد کا آخری شہر ہے جس کے آگے اسرائیل کی سرحد شروع ہوتی ہے اور لُدّ کے ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔

ان واضح احادیث اور تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ اسی مضمون کی بہت سی احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نزول فرمانے والے بنفسِ نفیس وہی حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام ہوں گے جن کے متعلق یہود و نصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نعوذ باللہ صلیب پر چڑھا دیے گئے تھے جبکہ قرآن مجید بصراحت اور شدّ ومدّ کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ﴿وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ (النساء:۱۵۷) قرآن پہلے بیان کرتا ہے کہ یہود کے دلوں پر ان کے جرائم میں سے قتلِ انبیاء، انکارِ انبیاء اور حضرت مریمؑ پر بہتانِ عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے اور اس باعث بھی کہ ''انہوں نے کہا کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے حالانکہ فی الواقع نہ انہوں نے اس (مسیح) کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔'' مشتبہ کر دینے کی صورت برنباس کی انجیل میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جس حواری نے غداری کر کے حضرت مسیح کے خلاف مخبری کی تھی اور رومی سپاہیوں کے ہاتھوں ان کو گرفتار کرایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل حضرت مسیحؑ کے مانند کر دی اور اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔(1) آگے قرآن مجید اصل حقیقت کو ان الفاظِ مبارک میں بیان کرتا ہے کہ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾ اور انہوں نے اس (مسیح) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس (مسیح) کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ زبردست طاقت رکھنے والا، حکیم ہے۔'' احادیثِ صحیحہ میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام

---

(1) یہی شخص دراصل صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔

دوبارہ اس دنیا میں بحیثیت نبی تشریف نہیں لائیں گے بلکہ اس وقت ان کی حیثیت خاتم النبیین آخر الرسل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک اُمتی کی ہوگی۔ احادیث میں ان کے نزول کا وقت نمازِ فجر کے قریب بیان ہوا ہے اور یہ بات بھی مذکور ہے کہ ''ان سے کہا جائے گا کہ آپ آگے بڑھیے اور نماز کی امامت فرمایئے لیکن آنجنابؑ انکار کردیں گے اور کہیں گے کہ تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے۔ وہ امام مہدیؑ کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔'' صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیسے ہو گے تم لوگ جبکہ تمہارے درمیان ابن مریمؑ اُتریں گے اور تمہارا امام اس وقت تم میں سے ہوگا۔'' اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں۔ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ ان کی حیثیت اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک اُمتی کی ہوگی اور اُمتِ مسلمہ کا نظم برقرار رہے گا۔

نزولِ مسیح علیہ السلام کے سلسلے کی جملہ احادیث پر غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزول کا اصل مشن دجال کا قتل اور یہود کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ قرآن حکیم میں رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نظر آتی ہے کہ جن قوموں کی طرف رسولوں کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے' وہ رسول کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کی پاداش میں ہلاک کردی جاتی ہیں۔ جیسے قومِ نوح' قومِ لوط' قومِ صالح اور قومِ شعیب علیہم السلام پر عذابِ استیصال کے نزول اور ان کی ہلاکت و بربادی کا تفصیل سے ذکر ہے۔ از روئے قرآن مجید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی' جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ کے آغاز میں فرمایا: ﴿وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت مسیح کی تکذیب پر ہلاک نہیں کیا گیا' ان پر عذابِ استیصال نہیں آیا۔ لہٰذا ان کی ہلاکت کا مرحلہ سنت اللہ کے مطابق ابھی آنا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا جن کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا اور ان ہی کے ہاتھوں سے یہود ہلاک اور نیست و نابود کردیے جائیں گے اور ان کا بالکلیہ استیصال ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور وہ حلقہ بہ گوش اسلام ہو

جائیں گے اور تمام دنیا پر دین الحق کی حکمرانی ہوگی۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ کی شان بکمال وتمام سارے عالم پر ظاہر ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم اور ترمذی و مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' ضرور اُتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر' پھر وہ صلیب کو توڑ دیں گے (فیکسر الصلیب) اور خنزیر کو ہلاک کریں گے (ویقتل الخنزیر) اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔ دوسری روایت میں جزیے کا لفظ ہے' یعنی جزیہ ختم کر دیں گے (ویضع الحرب اویضع الجزیۃ)۔ اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔'' تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح سند کے ساتھ مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ ان تمام احادیث میں یکسر الصلیب' یقتل الخنزیر اور یضع الجزیۃ کے جو الفاظ آئے ہیں اس کا مفہوم تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔

صلیب کو توڑنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ عیسائیوں کے اندر یہ دو لعنتیں سینٹ پال (پولوس) کی وجہ سے آئی تھیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اسے سینٹ (ولی) نہیں کہنا چاہیے۔ یہ پال ہی تھا جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کے چشمہ صافی میں عریاں ترین اور سب سے گھناؤنا شرک شامل کیا۔ یعنی حضرت مسیحؑ کو باقاعدہ اللہ تعالیٰ کا صلبی بیٹا قرار دے کر ان کو الوہیت میں شریک ٹھہرایا۔ پھر رُوح القدس کو جس سے عیسائیوں کے بعض فرقوں کے نزدیک حضرت جبریلؑ اور بعض کے نزدیک حضرت مریمؑ مراد ہیں' اقانیم ثلاثہ میں شامل کر کے تثلیث کا عقیدہ گھڑا۔ اسی پال نے یہ گمراہی بھی دین عیسوی میں بطورِ عقیدہ داخل کی کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے یعنی حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لعنت کی موت دے کر اس کے ماننے والوں کے گناہ کا کفارہ بنا دیا۔ اسی نے شریعت موسوی منسوخ ٹھہرائی۔ انجیل میں سرے سے کوئی شریعت تھی نہیں۔ لہٰذا انبیاء کی اُمتوں میں عیسائیت ہی وہ اُمت ہے جس

کی بنیاد صرف عقیدے پر ہے۔ شریعت ان کے ہاں موجود ہی نہیں‘ حالانکہ متی کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ قول اب بھی موجود ہے جو آنجنابؑ نے پہاڑی کے وعظ (Sermon of the Mount) میں کہا تھا کہ ”یہ نہ سمجھنا کہ مَیں شریعت کو ختم کرنے آیا ہوں۔ شریعت باقی اور جاری رہے گی“ (Don't think I have come to Destroy Law) لیکن یہودی ذہن انتہائی سازشی ہے جس کا شاہکار ایک پال تھا اور دوسرا عبداللہ بن سبا۔ اس پال نے جب شریعت موسوی ردّ کی تو خنزیر کو بھی حلال کر لیا گیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ حضرت مسیح اپنے نزول کے بعد خود اعلان فرمائیں گے کہ میں خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا بندہ ہوں (اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ) ۔ نہ مجھے صلیب پر چڑھایا گیا بلکہ مجھے میرے رب نے آسمانوں پر زندہ اٹھا لیا تھا۔ نہ مَیں نے خنزیر کو حلال کیا تھا اور نہ ہی مَیں نے شریعت کو ساقط کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق فرمائیں گے۔ نتیجتاً عیسائیت ختم ہو جائے گی۔ یضع الجزیۃ یعنی جنگ یا جزیہ کو ختم کر دینے کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ مسیح کے بعد اُمتوں کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ دوسرے تمام مذاہب وادیان مٹ جائیں گے اور سب لوگ ملت اسلام میں شامل ہو کر ایک اُمتِ واحدہ بن جائیں گے۔ اس طرح نہ جنگ وقتال کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور الصادق والمصدوق ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق آسمان سے رحمتیں نازل ہوں گی اور زمین اپنے تمام پوشیدہ خزانے اور برکتیں اُگل دے گی۔

متعدد احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فتنہ دجال کو فرو کرنے‘ یہودیوں کا استیصال کرنے‘ تمام باطل ادیان کو محو اور تمام ملل واُمم کو ملتِ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ضم کرنے کے بعد چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ چنانچہ مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دجال کے قصے میں بیان کرتی ہیں کہ ”پھر عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔“

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی ہوگی' وہ صاحبِ اولاد ہوں گے۔ پھر وہ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران:١٨٥) کے اٹل قانونِ قدرت سے دوچار ہوں گے' یعنی ان پر بھی طبعی موت واقع ہوگی جیسے ہر ذی نفس پر واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کی تدفین بھی اسی حجرۂ شریف میں ہوگی جس میں نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے دو جاں نثار (ابوبکر صدیق ؓ اور عمر فاروق ؓ) مدفون ہیں۔

ابن سبا کی سازش

مَیں نے پال کے ساتھ ایک دوسرے یہودی عبداللہ بن سبا کا بھی نام لیا تھا۔ ضمناً اس کا بھی کچھ حال سن لیجیے۔ پال نے تو حضرت عیسیٰ ؑ کے دین کا پورا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ابن سبا کی کوشش بھی یہی تھی کہ اسلام کی حقیقی تعلیم و دعوت کو بالکلیہ منسوخ کر دے۔ البتہ چونکہ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین اور آخر الرسل ہیں اور قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے' اب تا قیامِ قیامت کوئی نبی اور رسول آنے والا نہیں اور نہ کوئی کتاب نازل ہو گی نہ شریعت' اس لیے دینِ محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ اسی لیے الحمد للہ ثم الحمد للہ دینِ اسلام' اس کی تعلیمات' قرآن مجید' سیرتِ مطہرہ' ارشادات و فرمودات رسول اللہ ﷺ' سیر و احوال اور آثارِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بکمال و تمام جملہ تفصیلات و جزئیات کے ساتھ محفوظ و مامون ہیں۔ ورنہ ابن سبا کی سازش انتہائی گھمبیر اور خطرناک تھی۔ البتہ وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ مسلمانوں میں ایسے تفرقے کا بیج بو گیا جس کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار کی تلخیوں کا مزا اُمتِ مسلمہ چودہ سو صدیوں سے آج تک چکھ رہی ہے اور اس کے سازشی ہتھکنڈوں کا تاحال خمیازہ بھگت رہی ہے۔

عبداللہ بن سبا یمن کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان ہوا اور مسلمانوں میں شامل ہو کر سازشی ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ اہل بیت کی محبت کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر مفتوحہ علاقوں میں اپنے کارکنوں کے ذریعے خلیفہ برحق حضرت عثمان ذوالنورین ؓ کے خلاف مہم شروع کی اور بہت سے سیدھے سادھے نومسلموں کی عقیدتوں کا رخ شخصیت پرستی کی طرف موڑ دیا۔ اس نے حضرت علی ؓ سے عقیدت کے پردے میں بڑے گمراہ کن خیالات کی نشر و

اشاعت کے ذریعے توحید کے چشمہ صافی کو ناپاک کرنے کی مذموم حرکت کی۔

اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر حضرت علیؓ کی زندگی ہی میں ابن سبا کے بعض پیروؤں نے آنجنابؓ کو خدا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو زجر و توبیخ کی اور قتل کرانے کی دھمکی دی لیکن ابن سبا نے ان کو اس عقیدے پر اتنا پختہ کر دیا تھا کہ انہوں نے کہا: ''ہم مرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ اے علیؓ تم خدا ہو۔ تم ہماری اُسی طرح آزمائش کر رہے ہو جس طرح اللہ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی آزمائش کرتا ہے۔'' حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جلوا دیا۔ ابن سبا اس وقت حضرت علیؓ کے زیر اقتدار حدود سے باہر جا چکا تھا۔ جب حضرت علیؓ شہید ہو گئے تو ابن سبا نے جو زیر زمین موجود تھا' مزید گمراہ کن اور فساد انگیز خیالات پھیلانے شروع کیے۔ مثلاً یہ کہ حضرت علیؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے ایک شیطان کو اپنی صورت دے کر آسمان پر چڑھ گئے جس طرح عیسیٰ ابن مریمؑ آسمان پر چڑھ گئے تھے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ قتل عیسیٰؑ کے دعوے میں جھوٹے ہیں اسی طرح خوارج بھی قتل علیؓ کے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ جس طرح یہود و نصاریٰ نے اس شخص کو مصلوب دیکھا جس کی صورت حضرت عیسیٰؑ کی صورت پر بنا دی گئی تھی اسی طرح قتل علیؓ کے دعوے داروں کو قتیل بصورت علیؓ نظر آیا۔ نعوذ باللہ من ذالک!

بخاری میں ابن سبا کی ان ریشہ دوانیوں کا اجمالاً ذکر موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا احادیث کا ایک مجموعہ ''مسند ابوحنیفہ'' کے نام سے موجود ہے' جس میں ابن سبا کا قصہ تفصیل سے مذکور ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اُمت میں سیاسی اعتبار سے تفرقے اور دینی اعتبارات سے شخصیت پرستی' الوہیت علیؓ اور بے شمار مشرکانہ نظریات و عقائد کا پہلا بانی و مبانی یہی ملعون عبداللہ ابن سبا ہے۔ اس مسلمان نما یہودی نے ایسے کانٹے بوئے تھے اور ایسے فتنوں کی داغ بیل ڈالی تھی کہ ہم آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اسی شجر خبیثہ کی بے شمار شاخیں آج اپنی جگہ تناور درختوں کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے تلخ برگ و بار سے ہم کو سابقہ پیش آ رہا ہے۔ اس فتنے کی کوکھ سے سینکڑوں فتنے پیدا ہو چکے ہیں'

جن میں سے بعض بڑی شدومد کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔ امید افزا بات یہ ہے کہ امام مہدیؒ کے ظہور اور حضرت مسیح ابن مریمؑ کے نزول سے یہ تمام جھاڑ جھنکار صاف ہو جائیں گے اور اسلام و توحید کے خورشید تاباں سے سارا جہاں منور ہو گا' ان شاء اللہ العزیز۔

علاماتِ قیامت کا ظہور

احادیثِ نبویہؐ میں قربِ قیامت کے متعلق جو علامات اور پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں وہ ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ گویا آخری سین کے لیے سٹیج تیار ہو رہا ہے۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر تھے' ان کی ''اسرائیل'' کے نام سے فلسطین میں ایک آزاد و خود مختار ریاست آج سے تقریباً چالیس سال قبل قائم ہو چکی ہے۔ تمام دنیا سے سمٹ سمٹ کر یہودی یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا سرمایہ' ان کی قابلیت' ذہانت اور مہارت مجتمع ہو کر عالم اسلام کے لیے ایک عظیم خطرہ بن چکی ہے۔ اس خطرے کا عملی مظاہرہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں شام' اُردن' لبنان اور مصر کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ آج تک برقرار ہے۔ بیت المقدس پر بھی وہ قابض ہے اور اس کی حرمت اس کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے دلوں میں اللہ کے آخری رسولؐ' آخری کتاب' آخری و مکمل دین و شریعت سے جو بغض و عداوت اور حسد تھا اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ یہ اُمویوں' عباسیوں' فاطمیوں اور عثمانیوں کی مسلم حکومتیں تھیں جنھوں نے یورپ کے متعصب عیسائی حکمرانوں کے جور و ستم سے یہودیوں کو نجات دلائی تھی اور جن کی زیر عافیت یہ باقی بھی رہے اور پھلتے پھولتے بھی' لیکن ان کا سازشی اور انتقامی ذہن اسلام کی سلامت روی سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔

اسی یہودی ذہن کی کرشمہ سازیاں آج دنیا میں مادہ پرستانہ فکر و نظر پر قابو یافتہ ہیں۔ عریانی' فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے جو مناظر آج دنیا دیکھ رہی ہے اس کی ترویج میں بہت بڑا حصہ یہودی دانشوروں اور سرمایہ داروں کا ہے۔ یورپ کے متعدد ممالک' خاص طور پر امریکہ کے ذرائع ابلاغ اور فلمی صنعت پر زیادہ تر یہودیوں کا hold ہے۔ یہی حال بڑی بڑی صنعتوں اور بینک کاری کا ہے۔ جن اداروں پر ان کا براہِ راست قبضہ

نہیں ہے، وہ ان کے زیر اثر ہیں۔ ایوانِ حکومت میں بھی وہ بہت با اثر ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے تقریباً پچاس پچپن سال پہلے کہا تھا کہ بقول ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔'' آج یہ صورت حال واضح طور پر دنیا کے افق پر نظر آ رہی ہے۔ سود خواری یہود کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا گوشت پوست اور خمیر اسی حرام کی غذا سے بنا ہے۔ آج اسی یہودی ذہن کی سازش کے باعث دنیا کی تمام معیشت سودی لین دین کی لعنت میں گرفتار ہے۔ پھر اس کو فریب اور پُرکاری کا ایسا جامہ پہنایا گیا ہے کہ لوگ اس کی مضرتوں کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔

امریکہ اور کینیڈا میں اس سودی کاروبار کی فریب کاری کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ وہاں لوگ مکان خریدتے ہیں اور اس کی قیمت بینک سے قرض لے کر ادا کرتے ہیں۔ بینک والے اور مکان فروخت کرنے والے زیادہ تر یہودی ہیں۔ بینک ضمانت میں مکان رہن رکھ لیتا ہے۔ تیس سال کی قسطوں میں یہ اصل رقم مع سود واپس کرنی ہوتی ہے۔ آغاز ہی میں اس پر سود در سود کے حساب سے سود کی رقم محسوب ہوتی ہے اور پھر ماہانہ اقساط میں وصول یابی شروع ہوتی ہے، یعنی اصل سے پہلے سود لینا شروع ہوتا ہے۔ لوگ اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ مکان ہمارا ہو گیا حالانکہ مکان بینک کے پاس رہن ہوتا ہے۔ اگر قسطوں کی ادائیگی میں بے قاعدگی ہو جائے تو مکان ضبط۔ بینک اس کو نیلام بھی کر سکتا ہے یا دوبارہ فروخت کر سکتا ہے۔ کمی پہلے خریدار کے ذمے رہے گی۔ پھر جو مکان پچاس ہزار ڈالر کی قیمت کا ہوتا ہے وہ اس لعنتی سودی دھندے کی وجہ سے تین گنا زیادہ قیمت کا پڑتا ہے۔ میرے حالیہ دورے میں ٹورنٹو میں ایک صاحب نے تنظیم اسلامی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ کسی سودی لین دین سے تعلق نہ ہو۔ انہوں نے اسی رہن کے اصول پر مکان لے رکھا تھا اور تین چار سال سے پابندی سے اقساط ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے کُل ادائیگی کر کے رہن ختم کرانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ابھی تو صرف سود بھی پورا ادا نہیں ہوا، اصل میں سے کچھ ادائیگی کا کیا سوال! یہ ہیں سودی ہتھکنڈے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ امریکہ میں حکومت پر یہودیوں کے اثر کی

وجہ سے انکم ٹیکس کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ عیارانہ اور ظالمانہ قاعدہ رائج ہے کہ اگر کوئی شخص کرایہ پر مکان لیتا ہے اور پانچ سو ڈالر ماہانہ کرایہ ادا کرتا ہے تو یہ خرچ ٹیکس کے حساب میں شمار نہیں ہوگا بلکہ mortgage کر کے اس پر ٹیکس لیا جائے گا۔ لیکن اگر رہن پر کسی نے مکان لیا ہے تو وہ اس کی قسط اور سود کی جو رقم بینک کو ادا کرتا ہے' وہ خرچ میں شمار ہوتی ہے اور انکم ٹیکس میں وضع ہو جاتی ہے۔ اس طرح حکومت انکم ٹیکس کی جو چھوٹ دیتی ہے' اس کا اصل فائدہ یہودی بینک کار ہی کو ہوتا ہے اور حکومت نقصان میں رہتی ہے۔ یعنی وہاں لوگوں کو ایسے جال میں کس دیا گیا ہے کہ وہ کرایہ پر مکان لیں تو کرایہ کو خرچ میں نہیں ڈال سکتے۔ اگر سود پر مکان خریدیں تو حکومت اس رقم کے ٹیکس کا نقصان برداشت کر لیتی ہے اور یہ ادائیگی کرنے والا مطمئن رہتا ہے۔ اس وقت معیشت اور ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا جو تسلط اور اثر و رسوخ ہے اس کا ذکر تو ضمنی طور پر آ گیا۔ اب آیئے اصل موضوع کی طرف!

سرخ سامراج اس وقت خلیج کی ریاستوں اور عرب سلطنتوں پر واضح طور پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا ہے۔ ''سیال سونے'' پر قابض ہونے اور گرم پانی تک پہنچنے کے لیے اس کے عزائم کا اندازہ معمولی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی بآسانی لگا سکتا ہے۔ افغانستان میں روسی جارحیت ان ہی عزائم کی تکمیل کی طرف پہلا قدم معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے مسلم ممالک جن میں مصر خاص طور پر قابل ذکر ہے' چاروناچار امریکہ کی طرف جھکتے چلے جا رہے ہیں اور کچھ ایسا نقشہ جمتا نظر آ رہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑنے کا وقت دُور نہیں۔ اگر یہ جنگ چھڑی تو سب سے بڑا میدانِ جنگ مشرق وسطیٰ ہو سکتا ہے اور عجب نہیں کہ بیشتر مسلم ممالک خواہی نخواہی امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شامل ہوں۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ گویا احادیثِ نبویہ میں جس عظیم جنگ' ہلاکت و بربادی کی خبر دی گئی تھی کہ جس میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے' اس کے آثار سامنے نظر آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس متوقع ہولناک تباہی کے ظہور میں آنے میں کچھ اور وقت لگے لیکن موجودہ حالات کی سنگینی بتا رہی ہے کہ یہ جنگ اور ٹکراؤ ناگزیر اور

اٹل ہے۔ یہودی اس جنگ میں یقیناً امریکہ ہی کے حلیف ہوں گے چونکہ امریکہ کی حمایت ہی میں اس سرطان نے مشرق وسطیٰ میں پنجے گاڑے ہیں اور امریکہ ہی اس وقت ان کا سب سے بڑا حامی و مددگار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوقع جنگ کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں کے دلوں میں یہودی ہی نفرت کا بیج بونے کا کردار ادا کریں گے۔ پھر دجال کی قیادت میں عیسائی مملکتوں کی تائید و اعانت حاصل کر کے مسلمانوں پر یلغار کریں گے اور مسلمان شکست و ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ یہی وقت ہوگا حضرت مسیحؑ کے نزول کا اور یہی دور ہوگا جب یہودیت کا بالکلیہ استیصال ہوگا' عیسائی دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہوگا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ امن و سلامتی کا یہ دور کتنے سال اور کتنی صدیوں تک رہے گا۔

پھر انسانیت کا قافلہ صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹ کر شیطان کی بتائی ہوئی پگڈنڈیوں میں بھٹک جائے گا۔ حتیٰ کہ زمین پھر اللہ تعالیٰ سے بغاوت و سرکشی کی وجہ سے ظلم و ستم اور جور و تعدی سے معمور ہو جائے گی۔ شر غالب ہوگا جبکہ خیر مغلوب ہی نہیں' ناپید اور معدوم ہو جائے گا۔ یہ زوال دنیا کا خاتمہ لے کر آئے گا اور وہ ساعت جس کو ہم قیامت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی خبر قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے دی گئی ہے' آئے گی۔ یہ دنیا اور کائنات تہ و بالا اور ملیامیٹ کر دی جائے گی۔ نظامِ ثقل درہم برہم ہو جائے گا۔ اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلے ہوئے عظیم الشان ستارے اور کرے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ عالم تہس نہس ہو جائے گا۔ سورۃ الحج کے آغاز میں فرمایا گیا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمْۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ ٱلسَّاعَةِ شَىْءٌ عَظِيمٌ ①﴾ ''لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔'' سورۃ التکویر میں فرمایا: ﴿إِذَا ٱلشَّمْسُ كُوِّرَتْ ① وَإِذَا ٱلنُّجُومُ ٱنكَدَرَتْ ② وَإِذَا ٱلْجِبَالُ سُيِّرَتْ ③﴾ اور سورۃ الانفطار میں فرمایا: ﴿إِذَا ٱلسَّمَآءُ ٱنفَطَرَتْ ① وَإِذَا ٱلْكَوَاكِبُ ٱنتَثَرَتْ ② وَإِذَا ٱلْبِحَارُ فُجِّرَتْ ③﴾

حاصل کلام

یہ کائنات مشیت وحکمتِ خداوندی کے تحت اپنے اجل مسمّی کی طرف گامزن ہے اور اس انجام سے لازماً دوچار ہوگی جو اس کا مقدر ہے۔ لیکن اس انجام کے وقت' سال یا صدی کا تعین کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' جیسا کہ سورۂ لقمان کی آخری آیت اور حدیث جبرئیلؑ کے حوالوں سے بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ یہ گھڑی آ کر رہے گی۔ اس میں شک کرنا کفر ہے۔ اس آخری گھڑی کے آنے تک اُمّتِ مسلمہ اور بنی نوع انسان جن حالات سے دوچار ہوتی رہے گی' اس کا جو نقشہ احادیثِ نبویہ سے سامنے آتا ہے' ان کو بھی مَیں نے بیان کر دیا ہے اور ہم آج جن حالات سے گزر رہے ہیں ان پر غور کرنے سے پیش آنے والے واقعات وحادثات کا جو خاکہ ذہن میں بنتا ہے اس کو بھی بیان کرنے کی مَیں نے امکانی حد تک کوشش کی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن وحدیث میں کسی صدی کے تعین کے ساتھ کوئی خبر نہیں دی گئی ہے۔ البتہ احادیث میں علامات بیان ہوئی ہیں اور وہ علامات ہم کو چشم سر سے نظر آ رہی ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمیں بہت کٹھن مراحل اور سخت امتحانات سے گزرنا ہے۔ یہ محض خام خیالی ہے کہ پندرھویں صدی ہمارے لیے غلبہ اسلام کی نوید لے کر آ رہی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی اُمتِ مسلمہ کو کن کن صدموں اور حادثوں سے دوچار ہونا ہے! البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک دَور آئے گا جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا۔ بڑے نصیبے والے ہوں گے وہ لوگ جو امام مہدی اور حضرت عیسیٰؑ کے زیر قیادت فی سبیل اللہ اور غلبہ دین حق کے لیے جہاد وقتال میں اپنی جان ومال کی قربانیاں پیش کریں گے۔ بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے وہ جو غلبۂ اسلام کے اس دور سے متمتع ومستفیض ہوں گے۔ بڑے خوش بخت ہیں وہ لوگ جو اس دورِ سعید کے لیے اس وقت اپنا تن من دھن لگانے کی سعادت حاصل کریں۔

ہمارے لیے عبر وبصائر

غلبۂ اسلام کا دور' پھر کفر وشرک اور ضلالت کا دور دورہ' بعدہٗ قیامت کا ظہور۔ یہ مستقبل کی باتیں ہیں اور مشیت الٰہی کے مطابق ان کا وقوع پذیر ہونا برحق ہے۔ سوال یہ

ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ دین کے ساتھ ہمارا انفرادی و اجتماعی تعلق اور رویہ کیا ہے؟ اس نقطہ نظر سے جب ہم اس وقت کی مسلم اقوام کا جائزہ لیتے ہیں تو سخت مایوسی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ میں نے مسلم اقوام اس لیے کہا ہے کہ اُمتِ مسلمہ فی الواقع ایک وحدت اور اکائی کی صورت میں آج موجود نہیں۔ ہمارا کوئی مرکزی نظم نہیں۔ مختلف ممالک میں ہماری آزاد و خود مختار مملکتیں البتہ قائم ہیں۔ ان کا حال بھی یہ ہے کہ اسلامی شریعت کہیں بھی نظامِ مملکت کی حیثیت سے قائم نہیں۔ سعودی عرب میں شریعت کی حدود و تعزیرات اور قوانین جاری ہیں بھی تو اس کا نظامِ حکومت اسلام کے شورائی نظام سے تہی دست ہے۔ وہاں ایک خاندان کی بادشاہت کا نظام چل رہا ہے۔ اس اُمت کو ایک مقصد کے لیے برپا کیا گیا تھا اور ایک فرض اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرة:۱۴۳) ''اور اس طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر (حق کے) گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہو'' یا ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین (زندگی کا نظام) صرف اسلام ہے'' یا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۱۰) ''اب دُنیا میں وہ بہترین اُمت (گروہ) تم ہو جسے انسانوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو'' یا ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''(اے ایمان والو!) کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (نظامِ حکومت و اطاعت) پورا کا پورا اللہ کے لیے نہ ہو جائے''۔ پھر شہادت علی الناس اور دعوت و تبلیغ کا فرض حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کے سپرد کیا تھا یہ ارشاد فرما کر کہ ((فليبلغ الشاهد الغائب)) ''پس پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔ اس فرض کی ادائیگی کے لحاظ سے ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟

عبادت رب کا جو حکم ہم کو دیا گیا تھا' اس کا ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں کیا رتبہ ہے؟ اس نقطہ نظر سے جب بھی کوئی دردمند مسلمان دیانت و صداقت کے ساتھ خود اپنا' اپنے ملک اور دوسرے مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کا جائزہ لے گا تو اس کا سر لازماً شرم وندامت سے جھک جائے گا۔ اسے خود محسوس ہوگا کہ نہ صرف ہمارا پورا معاشرہ بلکہ وہ خود بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے تنزل پذیر ہے۔ الا ماشاء اللہ!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ ''میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔'' اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِي كَمَا أَتٰى عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))۔ خدا کا عدل بے لاگ جبکہ اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل ہے۔ جو معاملہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں' ناشکریوں اور دین کے ساتھ استہزا کی وجہ سے ان کے ساتھ کیا گیا تھا بعینہٖ وہی معاملہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے چونکہ ہم بھی بحیثیت اُمت انہی جرائم کے مرتکب ہوتے چلے آ رہے ہیں جن کے مرتکب بنی اسرائیل ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل پر عروج و زوال کے دو ادوار آئے۔ ہماری تاریخ بھی یہی نقشہ پیش کر رہی ہے۔ ہم بھی عروج کے دو ادوار سے گزر چکے ہیں۔ زوال کا پہلا دور صلیبی جنگوں اور تاتاریوں کی یلغار کی صورت میں آیا۔ پھر رحمتِ خداوندی نے ہماری دستگیری فرمائی اور جن تاتاریوں اور مغلوں کے ذریعے عربوں کو پٹوایا تھا ان ہی کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دی اور قیادت کا علم ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی تاریخی حقیقت کو اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ترکانِ عثمانی کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ قسطنطنیہ ان کے ہاتھوں فتح ہوا۔ ان کی سطوت کا یہ عالم تھا کہ پورا جزیرہ نما بلقان ان کے زیر نگیں آ گیا۔ مغرب میں سلطنت عثمانیہ کی سرحدیں ہنگری تک پہنچ گئیں اور جنوب میں اٹلی کے دروازوں پر ان کی فوج دستک دے

رہی تھی۔ لیکن پھر مسلمان عیش کوشی میں مبتلا ہوئے اور اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کی سنت پوری ہوئی۔

ایک طرف پندرھویں صدی کے اواخر میں سلطنت ہسپانیہ کا قلع قمع ہو گیا اور ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہوگئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے جیسے کہ ''وہ کبھی وہاں آباد ہی نہیں تھے''۔ دوسری طرف جنوب میں ہندوستان، ملایا، انڈونیشیا میں مسلمانوں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے مغربی استعمار کے چنگل میں گرفتار ہوئیں، اور سیاسی طور پر اُن کی غلام بن گئیں۔ بعدہٗ عذابِ خداوندی کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے خاتمے پر دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہوگئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا۔ اسلام و مسلمان دونوں اپنے زوال و انحطاط کو پہنچ گئے اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہوگئی جس کی خبر دی تھی الصادق والمصدوق ﷺ نے کہ ''مسلمانوں کا حال کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود ''غُثَاءِ السَّيْلِ'' یعنی سیلاب کے جھاگ جیسا ہو جائے گا اور اقوامِ عالم ایک دوسرے کو مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوت کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چنے جانے کے بعد مہمانوں کو بلاتا ہے''۔ مخبر صادق ﷺ نے پیشگی متنبہ فرما دیا تھا کہ ایسا اس لیے ہوگا کہ ''مسلمانوں میں حبِ دنیا اور کراہتِ موت کا مرض پیدا ہو جائے گا''۔ یہی ہوا اور جب مسلمان فکرِ آخرت سے دُور ہو گئے اور ان کو دُنیا کی زندگی اتنی محبوب ہوگئی کہ موت ہی نہیں بلکہ اس کے تصور سے بھی ان کو کراہت آنے لگی تو دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ان کی نہ کوئی ساکھ رہی نہ عزت و وقار رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تیس چالیس سال کے عرصے میں مغربی استعمار کے براہِ راست تسلط اور غلامی سے نجات اگرچہ مل چکی ہے لیکن اب بھی ہم من حیث المجموع مغرب کی علمی، فکری اور تہذیبی غلامی میں مبتلا ہیں۔ ابھی تک کوئی مسلم ملک ایسا موجود نہیں

ہے جس کو صحیح معنوں میں ''اسلامی ملک'' کہا جا سکے۔ یعنی جس ملک میں اسلام کے نظام کی برکات کا ظہور نظر آتا ہو اور جس کے معاشرے کو ''اسلامی معاشرہ'' کہا جا سکے۔ حال یہ ہے کہ ہمارے قول و عمل میں بہت نمایاں تضاد ہے جو مسلمانوں کے ہر ملک اور ہر معاشرے میں نظر آ رہا ہے۔ قول و عمل کا تضاد اللہ تعالیٰ کے غضب کو بہت بھڑکاتا ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصف) ''اے ایمان والو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ اور اس کے غصے کو بھڑکانے والی ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔''

دور جانے کی ضرورت نہیں' خود اپنے ملک کا حال دیکھ لیجیے۔ ہم نے خدا اور خلق کے سامنے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کو اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ پاکستان کا مطلب کیا: لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ! لیکن تینتیس سال گزر چکے ہیں' اسلام کی طرف حقیقی پیش رفت تو دُور کی بات ہے ہم اس کے برعکس روز بروز اسلام سے اور دُور ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ بدعہدی کا ایک خمیازہ ہم کو اس صورت میں بھگتنا پڑا کہ ہمارا ایک بازو الگ ہو گیا اور وہاں خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی گردنیں کٹیں' عزت و آبرو پامال ہوئی' عصمت و عفت کے آبگینے پاش پاش ہوئے اور مال و منال لٹے۔ بربریت اور وحشت کا وہ دردناک دور دورہ ہوا کہ قیامِ پاکستان کے وقت غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں پر مظالم و مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے تھے وہ بھی ماند پڑ گئے۔ عذابِ الٰہی کی بدترین صورت یہی ہے جو کسی اُمت پر آتی ہے کہ مسلمانوں کا ایک فریق دوسرے مسلمان فریق کے خون کا پیاسا بنا دیا جاتا ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ (الانعام: ۶۵) ''یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔'' ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دوران عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا۔ ۱۹۷۰ء میں بنگالی مسلمانوں نے غیر بنگالی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور اب ۱۹۸۰ء میں عذابِ الٰہی ہی کی ایک صورت ہم ایران و

عراق کی جنگ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے دانشور بنگلہ دیش بننے کے یہ اسباب بیان کرتے نہیں تھکتے کہ صدر ایوب کی حکومت کے دوران بنگالیوں کو احساس ہوا کہ مرکزی حکومت میں ہمارا کوئی عمل دخل اور حصہ نہیں ہے۔ یوں بنگالیوں میں احساس محرومی پیدا ہوا اور اس کے ردعمل میں مشرقی پاکستان میں فسادات ہوئے اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ظاہری حالات و اسباب ہیں' ان کے علاوہ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اصل سبب وہی ہے جس کی طرف قرآن رہنمائی کرتا ہے۔ ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرۃ: ۴۰) ''اور میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اُسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں گا۔'' اللہ سے بدعہدی کے خمیازے ہی میں ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو پھر ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم ظاہری اسباب و حالات میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور اس اصل خرابی کی طرف ہماری نگاہ نہیں جاتی جو ان اسباب کے پیدا کرنے کی حقیقی وجہ ہے۔

یہ محض طفل تسلی ہے کہ پندرھویں صدی ہجری کا آغاز اُمتِ مسلمہ کے لیے اچھے حالات میں ہو رہا ہے' بلکہ ایسا نظر آ رہا ہے کہ ابھی عذابِ الٰہی کے مزید کوڑے ہماری پیٹھ پر برسنے والے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زوال اور پھر عام انتخابات کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے جن عزائم کا اظہار کیا تھا اس سے یہ اُمید ہو چلی تھی کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی طرف تیزی سے پیش قدمی ہوگی چونکہ اس وقت فضا تیار تھی۔ تاہم' بہت سا وقت تو احتساب کی نذر ہو گیا اور بہت سا وقت تذبذب و تردد میں گزر گیا۔ جو تھوڑے بہت اقدامات کیے گئے ان میں نیم دلانہ کیفیات نظر آئیں۔

عالمِ اسلام کی صورت حال

چودھویں صدی ہجری کے اواخر میں ایران میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا جو دُنیا میں اسلامی انقلاب کے نام سے متعارف ہوا۔ وہاں صورتِ واقعہ یہ تھی کہ اصلاً تو تحریک شہنشاہ کے ظلم و ستم' جور و تعدی اور انتہائی جابرانہ آمریت کے

خلاف اٹھی تھی۔ اسی لیے اس میں سیکولر ذہن والی بائیں بازو والی لبرل اسلام والی حتیٰ کہ ذہناً اور عملاً ملحد و اشتراکیت کی پرستار قوتیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ البتہ انقلابی تحریک میں غالب عنصر مذہب دوست عناصر کا تھا جن کی پشت پر خمینی صاحب جیسی مقرو معتمد مذہبی راہنما کی شخصیت موجود تھی۔ ان کی قیادت اور مذہبی حیثیت کو چیلنج کرنے کی دوسرے گروہوں کو ہمت نہیں تھی۔ اس لیے اس تحریک میں مذہبی عنصر غالب رہا اور اس کو ''اسلامی انقلاب'' سے موسوم کیا جاتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایران کے انقلاب نے دنیا کو چونکا دیا۔ ایک سال قبل تک کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایران میں شہنشاہ کے اقتدار کا خاتمہ تو درکنار اس کو ہلایا بھی جاسکتا ہے۔ اس انقلاب نے ایک طرف مغربی دنیا کو اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی طرف متوجہ کیا تو دوسری طرف ان خطوں میں جہاں اسلامی انقلاب کی داعی جماعتوں میں مایوسی چھا چکی تھی مرجھائی ہوئی اُمیدیں کروٹیں لینے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اسلامی نظام کی تحریکات نئے جوش و ولولے سے اُٹھیں گی اور ہمارے مسلم حکمران ایران کے اس انقلاب سے سبق وعبرت حاصل کر کے اسلامی تحریکوں کی راہ میں مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے لیے مدد معاون ثابت ہوں گے۔

ایسا ہوتا نظر نہیں آتا بلکہ ہماری بدبختی کہ ابھی پندرھویں صدی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایران میں لبرل اسلام اور (ایرانیوں کے اپنے عقائد کے مطابق) Orthodox اسلام میں باہمی اختلافات رونما ہونے شروع ہوگئے اور ان کی باہمی کشمکش بڑھتی چلی گئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انقلاب دشمن عناصر اور اس اسلامی انقلاب سے خوف زدہ گروہ عراق کی بعثی حکومت کی پشت پر آ گئے ہیں۔ یہ فکر و نظر کے لحاظ سے اسلام کے بنیادی عقائد سے بہت بعید اور سیکولر نظامِ حکومت میں سے بھی اشتراکیت سے بہت قریب ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی اس عالم میں وارد ہوئی ہے کہ دو مسلم ہمسایہ حکومتیں برسرپیکار ہیں اور ان کے مابین آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ہماری بے عملیوں اور بدعملیوں کی پاداش میں ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ﴾ کی سنت اللہ ظہور فرما رہی ہے اور ایران و عراق کی یہ جنگ اس بات کا ثبوت

ہے۔ جیسا کہ مَیں نے کہا تھا کہ ابھی عذابِ الٰہی کے اور کوڑے ہماری پیٹھ پر برسنے باقی ہیں۔ ذرا اندازہ تو لگائیے کہ دنیا بھر میں اسلام دشمن عناصر بالخصوص یہودی ایران و عراق کی اس جنگ سے کتنے خوش ہو رہے ہوں گے! ان کے ہاں تو شادمانی کے نقارے بج رہے ہیں۔ ان دونوں مسلم حکومتوں کا اس جنگ کے نتیجے میں جو بھاری نقصان اب تک ہو چکا ہے' اس کی تلافی ایک ربع صدی تک ممکن نہیں اور ابھی اس جنگ کے رکنے کے دُور دُور تک آثار نہیں۔ پھر روس منہ کھولے منتظر نظر آ رہا ہے۔ کیا عجب کہ اس جنگ کے نتیجے میں جب ایران کی دفاعی قوت کمزور سے کمزور تر ہو جائے تو وہ پیش قدمی کرے اور گرم پانی تک پہنچنے کی اپنی قدیم تمنا پوری کرے۔ اس جنگ کے جو حالات سامنے آ رہے ہیں' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران عراق کے حملوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ سرحدی علاقوں میں سے اکثر عراق کے تسلط میں آ چکے ہیں۔ پھر بھلا ایران' روس سے کیسے نبرد آزما ہو گا! ایران میں ایسے عناصر کی کمی نہیں جو روسی یلغار کا خیر مقدم کریں گے اور اندرون ایران ففتھ کالم کا کردار ادا کریں گے۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ متوقع روسی یلغار کی صورت میں مسلح مداخلت کرے' ایرانیوں کی ہمدردی میں نہیں بلکہ اپنے مفاد میں' چونکہ خلیج کی ریاستوں کے ''سیال سونے'' سے سب سے زیادہ وہی متمتع ہو رہا ہے۔ اس کی معیشت' فوجی طاقت اور اسلحہ سازی کا بڑی حد تک ''سیال سونے'' سے مالا مال ممالک سے درآمدی و برآمدی تجارت پر انحصار ہے۔ اس کے مال کی کھپت کی بڑی منڈیاں یہی ممالک ہیں۔ پھر اس کے لیے تو یہ سنہری موقع ہو گا کہ میدانِ جنگ مشرق وسطیٰ کو بنایا جائے اور یہیں اپنی قوت اور مہلک اسلحہ کو آخری حد تک آزما لیا جائے۔ یہ اندیشہ بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ کہیں ایران و عراق کی جنگ ایران اور عرب کی جنگ کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ایسا ہوا تو ہم ایک بہت بڑی ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔

ادھر مصر اور لیبیا میں بھی سخت اختلافات موجود ہیں جو تفرقے اور نفرت و عداوت تک پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعید نہیں یہ دونوں مسلم ملک بھی یہودی سازش (یعنی روس اور امریکہ) کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو

جائیں۔ شام اور اردن میں بھی ہر وقت مسلح تصادم کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ سعودی حکومت صلح و آشتی کی کوشش کر رہی ہے' خدا کرے کہ اسے کامیابی حاصل ہو۔ لیکن یہودی ذہن برابر سازش میں لگا رہے گا اور عجب نہیں کہ کسی وقت فلیتے کو آگ لگا دی جائے' جو مسلمانوں کے لیے تباہ کن اور یہودیوں کے لیے خوش آئند ہو۔ شام میں اس وقت بعث پارٹی برسر اقتدار ہے' جو کمیونسٹ پارٹی ہی کا دوسرا روپ ہے۔

یہ فرقہ اہل سنت کا تو دشمن ہے ہی' ان شیعوں کا بھی دوست نہیں جو حضرت علیؓ کی الوہیت کے قائل نہیں۔ یہ فرقہ مکمل طور پر سبائیت کا ظِل ہے۔ ان کے ہاتھوں شام میں سنیوں خاص طور پر اخوان المسلمون کے نوجوانوں کی گردنیں کٹ رہی ہیں اور ان کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ جمال ناصر نے جب اخوان پر ظلم کیا تھا تو پورے عالم اسلام میں شور مچ گیا تھا' ہر طرف سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئی تھیں لیکن آج شام میں حافظ الاسد کے ہاتھوں جمال ناصر سے دس گنا زیادہ ظلم و ستم اور مصائب کے پہاڑ اخوان پر توڑے جا رہے ہیں لیکن عالم اسلام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کانوں میں انگلیاں ٹھسی ہوئی ہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کہیں سے کوئی صدائے احتجاج نہیں اٹھتی۔

افغانستان کی صورتِ حال پر غور کیجیے۔ پونے دو کروڑ مسلمانوں کا یہ ملک تقریباً ایک سال سے سرخ سامراج کی جارحیت اور بربریت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ عالمی ضمیر کا یہ حال ہے کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ احتجاج کا عمل صرف زبانی جمع خرچ تک ہے' وہ بھی اپنی مصلحتوں کے مطابق! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی رائے ذہناً افغانستان پر روسی ناجائز قبضے کو قبول کر چکی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ افغان مہاجرین کے لیے مختلف امدادی سامان یہ ملک بھیج رہے ہیں۔ یہ امدادی سامان افغانستان کی آزادی کو سلب کرنے کی تلافی تو نہیں کرتا۔ اندازہ کیجیے کہ پونے دو کروڑ مسلمان کیسے انجامِ بد سے دوچار ہونے والے ہیں! ترکستان میں روسی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں کی ایسی برین واشنگ ہوئی ہے کہ وہاں مسلم اکثریت کو اپنے مسلمان ہونے کا شعور تک باقی نہیں رہا۔ یہی حال افغانستان کا

بھی ہونے والا ہے۔ بھارت کے تیور سب کے سامنے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کے لیے روسی سامراج سے گلف کو محفوظ رکھنا آسان نہیں۔ امریکہ کا حال یہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ بھارت کے جرنوں میں رکھ چکا ہے۔ پاکستان کے ساتھ مفاہمت کا وہ کوئی معاملہ کرنے کو تیار نہیں۔ وہ بھارت کو راضی رکھنے کے لیے آخری قیمت دینے کے لیے بھی ذہناً آمادہ نظر آتا ہے۔ صدر صاحب وہاں کہہ آئے ہیں اور بالکل ٹھیک کہہ آئے ہیں کہ سارے جتن کر لیجیے پھر بھی بھارت آپ کا نہیں ہوگا۔ تاہم امریکہ کی حکومت اور رائے عامہ کی سوچ میں کسی تبدیلی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ پھر امریکہ کسی طرح اسرائیل کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ پاکستان سے مضبوط تعلقات اسرائیل کی ناراضگی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ بیت المقدس تاحال یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ وہ اس شہر کو اپنا مستقل دارالحکومت بنانے کے لیے برابر اقدامات کر رہا ہے۔ عالمی رائے عامہ بھی خاموش ہے۔ کسی مؤثر اقدام کے دُور دُور آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے عزائم کے پیچھے امریکہ کی تائید ہے' ورنہ اس کی یہ ہمت نہیں کہ وہ امریکہ کو ناراض کر کے اتنا بڑا اقدام کر سکے۔ ہم مسلمان بھی سو رہے ہیں۔ دوسروں کا کیا گلہ!

رجوع اِلی اللہ کی ضرورت

عالم اسلام پر یہ کچھ بیت رہا ہے لیکن انصاف کے ساتھ اپنے ملک کا اور خود اپنا جائزہ لیجیے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر ایمان داری کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ ان حالات کا کتنا اثر اور درد ہمارے دل میں اور قوم کے دل میں موجود ہے۔ کیا ہم نے اپنے شب و روز کے مشغلوں کو ترک کیا ہے؟ کیا ہم واقعی اللہ کی طرف رجوع ہوئے ہیں؟ مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں شادمانی کی تقاریب بھی جاری ہیں اور لہو و لعب بھی۔ کانفرنسیں ہیں' تقاریر ہیں' اعلانات ہیں' بیانات ہیں لیکن ٹھوس عملی قدم کے لحاظ سے کوئی پیش رفت نہیں۔ جسے دیکھو اس کے نزدیک اسلام اور غلبہ اسلام کی باتیں table talk and lip service سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں' اِلّا ماشاءاللہ۔ مَیں آپ کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ صورتِ حال اُخروی لحاظ سے تو ہے ہی نہایت

ہی خسارے والے انجامِ بد سے دوچار ہونے والی' دُنیوی لحاظ سے بھی انتہائی تشویش ناک ہے۔ اب بھی اسلام ہمیں نعروں اور بلند بانگ دعوؤں میں ہی نظر آتا ہے۔ اگر اصلاح کے کچھ سطحی سے کام اسلام کے نام پر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں تو ان میں نیم دلی کی کیفیت جھلکتی ہے۔ ایک مضبوط و مؤثر منصوبہ بندی کے تحت اسلام کی طرف پیش رفت کم از کم مجھے تو نظر نہیں آتی۔ ماضی قریب میں بھی ہم نے اسلام کا نام اور نظامِ مصطفیٰؐ کا نام بہت زور شور سے لیا ہے۔ ملک بھر میں بڑا جوش و خروش رہا ہے۔ بڑے نعرے لگائے گئے ہیں۔ چونکہ اسلام کی حقیقت دلوں میں جاگزیں نہیں تھی اس لیے نظامِ مصطفیٰؐ کے لیے جلسے اور جلوس کا اہتمام کرنے والوں کا یہ حال چشمِ فلک نے دیکھا ہے کہ عصر اور مغرب کی نمازیں چلی گئیں اور کسی کو احساس تک نہیں ہوا کہ دینی لحاظ سے ان سے کتنی عظیم غلطی ہو رہی ہے۔ یہ جلسے' جلوس دینی لحاظ سے نماز کے مقابل نفع کا سودا تھا یا خسارے کا! کم و بیش یہی حال آج نظر آ رہا ہے۔ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کا جائزہ لیجیے چونکہ اس نماز کی ادائیگی جماعت کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی شہر' کسی بستی اور کسی قصبے میں چلے جائیے اور دیکھیے کہ ہماری قوم کی کتنی فیصد آبادی اس فرض کی ادائیگی کا اہتمام کرتی ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

مسلم دنیا کا جو نقشہ مَیں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے' کیا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پندرھویں صدی کا آغاز مسلمانوں اور اسلام کے لیے شادمانی کا پیغام لے کر آیا ہے! مَیں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کا فرض بتانا چاہتا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ پاکستان میں بسنے والی اُمتِ مسلمہ خوابِ خرگوش سے جاگے۔ ہمارا ہر سوچنے سمجھنے والا شخص اپنی ذمہ داری اور اپنے فرض کو پہچانے اور ان کی ادائیگی کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ رحمتِ خداوندی کا دامن ہر آن کشادہ ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم اس سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس کا تو وعدہ ہے کہ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ⑦﴾ (محمد) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا۔'' اس

آیت کے ضمن میں تمام مفسرین کے نزدیک اللہ کی مدد کرنے سے مراد اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد' اس کے کلمے کی سربلندی کی سعی اور حق کو قائم کرنے کی تگ و دو ہے۔ ؎

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

اللہ تعالیٰ بڑا ودود' رؤف اور رحیم ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ تم صدقِ دل اور عزمِ مصمم کے ساتھ اپنی روش درست کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ تم کو اپنی رحمت کے دامن میں پناہ دے گا۔ ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ﴾ (بنی اسرائیل:۸)۔ ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

دراصل دُنیا کی محبت' ہمارا مال و منال' ہمارا عیش و آرام' ہمارے کاروبار ہمارے پاؤں کی بیڑیاں اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بنی ہوئی ہیں جو ہم کو ہلنے نہیں دیتیں۔ دین کے تقاضے پورا کرنے میں مانع ہوتی ہیں۔ یہی دنیوی مفادات ہم کو راہِ حق میں قدم اٹھانے سے باز رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم ہمیں واضح طور پر خبردار اور متنبہ کرتا ہے کہ: ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾﴾ (مریم) ''زمین اور آسمان میں جو بھی ہیں' اُس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ (اللہ) محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔'' ہم میں سے ہر ایک کی اپنی موت سروں پر منڈلا رہی ہے۔ پھر دنیا کے حالات کا جو نقشہ سامنے آ رہا ہے' وہ بھی ہم کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ بندۂ مومن کو تو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی موت کو ہر وقت یاد رکھے اور اس کا طرزِ عمل ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٢﴾﴾ (آل عمران) کے مطابق ہو۔ یہ ساز و سامانِ دنیا جو دین کی راہ کا سنگ گراں ہے' اسے بالآخر ہم کو یہیں چھوڑ کر جانا ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو فرداً فرداً اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ مَیں نے جو کچھ

قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے سمجھا ہے اور حالات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میں ''الدین النصیحۃ'' کے فرمانِ نبویؐ کے مطابق عرصہ چودہ پندرہ سال سے لوگوں کو پکار رہا ہوں' اپنا فرض ادا کر رہا ہوں اور لوگوں کو ان کا فرض یاد دلا رہا ہوں۔ سب کو اعتصام وتمسک بالقرآن کی دعوت دے رہا ہوں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل کے عروج وزوال کے دو ادوار کا ذکر فرما کر ان پر رحمتِ خداوندی کی توجہ کے لیے جس صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی گئی ہے وہ یہی قرآن مجید ہے:

﴿ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝٩ ﴾ (بنی اسرائیل)

''حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ جو لوگ اس کو مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔''

معلوم ہوا کہ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی' اعمالِ صالح کی توفیق اور آخرت میں اجر کبیر کی ضمانت صرف اللہ کی یہی کتاب قرآن مجید ہے۔ سنت رسولؐ بھی اسی قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے جو ہمارے لیے واجب الاطاعت ہے' چونکہ آپؐ کی سیرت بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مجسم قرآن تھی۔ انفرادی سیرت کی اصلاح ہوگی تو اسی سے۔ پھر تجدید دین ہو' احیائے اسلام ہو' ہماری دنیوی فلاح وصلاح ہو' ہماری اُخروی نجات ہو' ان سب کا دارومدار بھی ہمارے اس رویے پر ہے جو ہم اس کتابِ عزیز کے ساتھ اختیار کریں گے۔ میں نے وہ حدیث بہت عام کی ہے جس میں عظمت قرآن کا بیان بزبان صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا ہے۔ یہ حدیث جامع ترمذی اور سنن دارمی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بڑے فتنے کی آمد سے خبردار اور اس سے بچنے کی تدبیر سے آگاہ فرمایا ہے۔ ہمارے لیے اس دور کے تمام فتن اور آنے والے تمام فتنوں سے محفوظ رہنے کا واحد نسخہ تجویز کیا گیا ہے اور اس حکیم حاذق کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے کہ جس کے موثر ہونے میں جو شک کرے اس کا نہ ایمان باللہ درست ہے' نہ ایمان بالرسالت اور نہ ایمان بالکتاب۔ اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنہ سے نکلنے کا مخرج قرآن کو قرار

دیا ہے اور پھر قرآن کی عظمت بیان فرمائی ہے۔ پوری حدیث اور اس کا ترجمہ سن لیجیے:

عَنْ عَلِیٍّ ﷺ قَالَ : اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ : ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ)) قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ قَالَ : ((کِتَابُ اللّٰہِ' فِیْہِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ' ھُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْھَزْلِ' مَنْ تَرَکَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللّٰہُ ' وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ' وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ ' وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ ' وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ' ھُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِہِ الْاَھْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِہِ الْاَلْسِنَۃُ وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ ' ھُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَہِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْہُ حَتّٰی قَالُوْا : ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ط﴾ مَنْ قَالَ بِہٖ صَدَقَ' وَمَنْ عَمِلَ بِہٖ اُجِرَ' وَمَنْ حَکَمَ بِہٖ عَدَلَ' وَمَنْ دَعَا اِلَیْہِ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ))... (رواہ الترمذی والدارمی)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا' آپؐ نے ایک دن فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ' ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے!'' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں (یعنی اعمال و اخلاق کے جو دُنیوی و اُخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں' قرآن مجید میں ان سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے)! اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں' قرآن میں اُن کا حکم اور فیصلہ موجود ہے۔ (حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں) وہ قولِ فیصل ہے۔ وہ فضول بات اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا (یعنی غرور و سرکشی کی راہ سے قرآن سے مُنہ موڑے گا) اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا' اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی (یعنی وہ ہدایتِ حق سے محروم رہے گا)! قرآن ہی حبل اللہ المتین (یعنی اللہ سے

تعلق کا مضبوط وسیلہ) ہے! اور محکم نصیحت نامہ ہے' اور وہی صراط مستقیم ہے' وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں' اور زبانیں اس کو گڑ بڑ نہیں کر سکتیں (یعنی جس طرح اگلی کتابوں میں زبانوں کی راہ سے تحریف داخل ہوگئی اور محرفین نے کچھ کا کچھ پڑھ کے اس کو محرف کر دیا اس طرح قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے تا قیامت اس کے محفوظ رہنے کا انتظام فرما دیا ہے)! اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے (یعنی قرآن میں تدبر کا عمل اور اس کے حقائق و معارف کی تلاش کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ قرآن کا علم حاصل کرنے والے محسوس کریں کہ ہم نے علم قرآن پر پورا عبور حاصل کر لیا اور اب ہمارے حاصل کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا' بلکہ قرآن کے طالبین علم کا حال ہمیشہ یہ رہے گا کہ وہ علمِ قرآن میں جتنے آگے بڑھتے رہیں گے اتنی ہی ان کی طلب ترقی کرتی رہے گی اور ان کا احساس یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے)۔ اور وہ (قرآن) کثرتِ مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا (یعنی جس طرح دنیا کی دوسری کتابوں کا حال ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد اُن کے پڑھنے میں آدمی کو لطف نہیں آتا' قرآن مجید کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ جتنا پڑھا جائے گا اور جتنا اس میں تفکر و تدبر کیا جائے گا اتنا ہی اس کے لطف و لذت میں اضافہ ہوگا)! اور اس کے عجائب (یعنی اس کے دقیق و لطیف حقائق و معارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن کی یہ شان ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اُٹھے: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ○ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ (الجن) ''ہم نے قرآن سنا جو عجیب ہے' رہنمائی کرتا ہے بھلائی کی' پس ہم اس پر ایمان لے آئے''۔ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی' اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا' اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا' اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی!''

ابھی جو روایت آپ نے سنی اس میں تو حضرت علیؓ کے سوال کے جواب میں نبی اکرم ﷺ نے فتنے سے محفوظ رہنے اور اس سے نکلنے کا مخرج (exit) قرآن حکیم کو بتایا ہے۔ میں آپ کو ایک دوسری حدیث بھی سنانا چاہتا ہوں جسے آپ میری آج کی تقریر کا اصل تحفہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جاءنی جبریل فقال یا محمد اُمَّتَکَ بَعْدَکَ! ''میرے پاس جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا کہ: اے محمدؐ اپنی امت کے بارے میں سوچیے کہ آپؐ کے بعد اس کا کیا بنے گا! اس پر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جبریلؑ ہی سے دریافت کیا: اَیْنَ الْمَخْرَجُ یَاجبرئیل! ''اے جبریل! تم ہی بتاؤ کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟'' جواباً حضرت جبریلؑ نے کہا: اللہ کی کتاب! اس میں آپؐ سے پہلے کے حالات بھی ہیں اور آپؐ کے بعد کی خبریں بھی ہیں اور کل معاملات و مسائل کا حل بھی ہے! اوکما قال ﷺ!! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں روایات کے مضامین میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

پہلی روایت میں نبی اکرم ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مکالمہ بیان ہوا ہے اور اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا حضرت جبریلؑ سے مکالمہ بیان ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے جو بات فرمائی تھی وہ اسی وحی غیر متلو کی روشنی میں فرمائی تھی جو حضرت جبریلؑ کے توسط سے نازل ہوئی تھی۔ ان دونوں احادیث میں لفظ مخرج پر غور و تدبر کیجیے۔ جہاں بھی بڑے بڑے ہال ہیں اور جہاں لوگوں کا عظیم اجتماع ہوتا ہے وہاں باہر نکلنے کے لیے بڑے اور نمایاں حروف میں Exit لکھا ہوتا ہے تاکہ اگر ہال میں آگ لگ جائے یا کسی اور قسم کی افتاد پیش آ جائے تو لوگ اس مخرج کی طرف لپکیں اور اپنی جان بچا سکیں۔ یہ دنیا بھی ایک عظیم ہال کے مانند سمجھیے۔ اس میں شیطان ہر آن فتنے پھیلاتا ہے۔ پھر ایک عظیم فتنے سے اُمت کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کے ذریعے اپنے پیارے رسول ﷺ کو وحی فرمادی تاکہ حضور ﷺ اُمت کو تلقین و نصیحت اور خبردار فرمادیں کہ تمام فتنوں اور خاص طور سے فتنة المسيح الدجال سے مخرج کی سبیل قرآن مجید کا اعتصام و تمسک ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت جبریلؑ کی

روایت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے توسط سے اُمت کو پہنچا دی اور پھر انتہائی وضاحت کے ساتھ اُمت کو تعلیم بھی فرما دی جو حضرت علیؓ کی روایت کے ذریعے اُمت کو پہنچ گئی۔ میں جب بھی یہ حدیث پڑھتا ہوں' مجھ پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے یہ حدیث فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔ میری دعوت اسی قرآن حکیم' اسی ھدًی للناس' اسی قولِ فیصل اور تمام فتنوں سے نکلنے کے اسی مخرج کی طرف ہے جس کی تعلیم رسول کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس حدیث میں میرے لیے بھی یہ نوید جاں فزا موجود ہے کہ وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ''اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو گئی''۔ میری تمام مساعی کا مرکز و محور یہی دعوت ہے کہ اللہ کے بندو' قرآن کی طرف آؤ۔ قرآن کے دامن میں پناہ لو۔ ہمارے تمام مسائل کا حل رجوع الی القرآن ہے۔ تجدید ایمان' توبۃ النصوح اور تجدید عہد کی توفیق ملے گی تو اسی کتاب اللہ سے۔ ہمارے انفرادی سیرت و کردار میں اصلاح ہوگی تو اسی نسخۂ شفا سے' ہمارا اپنا ایمان یقین کامل کا درجہ حاصل کرے گا تو اسی نور مبین سے۔ افراد بدلیں گے تو معاشرے کے بدلنے کی امید پیدا ہوگی چونکہ معاشرہ مجموعہ ہوتا ہے افراد کا۔ افراد کا یہی کامل ایمان و ایقان جب collective conviction کی صورت اختیار کرے گا تب ہی اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو گی' ان شاء اللہ العزیز!

توقعات اور بشارتیں

پندرھویں صدی کا آغاز جن تشویش ناک حالات میں ہو رہا ہے' اس کا نقشہ بظاہر مایوس کن ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ مسلمان کے لیے مایوسی کفر ہے۔ سورۂ یوسف میں اپنے نبی حضرت یعقوب کی زبان سے کہلوایا گیا: ﴿وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔'' سورۃ الزمر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ میرے ان بندوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے: ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الزمر: ۵۳) ''اللہ کی رحمت سے

مایوس نہ ہوں۔'' دوسری بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بشارت موجود ہے کہ وہ وقت آ کر رہے گا جب پورا عالم نورِ توحید سے معمور ہو گا اور اللہ تعالیٰ ہی کا کلمہ سربلند ہو گا۔ میں نے یہ بات آپ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ پندرھویں صدی کا آغاز بظاہر احوال خوش گوار اور اُمید افزا نظر نہیں آ رہا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ یہ صدی مسلمانانِ عالم اور پوری بنی نوع انسان کے حق میں سعید و مبارک ثابت ہو گی یا اس کے برعکس' اور ''ساعة'' قیامت کتنی دُور ہے۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ دیے۔ ہمیں اپنی نجات' اپنی عاقبت' اپنی دنیوی فلاح اور اپنے ملک کی سلامتی کی فکر کرنی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت دنیا میں دین برحق کی شدید پیاس موجود ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جہاں چودھویں صدی میں اُمت مسلمہ اپنے زوال کی انتہا تک پہنچتی نظر آتی ہے' وہاں اسی صدی میں ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل بھی ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ اس کو مَیں یوں تعبیر کرتا ہوں کہ زوال وانحطاط اور تجدید واحیائے اسلام کے یہ دونوں عمل ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝١٩ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝٢٠﴾ (الرحمٰن) کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری ہیں۔ مجھے فکر ہے تو اپنی آخرت کی اور اپنے ہم وطنوں کی' خاص طور پر ان کی جو مجھ سے کسی نوع کا تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے اپنے وطن عزیز کی سلامتی اور استحکام کی فکر ہے جو اسلام کے نام پر بنا تھا اور جس کے وجود کا اسلام کے سوا کوئی جواز نہیں ہے۔ مجھے اپنے ان مسلمان بھائیوں کی فکر ہے جو ایک ارب کے قریب تعداد میں اس وقت دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ صرف نیک تمناؤں' نیک خواہشات' خوش کُن بیانات' جلسوں' جلوسوں اور نعروں سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے ہمیں خود کو بدلنا ہو گا۔ ہمیں خود بندۂ رب بننا ہو گا اور عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی دعوت کا علم بردار بننا ہو گا۔ اگر ہم خود اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سن لیجیے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ (الرعد: ۱۱) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتی۔''

قرآن حکیم نے ہر معاملہ میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ اس نے ہمیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ بس ہمیں خود کو بدلنا ہوگا۔ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلام کی برکات و حسنات کا نمونہ بنانا ہوگا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ماخوذ طریق کار کو اختیار کرنا ہوگا۔ ہم نے یہ روش اختیار کی تو اللہ کی نصرت و تائید ہماری دستگیری کرے گی لیکن اگر ہم نے اس سے پہلوتہی کی تو یاد رکھیے کہ کوئی عجب نہیں ہم راندۂ درگاہ کر دیے جائیں۔ ہمیں دھتکار دیا جائے' جیسے ماضی میں عرب (امیین) کو قیادت و سیادت کے منصب سے معزول کر کے اسلام دشمن تاتاریوں کو اسلام کی دولت سے سرفراز کر کے اسلام کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو اپنے دین کی خدمت اور اس کی سرفرازی و سربلندی کے لیے چن لے۔ یوں ہمارے حصے میں سوائے دُنیا اور آخرت کی ذلت و رسوائی اور خسران کے کچھ نہیں آئے گا۔ اَللّٰھُمَّ نَعُوْذُ بِکَ مِنْ ذٰلِکَ! اسی کی طرف ہمیں سورۂ محمد کی آخری آیت میں واضح رہنمائی ملتی ہے: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ﴿٣٨﴾﴾ ''اور اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔''

***

اسلامی قانون کی تنفیذ اور فقہی اختلاف

(علماء کنونشن، اسلام آباد، اگست ۱۹۸۰ء)

* خطاب، مسجد شہداء لاہور (۳۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء)
* ''میثاق'' جنوری/فروری ۱۹۸۱ء

پورے پاکستان میں ریڈیو اور ٹی وی کی وساطت سے ۲۱ اگست کی شب کو اور اخبارات کے ذریعے ۲۲ اگست کی صبح یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ مَیں نے ''علماء کنونشن'' میں شرکت اور تقریر کی ہے۔ مَیں ۲۱ اگست کی شب ہی کو اسلام آباد سے کراچی چلا گیا تھا جہاں سے اگلی شب کو امریکہ کے دوسرے دعوتی دورے پر روانہ ہو گیا۔ ملک سے باہر چلے جانے کے باعث مَیں اس ردعمل سے لاعلم رہا جو میری تقریر کے بارے میں ملک بالخصوص لاہور میں ہوا تھا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ مَیں نے اس کنونشن میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان کے متعلق بعض حلقوں میں بہت خوش گوار تاثر تھا۔ ان پر تحسین بھی ہوئی اور ان کی تائید بھی۔ البتہ ایک حلقے میں میری تقریر کے بعض حصوں کو بہت غلط رنگ دے کر اس پر بھونڈی تنقید کی گئی اور بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔ چنانچہ مَیں نے مناسب سمجھا کہ اپنی شرکت کے متعلق بعض کوائف اور اپنی تقریر کے کچھ اہم نکات اس نشست میں پیش کروں تاکہ غلط فہمیوں کو پھیلنے کی راہ کچھ مسدود ہو سکے۔

جب مجھے اس علماء کنونشن میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو مجھے حیرت ہوئی تھی چونکہ حقیقت یہ ہے کہ میرا کسی اعتبار سے بھی علماء میں شمار نہیں ہوتا۔ اس سے قبل اس قسم کے کسی اجتماع میں مجھے شرکت کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ میرا پہلا احساس یہ تھا کہ شاید غلطی سے دعوت نامہ میرے نام جاری ہو گیا ہے۔ پھر چونکہ اس دعوت نامے کی موصولی سے بہت

عرصے قبل ۲۲ اگست کی شب کو امریکہ کے لیے میری روانگی طے ہو چکی تھی' لہٰذا اس کنونشن میں میری شرکت ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ مَیں نے معذرت کر دی۔ اعلیٰ حلقوں سے فون پر اصرار ہوا کہ اگر کنونشن میں شرکت ممکن نہیں ہے تو اس مجلس مشاورت میں شرکت کرو جو کنونشن سے دو روز قبل اسلام آباد میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس مجلس مشاورت میں چار حضرات بلائے گئے تھے' جن میں میرا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اس میں شرکت پر بھی تردد تھا چونکہ مَیں اس سے قبل کسی ایسی مجلس میں شریک نہیں ہوا تھا جو حکومت کی سطح پر منعقد ہوئی ہو۔ البتہ جب اصرار بڑھا تو میرے لیے کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ لہٰذا مَیں نے شرکت کی حامی بھر لی اور اسلام آباد چلا گیا۔ مشاورت میں محترم صدر مملکت بنفس نفیس شریک ہوئے۔ ۱۷' ۱۸ اگست کو متعدد نشستوں میں نہایت بے تکلفانہ ماحول میں مختلف مسائل پر کھلے دل اور صاف ذہن کے ساتھ بہت مفید گفتگو ہوئی۔ شرکاء میں سے ہر ایک نے پورے اخلاص' دردمندی اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر حالات کے متعلق اپنے تجربات' مشاہدات' تاثرات' تنقیدیں اور تجزیے پیش کیے۔ سود مند اقدامات کے سلسلہ میں تجاویز اور مشورے بھی محترم صدر پاکستان کے سامنے رکھے گئے۔ صدر صاحب نے پورے غور و خوض' توجہ اور خندہ پیشانی سے ان تمام امور کو سنا۔ مشاورت کے بعد صدر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو امریکہ کب جانا ہے! مَیں نے کہا ۲۲ اگست کی شب کو کراچی سے روانگی ہونی ہے تو انہوں نے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ ایسی صورت میں آپ کو کنونشن میں ضرور شرکت کرنی ہوگی۔ آپ کو امریکہ کی فلائٹ پکڑنے کے لیے ۲۲ تاریخ کو کراچی پہنچانے کا خصوصی انتظام کر دیا جائے گا۔ اس پیشکش پر مَیں نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ کراچی جانے کا مَیں خود انتظام کر لوں گا البتہ آپ کے حکم کی تعمیل میں کنونشن میں شرکت ہو جائے گی۔ چنانچہ میں لاہور واپس آیا اور امریکہ کے سفر کے سامان کے ساتھ ۲۰ اگست کی شب کو دوبارہ اسلام آباد پہنچ گیا۔

کنونشن کے لیے تین موضوعات مقرر کیے گئے تھے اور شرکاء میں سے ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ جس موضوع پر چاہے اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ مَیں نے پہلا موضوع

''اسلامی قانون کی تنفیذ اور فقہی اختلاف'' منتخب کیا۔ چند مقتدر شخصیتوں کی طرف سے بھی مجھے اس موضوع پر بولنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اس کنونشن میں ملک کے ہر گوشے سے ہر فقہی مسلک سے تعلق رکھنے والے ڈھائی تین سو کے لگ بھگ علماء و فضلاء شریک تھے' جن میں سے بعض کا شمار اکابر میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کے سامنے ایک ایسے موضوع پر زبان کھولنا جو نہایت ہی نازک اور حساس (touchy & sensitive) ہو' بڑا کٹھن کام تھا۔ اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کچھ ہی عرصے پہلے شیعہ فرقے کی طرف سے زکوٰۃ آرڈیننس کے خلاف اسلام آباد میں ایجی ٹیشن ہوا تھا جس میں جوش و خروش ہی نہیں دھمکیاں بھی تھیں۔ پھر یہ کہ ہمارے ملک میں جب بھی اسلامی قانون کے نفاذ کا سوال اٹھتا ہے تو یہ فقہی اور گروہی اختلافات اس راستے کے سب سے بھاری پتھر ثابت ہوتے ہیں۔ مَیں نے اس موضوع پر پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی تھی' وہیں بیٹھے بیٹھے چند نکات و اشارات لکھ لیے تھے۔ اللہ کا فضل و کرم کہ اس کی توفیق سے مَیں اس مسئلہ پر جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا' اختصار کے ساتھ وہ بیان ہو گیا۔ مَیں نے وہاں جو اظہارِ خیال کیا تھا' اس کے بعض اہم نکات اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ان کے صحیح و غلط اور درست و نادرست ہونے کے متعلق آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

✿ ہماری یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم من حیث القوم غیر اسلامی قوانین پر تو راضی رہتے ہیں لیکن جب اسلامی قوانین کے عملی نفاذ کا مرحلہ آتا ہے تو ہمارے فقہی و گروہی اختلافات بڑی شدت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ سوال بڑی شد و مد کے ساتھ اُٹھا دیا جاتا ہے کہ کون سا فقہ رائج ہو! پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء کے آغاز میں سب سے پہلے اسلامی آئین و دستور کی تدوین اور اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ جماعت اسلامی نے اٹھایا تھا اور جلد ہی اس مطالبے کو ملک گیر سیاسی نوعیت کی تحریک کی شکل دے دی تھی۔ اس کے جواب میں اربابِ اقتدار میں سے بعض حضرات کی طرف سے سب سے بڑا عذر یہی پیش ہوا کہ: کس کا اسلام؟ کس کا فقہ؟ کون سے قوانین نافذ کیے جائیں؟ سنیوں کا اسلام یا شیعوں کا؟ پھر سنیوں میں سے بھی دیوبندیوں کا' بریلویوں کا یا اہل حدیث کا؟ اس

موضوع پر تقریریں کرنے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب اور ڈاکٹر محمود الحسن پیش پیش تھے، حالانکہ ان کی اسلام دوستی مسلم تھی۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ یہ مطالبہ قبل از وقت (premature) ہے۔ اس سوال پر کہ کس کا اسلام اور کس کا فقہ ہو، بڑے جھگڑے کھڑے ہو جائیں گے۔ بعد میں بروہی صاحب نے کہا کہ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ قرآن مجید میں کوئی دستور موجود ہے تو میں اس کو انعام دوں گا۔

یہ ردِّعمل تھا دو باتوں کا۔ پہلی یہ کہ اسلامی دستور کی تدوین اور قوانین کے نفاذ کو ایک سیاسی نعرہ بنا دیا گیا تھا۔ دوسری یہ کہ مختلف فقہی و گروہی مسالک میں کوئی مفاہمت موجود نہیں تھی اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک پڑھنے کے روادار نہیں تھے۔ بتیس سال کے دوران ہم نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ اُن حضرات کی دلیل غلط نہیں تھی اور ان کا عذر، محض عذرِ لنگ نہیں تھا بلکہ صحیح اور درست تھا کہ یہاں کس کا اسلام نافذ کیا جائے۔ پاکستان بننے کے تقریباً تیس سال بعد ''نظام مصطفیؐ'' کے نام سے جو تحریک چلی تو اس وقت بھی فقہی اختلافات میں یہی شدت موجود تھی کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہیں تھا، حتیٰ کہ جیلوں میں بھی ہر فقہی مسلک کی جماعت علیحدہ ہوتی تھی۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، ان کا اظہار اخبارات اور رسائل میں ہو چکا ہے۔ عقائد کا معاملہ بعد کی بات ہے، یہاں تو فقہی اختلافات اتنے شدید ہیں کہ ایک دوسرے کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں۔ عقائد کا تعلق قانون سے نہیں ہے کیونکہ ان کا نفاذ نہیں ہوتا۔ ان کا دائرہ محض قلب و ذہن اور فکر و نظر تک محدود ہے۔ البتہ فقہ کا تعلق قانون سے ہے اور قانون نافذ ہوتا ہے جس کے مطابق مشاجرات، مناقشات، تنازعات اور معاملات فیصل اور طے ہوتے ہیں۔ کسی ملک میں بھی دو قانون نہیں چل سکتے، وہ تو صرف ایک ہی نافذ ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو اس مخمصے سے نجات دلا دے۔

۞ پاکستان کے قیام کے وقت ایک جوش و خروش تھا اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے سازگار فضا موجود تھی۔ لوگوں کے دلوں میں گداز اور نرمی تھی۔ جو لوگ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر لٹے پٹے اور تباہ و برباد حالت میں پاکستان پہنچے تھے، ان کو جان و مال اور اپنی

خواتین کی عصمت وعفت کی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کے انسانیت سوز مظالم اور بربریت سے سابقہ پیش آیا تھا۔ ان تمام باتوں نے مل کر ان کے دلوں میں اسلامی نظام پرکار بند ہونے کا ایک شدید داعیہ بیدار کر دیا تھا۔ پھر پاکستان میں بسنے والوں نے جب ان تباہ حال بھائیوں کی پذیرائی کی' ان کی حالتِ زار کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور ان کے مصائب کی داستانیں سنیں تو ان کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ان کے دل شق تھے اور ان میں بھی یہ داعیہ ابھر چکا تھا کہ اب وہ اسلام کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں گے۔ اس وقت پوری فضا اور پورے ماحول میں اس نعرے کی گونج تھی کہ ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ۔'' لیکن ہوا کیا؟ واحسرتا کہ قومی قیادت نے یہ سنہری موقع ضائع کر دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت خود اپنے طور پر اسلامی دستور کی تدوین اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے پیش قدمی کرتی۔ فوری طور پر پاکستان کے جید علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیتی کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور فقہی اختلافات کا کوئی ایسا حل تلاش کریں جو تمام مسالک کے پیروؤں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ لیکن جو کچھ ہوا' وہ ہمارے سامنے ہے۔ مَیں کسی فردِ واحد کو الزام نہیں دیتا چونکہ قیادت ایک ٹیم کا نام ہوتا ہے۔ مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے اور آگے کروں گا' اس سے محض امرِ واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔

ایک طرف تو غلطی یہ ہوئی کہ گفت وشنید اور نصیحت وموعظت سے اربابِ اختیار کو اسلامی دستور کی تدوین اور اسلامی قوانین کی تنفیذ کی دعوت دینے اور اپنا تعاون پیش کرنے کی بجائے اس کو ایک سیاسی نعرے کی صورت میں بطور تحریک اٹھا دیا گیا۔ اس وقت کی قیادت پر تند وتیز تنقیدوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قیادت کی تبدیلی کا مطالبہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ مسلم لیگ کی صفوں میں اتحاد قائم نہ رہا۔ ایک مسلم لیگ میں سے کئی مسلم لیگیں وجود میں آگئیں اور ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو گئیں۔ نتیجتاً صرف قراردادِ مقاصد منظور کرنے کے علاوہ ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین کے میدان میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ سیاسی لیڈروں کی باہمی کشمکش اور آئے دن اسمبلی کے ممبران کے پارٹیاں بدلنے کی وجہ سے

وزارتِ عظمیٰ میں جلد جلد تبدیلیاں ہونے لگیں۔ ایک طرف یہ مرکزی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کا باعث ہوئیں تو دوسری طرف عوام میں سیاسی لیڈروں پر سے اعتماد متزلزل کرنے کا بھی سبب بنیں۔ اس کے نتیجے میں پہلا مارشل لاء آیا اور سیاسی عمل رک گیا۔ سارا جوش و خروش ختم ہو گیا اور ولولے سرد پڑ گئے۔

۱۹۷۷ء کی تحریک اصلاً تو ایک جابر حکمران کے خلاف شروع ہوئی تھی جس نے جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر بدترین قسم کی آمریت قائم کر رکھی تھی اور عام انتخابات میں لامحدود دھاندلیاں کی تھیں۔ اسی لیے اس تحریک میں سیکولر ذہن کے لوگ بھی شامل تھے اور بائیں بازو کے بھی۔ اس تحریک میں ہمہ گیری اُس وقت آئی جب اس میں مذہبی نعرہ ''نظامِ مصطفیٰ کا نفاذ'' شامل کیا گیا۔ اس نعرے کی وجہ سے تحریک ملک بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں کا جوش و خروش قیامِ پاکستان کی تحریک سے بھی زیادہ نظر آیا۔ پھر کوئی تشدد اس جذبے پر قابو نہ پا سکا۔ لوگوں نے جمہوریت کے نام پر جانیں قربان نہیں کیں بلکہ کلمہ کے نام پر گولیاں کھائیں اور ہر نوع کا تشدد انگیز کیا۔ اس موقع پر مَیں نے صدر پاکستان کو مخاطب ہو کر کہا کہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ نے ایک سنہری موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ جب آپ نے زمامِ اقتدار سنبھالی تھی تو قوم میں جوش و خروش اپنے عروج پر تھا۔ پوری آمادگی موجود تھی۔ اگر آپ اس وقت جرأتِ مؤمنانہ سے کام لے کر اسلامی نظام کی تنفیذ کے لیے ٹھوس اقدام کرتے تو قوم ذہناً اس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن آپ نے بھی وہی غلطی کی جو ہماری پہلی قیادت نے کی تھی۔ میں آپ کی، ملک کی اور دین کی خیر خواہی میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ اس وقت grace period پر ہیں۔ اب بھی آپ نے کوئی فیصلہ کُن اقدام نہیں کیا تو جان لیجیے کہ یہ مہلت جلد ختم ہو سکتی ہے۔ معاملہ آپ کی ذات کا نہیں بلکہ ملک کی سلامتی، بقا اور استحکام کا ہے۔ اشخاص آتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے بارعب لوگ آئے، جن کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو ہلایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء کے ایوب خان کا تصور کیجیے۔ ۱۹۶۸ء میں پہلی دفعہ جنبش ہوئی اور عید الفطر کے چاند پر جھگڑا ہوا۔ پھر اسی سال کے اواخر

میں ڈاکٹر فضل الرحمن کی کتاب کے خلاف جو مہم چلی تو اس کے بعد جنبشوں کا وہ سلسلہ چلا کہ قصر اقتدار زمین بوس ہو گیا۔ چنانچہ معاملہ اشخاص کا نہیں، قوم اور ملک کا ہوتا ہے۔

۞ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ اسلام کے سوا اس کے قیام کی کوئی اور اساس اور جواز ہے۔ اس لیے اس ملک کے قیام، بقا اور استحکام کی اصل بنیاد صرف اسلام ہی ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک مصنوعی ملک معلوم ہوتا ہے۔ بھارت کے ساتھ ہماری کوئی مستقل جغرافیائی سرحدیں نہیں ہیں۔ وہ سرحدیں موجود نہیں جو natural boundries کہلاتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی سرحد ہے بھی تو وہ افغانستان کے ساتھ ہے۔ بھارت کے ساتھ ہماری سرحدوں کا یہ حال ہے کہ اگر تار کھنچے نہ ہوں تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ پاکستان کہاں ختم ہوا اور کہاں سے بھارت شروع ہوا۔ چنانچہ پاکستان کا قیام جغرافیائی حدود کا رہین منت نہیں بلکہ اس کے قیام کی واحد اساس صرف اسلام ہے۔ لہٰذا اس کی بقا اور استحکام کا دارومدار بھی اسلام کے حقیقی و عملی نفاذ پر ہے۔ اگر اس کی طرف کوئی فیصلہ کن پیش قدمی اب بھی نہیں ہوئی تو جان لیجیے کہ اس ملک کی سلامتی مشکوک ہے۔ آدھے سے زیادہ پاکستان تو علیحدہ ہو چکا، اور حال یہ ہے کہ اس کا نام بھی بدل گیا۔ مشرقی پاکستان کے نام سے بھی ایک آزاد اور خود مختار سلطنت وجود میں آ سکتی تھی۔ آخر دنیا میں مشرقی و مغربی اور شمالی و جنوبی اضافت کے ساتھ ایک ہی نام کے ملک موجود ہیں۔ اس ملک کو جو خطرات درپیش ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ملک کی سب سے مقتدر شخصیت نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کسی طرف سے ٹینکوں کی آمد کے منتظر ہیں۔ اندرونی فضا یہ ہے جبکہ باہر سے جو خطرات ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ بھارت کے حالات پلٹا کھا رہے ہیں اور منظم طریقے پر مسلم کش فسادات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، بلا سبب نہیں ہو رہا بلکہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کارفرما ہے۔ اس سال فروری میں مجھے بھارت جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت کے اور آج کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔

خطرات اپنی جگہ موجود ہیں۔ ان حالات میں ہم پر پہلے سے بھی زیادہ ذمہ داری

عائد ہوتی ہے کہ ہم خدا اور خلق کے سامنے کیے ہوئے اس عہد کو پورا کرنے کے لیے فیصلہ کن طریقے سے پیش قدمی کریں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔''

اسلامی نظام کا نفاذ کیسے ہو؟

اگر واقعتاً جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اور ان کے رفقاء کار اس ملک میں اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ صحیح ہے کہ ان کو شدید فقہی اختلافات سے سابقہ پیش آیا ہے' جس کی وجہ سے جو چند چھوٹے چھوٹے اقدامات کیے گئے تھے وہ بھی بنیادی طور پر بے اثر ہو گئے ہیں۔ ایسے اختلافات آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ ان سے مستقل طور پر عہدہ برآ ہونے کا طریقہ کیا ہے؟

✿ عوامی قانون (public law) اور شخصی قانون (personal law) میں واضح طور پر تقسیم ہونی چاہیے۔ ایسی تقسیم دنیا کے ہر ملک میں ہوتی ہے۔ ملکی قانون (law of the land) ایک ہی ہوتا ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے' البتہ مختلف گروہوں کے لیے ان کے نظریات کے مطابق شخصی قانون میں گنجائش رکھی جانی چاہیے۔ پرسنل لاء میں دو امور خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں: ایک ''عبادات'' اور دوسرے ''مناکحات''۔ نماز کوئی ہاتھ باندھ کر پڑھے یا ہاتھ چھوڑ کر' کوئی رفع یدین کرے یا نہ کرے' کسی کے نزدیک غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کرنا ضروری ہے اور کسی کے نزدیک غروب آفتاب کے چند منٹ بعد۔ ایسے تمام تعبدی امور پر کسی کی طرف سے کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ کوئی ملکی قانون نہیں بن سکتا کہ تعبدی امور اس طور پر انجام دینے ہوں گے۔ عبادات میں پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اس معاملہ میں انسان بڑا احساس ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایسا قانون بنا دیا جائے کہ تمام مسلمان غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روزہ لازماً افطار کریں تو جس شیعہ کے نزدیک افطار کا صحیح وقت غروب کے چھ سات منٹ بعد ہے' اس کا روزہ غلط وقت پر کھلوا دینے سے اس کی تو سترہ اٹھارہ گھنٹے کی محنت بلکہ عبادت ضائع اور برباد ہو گئی۔ اسی بات کو سُنیوں پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جن کے نزدیک غروب آفتاب کے بعد افطار میں تاخیر سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے تمام امور میں پرسنل لاء کے

مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اسی طریقے سے ''مناکحات'' یعنی نکاح وطلاق کے معاملات میں سب کو acknowledge کرنا چاہیے اور کھلی چھوٹ دی جانی چاہیے کہ وہ اپنے اپنے مسالک کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ ان پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ملکی قانون قرآن وسنت کے وسیع تر اصولوں پر مبنی ہو جس میں اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' التزامِ صوم اور احترامِ رمضان ہر مسلمان پر فرض اور لازم ہو۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ (الحج:۴۱) اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (البقرۃ:۱۸۳) اور ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ہر تارکِ صلوٰۃ' ہر مانع زکوٰۃ' ہر تارکِ صوم ملکی قانون میں قابل تعزیر ہو۔ اسی طرح سود' شراب' قمار بازی اور دوسرے فواحش ملکی قانون کے مطابق حرام ہوں گے۔ کسی کے لیے اس میں کوئی رعایت نہ ہو گی۔ یہ چند باتیں بطور مثال عرض کی گئی ہیں۔ اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملکی قانون کن وسیع تر اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے۔

✿ پرسنل لاء کی نگرانی کے لیے ہر مسلک کے علماء کے علیحدہ علیحدہ بورڈ بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہر مسلک کی مساجد اور اوقاف ان بورڈز کے زیر نگرانی دیے جانے چاہئیں۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ سُنّی' دیوبندی یا بریلوی یا اہل حدیث اور کوئی شیعہ اگر جائیداد وقف کرتا ہے یا ٹرسٹ قائم کرتا ہے تو اس کی آمدنی اس کے مسلک کے مطابق ہی صَرف ہونی چاہیے تاکہ واقف کی منشا پوری ہو۔ یہ تو ناانصافی ہو گی کہ ایک خاص مسلک رکھنے والے واقف کی وقف شدہ آمدنی دوسرے مسلک کے سلسلے میں خرچ ہو۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص مسجد بناتا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے یہی ہوتا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنی جیب خاص سے مسجد بناتا تھا اور وہی متولی ہوتا تھا۔ یہ چندے جمع کر کے مسجد بنانا تو دورِ حاضر کی بدعت ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ بہت کثیر تعداد ہمارے ان ائمہ وفقہا کی ہے جنہوں نے صدقات' زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں کی رقوم سے بھی تعمیر مساجد کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بہر حال مسجد جس مسلک کے شخص یا اشخاص نے بنائی ہے اور اس کے لیے کوئی جائیداد بھی وقف کی ہے تو انصاف کا

تقاضا یہ ہے کہ اس مسجد کا انتظام وانصرام مسجد بنانے والوں کے مسلک کے مطابق چلایا جانا چاہیے۔ یہ ظلم ہے' زیادتی ہے کہ مسجد بنائیں کسی مسلک والے اور اس پر قابض ہو جائیں دوسرے مسلک والے۔ اسی سے تفرقے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ غلط طریقہ بند ہونا چاہیے۔ میری بھی یہ دلی آرزو ہے کہ فقہی اختلافات ختم ہوں۔ آئیڈیل صورت یہی ہونی چاہیے' لیکن امر واقعہ سے آنکھیں بند کرنا عقل مندی نہیں۔ میں ہزار چاہوں' لاکھ سر پٹک لوں اور مجھے دس زندگیاں مل جائیں تو بھی یہ ختم ہونے والے نہیں۔ ان کی بڑی طویل تاریخ ہے۔ ان کا ختم کرنا ممکن نہیں' ان کو تسلیم کرنا ہوگا۔ البتہ تعلیم و تفہیم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کو حدِ اعتدال میں رکھنے کی سعی بلیغ ہوتی رہنی ضروری ہے۔ ہمارے علماء و مشائخ کو بھی چاہیے کہ قسط اور عدل کو پیشِ نظر رکھیں اور رواداری اختیار کریں۔ ہر مسجد میں ہر مسلک کے نمازی کو نماز ادا کرنے کی آزادی ہونی چاہیے البتہ انتظام و نظم (امامت و خطابت) جس مسلک کی مسجد ہو اسی مسلک والوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

۞ اب جب بھی اس ملک میں باقاعدہ مردم شماری ہو تو لوگوں سے ان کا فرقہ اور مسلک ساتھ ہی لکھوا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں' بلکہ یہ مفید ہوگا۔ دین کے بطور مسلمان یا اسلام لکھوائیں اور مسلک کے طور پر شیعہ' سُنی لکھوا لیا جائے۔ پھر سنیوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے لیے بھی اندراج کا ایک خانہ رکھا جا سکتا ہے۔ یہ معین ہو جائے کہ ہمارے ہاں جو دو بڑے فرقے شیعہ اور سُنی ہیں' ان کا آبادی میں تناسب دراصل ہے کیا! یہ طے ہو جائے کہ کون کتنے فیصد ہے تاکہ حکومت کے محکموں میں ملازمت' علماء کے بورڈ کی تشکیل' مالی گرانٹ اور دوسری مراعات میں اسے پیشِ نظر رکھا جا سکے۔ کسی کے لیے وجہ شکایت نہ ہو۔ ہر فرقے اور مسلک کے مدارس' ان کی مساجد' ان کے معاملات' ان کا انتظام وانصرام ان کے علماء کے بورڈ بنا کر ان کے حوالے کر دیجیے۔ یہ بورڈ حکومت کی زیرِ سرپرستی اور زیرِ نگرانی تفویض کردہ ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس طرح بہت سے اختلافات اور شکر رنجیاں ختم ہو جائیں گی اور روز روز کے یہ قضیے' تنازعات اور اختلافات حکومت کے لیے دردِ سر نہیں بنیں گے۔ نیز غیر مسلم اقلیتوں کا تناسب بھی صحیح طور پر آ جائے گا۔ قادیانی

(لاہوری گروہ سمیت) اسی زمرے میں شمار ہوں گے۔

ملکی قانون کے بارے میں یہ اصول اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی اساس کسی فقہ پر نہیں ہوگی بلکہ اس کی اساساتِ اصلیہ صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہیں۔ اہل سنت کی تمام فقہیں ہماری اپنی ہیں۔ سب قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ فرق راجح اور مرجوح کا' افضل و مفضول کا یا تعبیر و رائے اور قیاس کا ہے۔ کوئی مخصوص فقہ یہاں نافذ نہیں کی جاسکتی چاہے وہ فقہ حنفی ہو' فقہ مالکی ہو' فقہ شافعی ہو' فقہ حنبلی ہو یا مسلک اہل حدیث ہو۔ اصل اور بنیاد ہمارے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے۔ یہی آخری حجت ہے۔ تمام معاملات کے لیے ان اساساتِ اصلیہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو بات بھی اس کے مطابق ہوگی یا اس سے استنباط میں اقرب ہوگی اور جسے قانون ساز ادارہ یا عدالت عالیہ میں دلائل سے منوالیا جائے گا' اُسی کو ملکی قانون کا مقام حاصل ہوگا۔ خلق قرآن کے مسئلے میں امام احمد بن حنبلؒ نے جو بات کہی تھی تو یہی کہ اِئْتُوْنِیْ بِشَیْءٍ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ حَتّٰی اَقُول ''لاؤ میرے پاس کوئی چیز اللہ کی کتاب یا اس کے رسولؐ کی سنت سے تب میں کوئی بات کہہ سکوں گا''۔ ہمارے ہر دستور میں بھی ہمیشہ سے یہ بات لکھی جاتی رہی ہے اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی موجود ہے کہ

No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah

''ایسی کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔''

فی الحال یہ دفعہ رہنما اصول میں درج ہے' اس کو فی الفور operative clause میں شامل ہونا چاہیے۔ اس دفعہ میں کسی فقہ اور کسی مسلک کا تعین نہیں ہے۔ اس میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دین نام ہے قرآن و سنت کی پابندی کا' لہٰذا ملک کا قانون ان ہی دو بنیادوں پر تشکیل پائے گا اور نافذ ہوگا۔ ہمارے کلمہ شہادت کے دو اجزاء ہیں۔ پہلا توحید کا اقرار: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور دوسرا رسالت محمدیؐ کا اقرار: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس میں کسی فقہ کا اقرار شامل نہیں۔ ملکی قانون کے دو شعبے ہیں: ایک فوجداری یعنی تعزیرات اور حدود کا قانون' دوسرا دیوانی یعنی تجارت' لین دین اور اسی نوع کے دیگر معاملات کا قانون۔ یہ شعبے

سے متعلق ہیں اور یہ ہر پاکستانی کے لیے یکساں مؤثر ہوں گے۔ Law of the Land سب پر ان کا اطلاق ہوگا' چاہے وہ کسی بھی فرقے یا کسی فقہی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ پاکستان میں بسنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے لیے بھی اور ان غیر ملکیوں پر بھی نافذ ہوں گے جو پاکستان میں ان قوانین کے تحت کسی جرم کے مرتکب ہوں گے۔ کوئی چور یہ کہے کہ ٹھیک ہے مجھ پر چوری کا جرم ثابت ہوگیا لیکن میں چونکہ فلاں فرقے یا فلاں فقہی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں اور اس میں چور کے لیے قطع ید نہیں بلکہ انگلی کاٹنے کی سزا ہے لہٰذا ہاتھ کے بجائے میری انگلی کاٹی جائے' یہ ممکن نہیں۔ تعزیر کسی فرقے یا فقہی مسلک کے مطابق عائد نہیں ہوگی بلکہ کتاب وسنت پر مبنی اور اس سے ماخوذ جو بھی قانون ملک میں رائج ہوگا وہ سب پر لاگو ہو گا۔ یہی صورت حال سول لاء میں اختیار کی جائے گی اور تمام معاملات ملکی قانون کے مطابق فیصل ہوں گے۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ یہ معاملہ ہماری فقہ کے مطابق طے ہو۔

۞ عدالتوں کو اختیار دیا جائے کہ فی الوقت جاری قوانین میں سے ان قوانین کو منسوخ کر دے جن کے متعلق بھی یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح جو نیا قانون بنے وہ چاہے کسی مجاز قانون ساز ادارے نے بنایا ہو یا کسی مجاز حاکم نے بطورِ فرمان (ordinance) نافذ کیا ہو' عدالتوں میں اس قانون کو بھی اس بنیاد پر چیلنج کرنے کا حق ہونا چاہیے کہ یہ قانون کتاب وسنت کے منافی ہے یا اس میں خامی ہے۔ علماء وفضلا کو حق حاصل ہو کہ وہ اس کو ثابت کریں۔ وہ استشہاد اور نظائر کے طور پر مستند ائمہ وفقہا کی آراء' قیاسات' تعبیرات اور استنباط پیش کرنے کے مجاز ہوں۔ عدالتوں کو اس بات میں فیصلوں کا اختیار ہو۔ اس طرح عدالتوں میں ہر فقہ کے لیے یہ موقع فراہم ہو جائے گا کہ اس کا جو فتویٰ اقرب الی القرآن والسنة ہو' وہی ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو سکے گا۔ ایسے معاملات کے فیصل کی مجاز کون سی عدالتیں ہوں؟ ان کے لیے شرعی بنچ قائم ہوں یا یہ کام ہائی کورٹس کے سپرد کیا جائے؟ یہ انتظامی معاملہ ہے' جسے مشاورت اور افہام و تفہیم سے طے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ سپریم کورٹ کو سب سے برتر عدالت (عدالت عظمیٰ) قرار دے کر آخری' قطعی اور حتمی فیصلہ کرنے کا حق اس کو تفویض ہونا چاہیے۔

۞ عموماً یہ ہوتا چلا آرہا ہے کہ جو لوگ برسرِاقتدار آئے انہوں نے اس ذمہ داری کو محسوس ہی نہیں کیا جو دین کی طرف سے ان پر عائد ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کو سب سے زیادہ فکر یہی لاحق رہی کہ کرسی کا تحفظ کس طرح کیا جائے اور اپنے اقتدار کو کس طور پر قائم اور جاری رکھا جائے۔ وہ کچھ اِدھر کے' کچھ اُدھر کے علماء کی تائید اور تعاون حاصل کرتے رہے۔ سب لوگوں کو خوش کرنے اور راضی رکھنے کی پالیسی اختیار کرتے رہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو اقتدار سنبھالنے کا موقع دیتا ہے جو دل سے اسلام کا دلدادہ ہے اور اسے حقیقی طور پر ایک نظام زندگی کی حیثیت سے نافذ کرنے کا خواہش مند ہے تو ضروری ہے کہ وہ صرف رضائے الٰہی کو سامنے رکھ کر یہ عزم کرے کہ مَیں اس موقع کو اپنا دینی فرض ادا کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ کسی کو کیا پسند ہے کیا نہیں' مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ مجھے فکر ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں محاسبے اور جواب دہی کی۔ مجھے تو ہر حال میں اس سلطنت خداداد میں اسلام نافذ کرنا ہے۔ مَیں رہوں گا تو اسلام کے ساتھ رہوں گا' ورنہ نہیں رہوں گا۔ اسلام کے نفاذ کی کوشش میں مجھے اگر اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا تو مَیں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ جس شخص میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے' وہ واقعتاً سب کچھ کر سکتا ہے۔ اگر نہ کر سکے اور اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو بھی ان شاء اللہ وہ اپنے ربّ کے سامنے سرخرو ہوگا۔

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع عطا کیا ہوا ہے۔ بھٹو صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا موقع دیا تھا کہ وہ تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بن کر اُبھر سکتے تھے۔ وہ ماؤزے تنگ سے بھی بڑی شخصیت کی حیثیت سے تاریخ میں زندۂ جاوید مقام حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہو سکے۔ He could not prove equal to the task۔ گو بہت سا وقت لیت و لعل میں گزر چکا ہے لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اب بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ جرأت مندانہ قدم اٹھائیں اور اسلام کے نفاذ کے لیے مثبت اقدامات کریں۔ کام اگر ہوگا تو عزمِ صمیم سے ہوگا۔ نیم دلانہ انداز سے یہ کام نہیں ہوگا۔ نہ اس طور پر ہوگا کہ قدم اٹھایا اور پھر اس اندیشے سے واپس لے لیا یا تعویق میں ڈال دیا کہ

کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ یہ اندازِ انجام کار کے لحاظ سے انتہائی غلط ہے۔ مجھے نہ اپنی فکر ہے نہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی۔ مجھے فکر ہے تو اس ملک کی۔ ؎

اے آندھیو! سنبھل کے چلو اس دیار میں
اُمید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

یہ وہ ملک ہے جو بڑی اُمیدوں کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اس کے لیے ہم نے بڑے اونچے نعرے لگائے تھے' بلند بانگ دعوے کیے تھے۔ ہماری قوم نے ناقابلِ فراموش قربانیاں دی تھیں۔ ہم اس ملک کو دورِ جدید اور زمانہ حاضر میں اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانے کا عزم لے کر چلے تھے۔ نوعِ انسانی کو ہدایت کا روشن مینار دکھانے کے لیے ہم کھڑے ہوئے تھے۔ ان امنگوں اور ان ارادوں کے ساتھ یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ اس کے وجود و بقا کے لیے بنیاد اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اسلام کے عملی نفاذ میں کوتاہی اور ٹال مٹول کرنے کی پاداش میں ملک دولخت ہو چکا ہے۔ یہی کوتاہیاں جاری رہیں تو خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ پردۂ غیب سے کیا کچھ ظہور میں آئے گا۔

✿ صدر صاحب نے اپنے طور پر کافی کچھ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا۔ لہٰذا جو بھی اقدامات اب تک کیے گئے ہیں' وہ کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قانون بنایا گیا تو ساتھ ہی یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ فلاں شعبے کے معاملات اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ فلاں کو اس سے استثنا حاصل ہوگا۔ کمال یہ ہے عائلی قوانین کو بھی تحفظ دیا گیا کہ ان کو کسی شریعت بنچ میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے کیا غیر شرعی معاملات اسلام کے مطابق درست کیے جا سکیں گے؟ سود کو فی الحال چھوٹ ملی ہوئی ہے' چونکہ کوئی متبادل نظام موجود ہے ہی نہیں اور معیشت کی موجودہ گاڑی اس کے بغیر چل نہیں سکتی۔ عائلی قوانین کو بھی تحفظ حاصل رہے گا۔ ہماری خواتین کا مغربی تہذیب زدہ طبقہ اس میں شریعت کے مطابق ترمیم و اصلاح کے لیے راضی نہیں' حالانکہ یہ طبقہ تناسب کے لحاظ سے نہایت قلیل ہے۔ آج ہی اخبارات میں خواتین کانفرنس کا مطالبہ

آ گیا ہے کہ عائلی قوانین کو نہ چھیڑا جائے۔ یہ جوں کے توں برقرار رہنے چاہئیں۔ ہمارے حقوق کی اسی ذریعہ سے حفاظت ہوگی!

حکومت کی طرف سے جو سپیشل شرعی بنچ تشکیل دیے گئے ہیں' ایک تو ان کا دائرۂ عمل واختیار محدود رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی رائج قانون کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھ کر ردّ کرنے کا فیصلہ کریں تو یہ ایک منفی عمل ہے۔ قانون تو ہٹا دیا گیا۔ اس خلا کو بھرے گا کون؟ خلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا! اس طرح تو بہت سی خرابیاں رونما ہوں گی۔ اس خلا کو آرڈیننس سے بھرا جا سکتا ہے! لیکن کب تک؟ سیاسی عمل رُک جانے سے ملک میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی تو مجاز ادارہ ہو جس کی طرف اس قانونی خلا کو پورا کرنے کے لیے رجوع (refer) کیا جا سکے اور جو حسب ضرورت کتاب وسنت کی روشنی میں مزید قوانین بنا سکے۔ ایک ایسے مجاز ادارے کی ضرورت ناگزیر ہے۔

صدر صاحب بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ مَیں مستقل نہیں ہوں' عارضی ہوں اور میرا کوئی پارٹی بنانے کا ارادہ نہیں ہے۔ اس بات سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے' وہ محض عارضی انتظام ہے۔ ضروری ہے کہ صدر صاحب اور ان کے رفقاء اس پر غور فرمائیں اور کوئی ایسی راہ نکالیں کہ جلد از جلد ایک ایسا مجاز ادارہ وجود میں آئے جس کو عوام کا اعتماد حاصل ہو اور جو قانون سازی کے خلا کو پُر کر سکے۔

آخری گزارش

مَیں نے وہاں جن خیالات کا اظہار کیا تھا' وہ مَیں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ مَیں نے اس وقت اپنی یادداشت سے ان کا اعادہ کیا ہے' البتہ کوشش کی گئی ہے کہ سب نکات بیان ہو جائیں۔ کنونشن میں وقفے کے دوران بعض شرکاء نے میرے خیالات کے متعلق بہت اچھے تاثرات اور تائید وپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ یہ باتیں تم ہی کہہ سکتے تھے چونکہ تم خالص غیر سیاسی آدمی ہو۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مَیں عام مفہوم میں غیر سیاسی آدمی ہوں۔ مَیں نے علیٰ وجہ البصیرت اس میدان کو

چھوڑا تھا۔ میرے لیے مواقع آئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مَیں محفوظ رہا اور اس راستے کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ میرے سامنے قرآن مجید کے مطالعے سے تجدید و احیائے دین اور اسلامی انقلاب کا جو اساسی و بنیادی نہج آیا ہے' بحمد اللہ مَیں پندرہ سال سے پوری یکسوئی کے ساتھ ہمہ تن' ہمہ وقت اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں۔ اصلاح ہو' انقلاب ہو' اس کی اصل بنیاد دعوت عبادتِ ربّ ہے۔ لوگ واقعی طور پر اللہ کے بندے بنیں۔ اپنی انفرادی زندگی پر اللہ کا دین نافذ کریں۔ ایسے لوگ جمع ہوں' ان کی تنظیم ہو جو ڈھیلی ڈھالی قسم کی کوئی ایسوسی ایشن نہ ہو بلکہ سمع و طاعت کی بنیاد پر قائم ہو۔ جو لوگ اس میں شامل ہوں وہ اپنا فارغ وقت گزارنے نہ آئیں بلکہ تن من دھن کے ساتھ آئیں اور الاقرب فالاقرب کے اصول پر عبادت ربّ' شہادت علی الناس اور فریضہ اقامت دین کی دعوت کے علم بردار بن کر کھڑے ہوں۔ لوگوں کو اللہ کی کتاب کے اعتصام و تمسک کی دعوت دیں' چونکہ یہی منبع ایمان اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ یہی کتاب نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا مرکز و محور تھی' یہی ہماری دعوت کا بھی مرکز و محور ہو۔ خود بھی سنت کے اتباع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ اور اُسوۂ کاملہ حضور ﷺ ہی کی ذات ہے۔

مَیں لوگوں کو اسی کام کی طرف بلانے میں لگا ہوا ہوں۔ میرے نزدیک ایک مسلمان کی نجاتِ اُخروی کا یہی راستہ ہے اور فلاح دُنیوی کا بھی یہی طریقہ ضامن ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر اور اس کے نفاذ کے لیے بنا تھا۔ لہٰذا پاکستان کی بقا' اس کا استحکام' اس کا مستقبل اسلام کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ جو اس حقیقت سے اختلاف کرے وہ دراصل تاریخ کی حقیقت کو جھٹلا رہا ہے اور سنت اللہ سے اعراض کر رہا ہے۔ اب اسلام کا صرف نعرہ کام نہیں دے گا۔ زبانی جمع خرچ اب تک بہت ہو چکا۔ ان سے کام بن سکتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ اگر یہ کام ہو گا تو اُسی طریق سے ہو گا جس کی رہنمائی ہم کو قرآن مجید اور اُسوۂ رسول اللہ ﷺ سے ملتی ہے۔

***

سیاست میں اسلام دوست طبقہ

* خطابِ جمعہ، مسجد دارالسلام، باغِ جناح، لاہور (۶ مارچ ۱۹۸۱ء)
* ''میثاق'' اپریل ۱۹۸۱ء

خطبہ مسنونہ اور درود و سلام کے بعد:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

دین میں سیاست کا مقام

مَیں نے خطباتِ جمعہ میں کبھی ملک کی سیاست کو موضوع نہیں بنایا۔ اس لیے نہیں کہ میرے نزدیک سیاست کوئی شجر ممنوعہ ہے یا ہمارے دین کے دائرے سے باہر کی کوئی شے ہے۔ میں اس کا قائل ہوں کہ ہمارے دین میں سیاست بھی ہے، حکومت کے معاملات بھی ہیں۔ یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا دین انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے بحث کرتا ہے چاہے وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں چاہے اجتماعی زندگی سے ------ پھر صرف بحث ہی نہیں کرتا بلکہ ان تمام گوشوں کو اپنے تحت لانا چاہتا ہے۔ مزید برآں ''سیاست'' کا لفظ بڑے ہی مقدس انداز میں حدیث شریف میں

آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كَانَتْ بَنُو اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ)) ''بنی اسرائیل کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں تھی۔'' بنی اسرائیل میں نبوت کا تسلسل قائم رہا تھا اور ان کے ہاں ایک نبی کے بعد دوسرے نبی مبعوث ہوتے رہے تھے۔ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰؑ پر ختم ہوا تھا جو بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے۔ ان کے ہاں معاملہ یہ تھا کہ اصل قیادت و سیادت اور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''سیاست'' نبیوں کے ہاتھ ہی میں رہتی تھی۔ لہٰذا وہ چیز جو انبیاء کا موضوع رہی ہو' اپنی ذات میں نجس اور حرام شے نہیں ہو سکتی۔ معاذ اللہ!

خطباتِ جمعہ میں اس موضوع سے اجتناب اور صرفِ نظر کرنے کے دو اہم سبب رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''سیاست'' کے معنی صرف انتخابات اور حکومت کے معاملات قرار پا گئے ہیں' حالانکہ سیاست ایک بڑی وسیع اصطلاح ہے۔ میرا تجزیہ اور طویل عرصے سے میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ پاکستان میں بسنے والی اُمت مسلمہ کی اصلاح کے عمل کا اصل میدان انتخابات نہیں بلکہ دعوت و اصلاح ہے اور ان دونوں کاموں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا فرق بلکہ بعض اعتبارات سے بڑا تضاد ہے۔ دعوت و اصلاح کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں اور انتخابی سیاست کے تقاضے کچھ اور' جن کا اجمالی ذکر میں ان شاء اللہ آگے کروں گا۔ دوسرا یہ کہ خطبہ جمعہ کا اصل مقصد قرآن حکیم کے ذریعے سے تذکیر ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث ہے کہ كَانَتْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَقْرَءُ الْقُرْآنَ، وَيُذَكِّرُ النَّاسَ یعنی آنحضور ﷺ خطبۂ جمعہ میں قرآن کی قراءت اور اس کے ذریعے تذکیر فرماتے تھے' یاددہانی کراتے تھے' نصیحت فرماتے تھے' تاکہ مشغولاتِ دنیوی کی وجہ سے اگر جذباتِ ایمانی پر کوئی حجاب پڑ گیا ہو' ان پر کچھ غبار آ گیا ہو' وہ کچھ سرد پڑ گئے ہوں تو ان کو از سرِ نو جلا حاصل ہو جائے' غبار دور ہو اور حرارتِ ایمانی عود کر آئے۔ اس تذکیر کا ذریعہ بفحوائے الفاظ قرآنی: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (ق) ''اے نبیؐ! بس آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو یاددہانی اور نصیحت (تذکیر) کرایئے جو میری پکڑ سے ڈرتا ہو'' خود قرآن مجید ہے۔

چنانچہ مَیں نے خطبہ جمعہ کے لیے اپنا معمول قراءت قرآن اور تذکیر بالقرآن قرار دے رکھا ہے۔ یہاں تقریر اور خطبہ علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ تقریر ہی خطبہ اوّل ہوتا ہے اور اس میں بفضلہ تعالیٰ میں نبی اکرم ﷺ کی سنت کا اتباع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یعنی قراءت قرآن اور پھر اس کے ذریعے تذکیر، نصیحت اور یاد دہانی تا کہ ہم کو اپنے مسلمان ہونے کا شعور مسلسل حاصل ہوتا رہے اور ہمارے وہ دینی فرائض واضح ہوتے رہیں جو از روئے دین ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ان ہی دو اسباب کی بنا پر اُن موضوعات پر یہاں گفتگو نہیں ہوتی جو عام طور پر مساجد میں ہمارے مقررین وخطباء کو مواد فراہم کرتے ہیں (الا ما شاء اللہ)۔ البتہ اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے، واقعتاً بعض اعتبارات سے وہ اتنے اہم ہیں کہ ان پر گفتگو کرنا نہ صرف موجودہ ملکی صورتِ حال کا تقاضا ہے بلکہ ہمارے دین کے مصالح کے اعتبار ولحاظ سے بھی ضروری ہے۔ اسی لیے مَیں نے آج اس موضوع پر گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ملک کی داخلی صورت حال

داخلی حالات میں صاف نظر آ رہا ہے کہ ہلچل شروع ہوگئی ہے۔ اس کے آثار ملک کی فضا میں واضح طور پر نظر آنے لگے ہیں، حالانکہ صورت یہ ہے کہ ہمارے پاس جو اطلاعات آتی ہیں وہ یک طرفہ ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قانوناً اور حکماً تو سینسر ہے لیکن ایک طرف سے یہ ہٹ گیا ہے اور ایک فریق کے لیڈروں کے اخبارات میں بیانات آنے شروع ہو گئے ہیں۔ البتہ ناموں کے ساتھ ان کی پارٹیوں کے ناموں کی ''کالعدم'' کے لفظ کے اضافے کے ساتھ گردان ہوتی ہے۔ ان بیانات ہی کے ذریعے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ دوسری طرف کیا ہو رہا ہے۔ ورنہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ان بیانات میں جن نو یا سات پارٹیوں کے اتحاد (alliance) کا ذکر اور مذمت ہوتی ہے، اس اتحاد کے داعی کون لوگ ہیں! کون سی پارٹیاں اس میں شامل ہیں اور اتحاد کی اصل بنیاد کیا ہے؟ اس اتحاد کی خبروں کا دوسرا ذریعہ ان ممالک غیر کی ریڈیو کی نشریات ہیں جن کا وطیرہ ہی پاکستان کے خلاف مہم چلانا ہے۔ حکومت کے ذرائع ابلاغ اور ملکی اخبارات سے اس

اتحاد کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال فی نفسہٖ درست نہیں ہے' بلکہ مضر ہے۔ اس سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے اور لوگ تذبذب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بعض مخلص صحافی یہ لکھ رہے ہیں اور صحیح لکھ رہے ہیں کہ اس طرزِ عمل سے credibility ختم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف کی خبروں میں دائیں بازو کے لیڈروں کے بیانات پر بھی اعتماد نہیں رہتا۔ بہر صورت دوسرے نقطۂ نظر کے حاملین بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر کسی درجے میں تو براہِ راست عوام کے سامنے آنے دیجیے' البتہ مناسب پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اسلام یعنی نظریۂ پاکستان کے خلاف باتوں' اشتعال انگیز بیانات' لاقانونیت اور انتشار پھیلانے والی خبروں اور پروپیگنڈے کو ضرور روکا جانا چاہیے لیکن ان کو اپنا نقطۂ نظر کسی نہ کسی مثبت انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ پھر ان کے نقطۂ نظر پر محکم استدلال سے تنقید ہو' اس کا ردّ ہو اور اس کے مضر پہلوؤں کو دلائل کے ساتھ واضح کیا جائے تو یہ عمل ہمارے عوام کے سیاسی شعور کی تربیت کا باعث ہو گا۔ بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات ہے جو برسبیل تذکرہ بیان ہو گئی۔

مجھے اصل بات یہ عرض کرنی ہے کہ فی الوقت ہمارا ملک جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس نے ہر محب وطن اور پاکستان کے ہر بہی خواہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے' اور یہ تشویش فطری ہے۔ ہمارا ایک ہوائی جہاز تخریب کاروں کے ہاتھوں اغوا ہو کر کابل پہنچ گیا ہے اور ہماری حکومت کا افغانستان کی اس انتظامیہ سے براہ راست سابقہ پیش آ گیا ہے جس کو ہم وہاں کی جائز و مجاز حکومت تسلیم نہیں کرتے اور جو روسی استبداد کے سائے اور سرپرستی میں اپنے حریت پسند اور اسلام کے شیدائی افغان بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔ اس اغوا شدہ جہاز اور یرغمالیوں کی رہائی کی کیا صورت ہوتی ہے' اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس واقعہ سے پورے ملک میں غم و غصے اور گہری تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بعض ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے طلبہ میں بھی بے چینی اور اضطراب ہے۔ کہیں کہیں تصادم بھی ہوا ہے۔ ہماری اکثر یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں۔ بعض دوسرے طبقات بھی بے اطمینانی اور خوف کی کیفیت سے دوچار ہیں۔

پھر اس ملک میں جو دائیں بازو (Rightists) کی جماعتیں کہلاتی ہیں' اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیڈروں کی آپس میں ملاقاتیں اور کچھ گفتگوئیں ہو رہی ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گفت و شنید کا یہ سلسلہ حکومت کی اجازت سے شروع ہوا ہے۔ میں اس ضمن میں کچھ مشورے پیش کرنا چاہتا ہوں' اگرچہ جانتا ہوں کہ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ پھر بھی میں نبی اکرم ﷺ کے فرمان الدین النصیحۃ کی تعمیل میں چاہوں گا کہ اپنے فہم کے مطابق ملک و ملت کی خیر خواہی میں چند مشورے پیش کر دوں۔

درد کا درماں

ایک مشورہ مَیں نے نومبر ۱۹۷۷ء میں منعقدہ سالانہ قرآن کانفرنس میں دیا تھا کہ ہمارے جو زعماء اس ملک میں دین کے نفاذ کے دل سے متمنی ہیں اور جن کو واقعی دین کا مستقبل عزیز ہے' خدا کے لیے وہ یہ طے کر لیں کہ ان کو الیکشن میں براہِ راست حصہ لینے اور حکومت کا کوئی منصب حاصل کرنے کی کوشش کرنے سے کوئی سروکار رکھنا نہیں ہوگا۔ وہ صرف نفاذِ دین کا مطالبہ اور تقاضا کریں۔ حکومت کے مناصب' اس کے عہدے اور وزارت سازی وغیرہ کے کاموں سے خود کو مستغنی کر لیں۔ ان کا یہ فیصلہ ان کے اخلاص کا ایک جیتا جاگتا ثبوت اور اس بات کا مظہر ہوگا کہ اسلامی نظام کے قیام کے مطالبے کی پشت پر ان کے ایمان کا تقاضا ہے نہ کہ حصولِ اقتدار کی تمنا و آرزو۔

ہمارے ہاں سیاست میں ایک طبقہ وہ ہے جو ''اسلام پسند'' کہلاتا ہے' گو مجھے یہ اصطلاح پسند نہیں ہے۔ اس کے لیے ''اسلام دوست'' کی اصطلاح کچھ غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال یہ گروہ فی الواقع ہمارے سیاسی افق پر موجود ہے اور اس کی خاصی بھلی تعداد ہے جو زبانی کلامی اسلام کو ماننے والی ہے۔ بڑی حد تک شعائرِ اسلامی کا احترام اس کے دلوں میں موجود ہے۔ اگر وہ اس پر پوری طرح عمل پیرا نہ بھی ہوں تب بھی اپنی قومی روایات کے درجے ہی میں سہی' اس طبقے کو اسلام سے ایک قلبی لگاؤ ہے۔ اس کے دل میں بھی صرف تمنا اور خواہش کے درجے ہی میں سہی' یہ جذبہ موجود ہے کہ اسلام کو فی الواقع اس ملک میں قوتِ نافذہ کا مقام حاصل ہو۔ اس طبقے کے فکر و عمل میں تضادات بھی موجود

ہیں، دورُخا پن بھی موجود ہے۔ بایں ہمہ ان افراد کا شمار دین دشمن عناصر میں نہیں کیا جا سکتا، یہ ''اسلام دوست'' ہی کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ملکی سیاست پر ان کا خاصا اثر بھی ہے۔ یہ طبقہ زیادہ تر ان عناصر پر مشتمل ہے جو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے ہیں، یا اسی ذہن کے حامل ہیں کہ پاکستان کے قیام کا اصل مقصد اسلامی نظام کا نفاذ ہی تھا۔

دوسرا طبقہ ان دینی و سیاسی زعماء کا ہے جو دین کے ساتھ حقیقی تعلق رکھتے ہیں اور اس کا اظہار ان کی عملی زندگی سے بھی ہوتا ہے۔ ان کے متبعین کی اکثریت اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے معاملے میں مخلص بھی ہے۔ وہ محض اپنی قومی روایات یا توارث سے ملنے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ ذہنی و قلبی وابستگی نہیں رکھتی بلکہ پورے شعور و ایقان کے ساتھ اسے ہی دنیا و آخرت کی فلاح و صلاح اور نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔

اس دوسرے طبقے کی خدمت میں نہایت دردمندی اور اخلاص کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ خدارا آپ الیکشن کی سیاست سے لاتعلق ہو کر پوری تن دہی، انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اپنی توانائیاں، صلاحیتیں، قوتیں، اپنے اوقات اور مال و منال دعوت و تبلیغ کے میدان میں صرف کریں۔ عوام الناس کے افکار و نظریات اور عقائد کی خالص اسلام اور توحید کی دعوت کے ذریعے تطہیر اور سیرت و کردار کی تعمیر کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیں تا کہ ایک طرف عوام الناس کی معتد بہ اور اثر کن تعداد فکر اور عمل دونوں اعتبارات سے حقیقی مسلمان بن جائے، دوسری طرف اس کی دینی حس اتنی بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غیر اسلامی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور حقیقی اسلام کا نفاذ ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو۔ دعوت و تبلیغ کا یہ منہاج جتنا جتنا فروغ پائے گا اُسی لحاظ سے یہاں حقیقی اسلامی نظام کے قیام اور اس کے نفاذ خاص طور پر اس کے استحکام کی بنیادیں فراہم ہوتی چلی جائیں گی۔ اس اصلاح یافتہ معاشرے کا دباؤ ان لوگوں کو جن کے ہاتھوں میں اقتدار کی زمام کار ہو گی، مجبور کر دے گا کہ وہ اس مملکت خداداد میں اسلام ہی کو نافذ کریں اور قائم رکھیں۔ اسی طرح ان شاء اللہ وہ مرحلہ بھی آسکے گا کہ بلا طلب و بلا کوشش زمام اقتدار بھی سنت اللہ

کے مطابق مومنین صالحین کے ہاتھ میں آ جائے۔ بفحوائے وعدۂ الٰہی: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (النور:۵۵) ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔''

اپنی جماعت سے یا کسی قومی اتحاد میں شامل ہو کر اس کے لیے حصول اقتدار کی جدوجہد کرنا اور الیکشن کے میدان میں اترنا ایک راستہ ہے جبکہ عوام الناس کی فکری و عملی تطہیر و تعمیر کی سعی و کوشش کو مقصود بنانا دوسرا راستہ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلا راستہ تحزب واختلاف اور افتراق وانتشار کا ہے۔ دوسرا راستہ خدا ترسی اور فرضِ منصبی کے طور پر دعوت و تبلیغ، نصح و خیر خواہی اور وفاداری کا ہے۔ پھر ان دونوں راستوں کے تقاضے متصادم اور متضاد ہوتے ہیں۔ پہلے راستے پر گامزن ہونے والے دوسرے راستے کے کام اوّل تو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے اور اگر وہ یہ کرتے بھی ہیں تو وہ کام حصولِ اقتدار کی کوشش کا ضمیمہ بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کے صحیح و موثر نتائج مرتب نہیں ہوتے۔ میرے نزدیک دوسرا راستہ ہی وہ راستہ ہے جو ایک طرف توشۂ آخرت ثابت ہوگا' رضائے الٰہی کے حصول کا باعث ہوگا اور دوسری طرف اپنی سیاسی کوششوں کے نتیجے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے خالص انعام کے طور پر تمکن فی الارض پر بھی منتج ہو سکے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد صحیح مسلم میں موجود ہے کہ:

اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)): قُلْنَا لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: ((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ))

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین تو بس وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس کی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی' اس کی کتاب کی' اس کے رسولؐ کی اور مسلمانوں کے رہنماؤں کی اور عوام..... سب کی!''

چنانچہ جو لوگ خلوص و اخلاص کے ساتھ دین سے commitment رکھتے ہیں اور

اس کے لیے واقعتاً کچھ کرنا چاہتے ہیں' ان کے لیے لازم ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے اس قولِ مبارک کو سامنے رکھ کر اپنا لائحہ عمل مرتب کریں۔ ان کی انفرادی زندگی اسلام کا نمونہ ہو' ان کا عمل یہ شہادت دے کہ وہ واقعی اللہ کے بندے ہیں۔ وہ اپنی جدوجہد کا ہدف دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ اعمال کو بنائیں تاکہ عوام الناس کی دین کے ساتھ وابستگی بڑھے' ان میں ذہنی وفکری اور اعتقادی ہی نہیں بلکہ عملی واخلاقی تبدیلی رونما ہو۔ ان کی زندگی بتائے کہ وہ واقعی رسول کے اُمتی ہیں' پیروکار اور متبع ہیں اور ان کا مطلوب ومقصود نجاتِ اُخروی ہے۔ انتخابی سیاست اور حصولِ اقتدار کی کشمکش کا میدان ''اسلام دوست'' طبقے کے لیے چھوڑ دیں۔ دین کا کام کریں اور اس طرح بالواسطہ اس طبقے پر خود بھی اثر انداز ہوں اور رائے عامہ کا دباؤ بھی ڈالیں کہ وہ صحیح اسلامی نظام کو اس ملک میں قائم و نافذ کریں۔

اب میں اس طبقے کے غور وفکر کے لیے جو اسلام پسند یا اسلام دوست کہلاتا ہے' کچھ مشورے پیش کروں گا۔ اس سے قبل آپ ایک طائرانہ نظر اپنے ملک کی سیاسی فضا پر ڈال لیں اور ایک سرسری سا جائزہ اس بات کا لے لیں کہ اس وقت سیاسی میدان میں کام کرنے والی جماعتوں اور پارٹیوں کی نوعیت و کیفیت کیا ہے! ان کے موقف کیا کیا ہیں! ان کے مقاصد کیا ہیں! یہ تجزیہ میری بات کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

ملک کی سیاسی فضا

ہمارے ملک میں سیاسی جماعتیں بے شمار ہیں۔ یہ درجنوں کے حساب سے ہیں اور اس میں ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔ پھر ان جماعتوں کی کیفیات و انواع بھی بہت مختلف ہیں۔ کچھ جماعتیں خالص سیاسی ہیں' کچھ خالص مذہبی اور کچھ نیم سیاسی و نیم دینی جماعتیں ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو polarization ہو رہی ہے' اس میں سب سے پہلی تقسیم اس بنیاد پر ہے کہ چند جماعتیں وہ ہیں جو اسلام کو اپنی جگہ ایک مکمل نظامِ زندگی تسلیم کرتی ہیں اور اس میں کسی بیرونی نظام کی پیوندکاری کو ضروری نہیں سمجھتیں بلکہ اس کو غلط متصور کرتی ہیں۔ یہی وہ پارٹیاں ہیں جو پاکستان کے وجود میں آنے کو بھی صحیح سمجھتی ہیں اور ان کو دین کے نفاذ کے لیے پاکستان کی بقا اور اس کا استحکام بھی عزیز ہے۔ پھر یہ پارٹیاں

اس بنیادی بات کی مقر اور قائل ہیں کہ پاکستان اس لیے قائم ہوا تھا کہ اس کے ذریعے عہد جدید کی ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ شہادت علی الناس کی جو ذِمہ داری نبی آخر الزماں ﷺ کی جانب سے پوری اُمت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد کی گئی تھی' وہ کم از کم پاکستان کے ذریعے اُمت کے ایک حصے کی طرف سے ادا ہو سکے۔ شہادت علی الناس کی ذمہ داری انفرادی طور پر ادا نہیں ہو سکتی' اس کے لیے ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کا قیام از بس ضروری ہے۔ اگر دین محض انفرادی اور اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہوتا تو ایک فرد بھی اپنی سیرت سے اس کی کامل گواہی دے سکتا تھا۔ البتہ اگر دین انسان کی پوری اجتماعی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہو' جیسا کہ فی الواقع ہمارا دین ہے' تو اس کے حق ہونے کی شہادت ایک ایسے اجتماعی نظام کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے جس میں مکمل طور پر اُن برکات و حسنات کا ظہور ہو رہا ہو جو ''دین الحق'' میں اس کائنات کے خالق نے رکھی ہیں اور جو دین منزل من اللہ ہے۔

پاکستان کے قیام کی صورت میں یہ امکان نظر آیا تھا کہ اس آرزو' تمنا اور خواہش کی طرف کچھ پیش رفت ہوگی۔ دنیا کے سامنے اسلامی نظام کا ایک عملی نمونہ پیش کیا جا سکے گا۔ قیام پاکستان کے محرکات میں ذہناً یہ بات بھی شامل تھی کہ اس طرح عالم اسلام کے اتحاد کی طرف بھی ایک قدم بڑھے گا' جس سے ہندو قوم بڑی خائف تھی۔ گاندھی جی نے بھی ایک مرتبہ قائداعظم سے پوچھا تھا کہ: آپ کے پاکستان کا مطلب Pan Islamism تو نہیں ہے؟ یہ سوال ہی بتا رہا ہے کہ ان کو اس کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ تقریباً دو سال قبل بھارت میں ایک مشہور ہندو صحافی نے مضمون لکھا تھا جس میں اس رائے کا اظہار کیا گیا تھا کہ ''ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندو تو صرف بھارت میں ہے جبکہ مسلمان پوری دنیا میں ہے' اس لیے بھارت کا پاکستان سے خائف رہنا حقیقی ہے۔'' اسی ضمن میں ایک دلچسپ اور عجیب بات آپ کو سناتا ہوں۔ چند سال قبل ایک بڑے ہندو صحافی نے لکھا تھا کہ ''بھارت کے داخلی اور خارجی مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ تمام ہندو مسلمان ہو جائیں' تب ہی ہم ترقی کر سکیں گے' خوش حالی ہمارے قدم چومے گی اور ہمارے لیے تمام مسلم ممالک سے

روابط اور تجارت کے راستے کھل جائیں گے۔ اس طرح مشرق وسطیٰ کی وسیع مارکیٹ کی راہ میں پاکستان رکاوٹ نہیں بنے گا۔'' اس خیال کے پیچھے وہی بنیا پن کی ذہنیت کارفرما ہے کہ اصل قدر ''دُنیا'' ہے اور حصولِ دُنیا کے لیے دھرم بدلنا پڑے تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ یہ بات تو بطور جملہ معترضہ درمیان میں آ گئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کوئی دیانت دار شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان کا قیام اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی توقعات اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ہوا تھا۔

ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو نظامِ اسلامی کے قیام سے قطعی مایوس ہو چکے ہیں۔ ان کا ذہن اس توقع سے خالی ہو چکا ہے کہ فی الواقع اس ملک میں اسلامی نظام آئے گا۔ ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جن کی زبان و قلم پر یہ بات آنے لگی ہے کہ پاکستان کا قیام خواہ مخواہ ہوا ہے، اس سے کوئی مستقل فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اسلامی نظام کا نفاذ جو تحریک پاکستان کی حقیقی منزل تھا ''ہنوز روزِ اوّل'' کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس معاملہ میں جتنی تاخیر و تعویق ہوگی وہ اسی اوسط و تناسب سے اس مایوسی کی کیفیت میں اضافہ کا باعث ہوگی، اور کسی قوم کے کسی ایک طبقے کا مسلسل مایوسی سے دوچار ہوتے چلے جانا انتہائی تشویش ناک ہے۔ اس طرح وحدتِ فکر کے قلعے میں مسلسل شگاف پڑتے رہنے کا احتمال قوی تر ہو جاتا ہے۔

مَیں نے دو نمایاں تقسیموں کا ذکر کیا تھا، جس میں پہلی تقسیم دائیں بازو کی جماعتوں کا مختصر طور پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ دوسری بڑی تقسیم ان جماعتوں کی ہے جو بائیں بازو کی پارٹیاں کہلاتی ہیں۔ ملک میں ان پارٹیوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نگاہیں کہیں باہر ہیں۔ ان کے فکر میں غیر اسلامی نظریات نے ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ ان کے متوسلین کی اکثریت کا نام کے سوا اسلام سے کوئی واجبی سا تعلق بھی نہیں ہے، بلکہ نظریہ و عقیدے کے لحاظ سے ان کو اسلام سے ایک طرح کا بیر ہے۔ کچھ واقعات و حالات کی وجہ سے ان کے نظریاتی اختلافات کی خلیج مزید گہری ہو گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انتقامی جذبات ان پر شدت سے غالب ہیں اور یہ آگ ان کے دلوں میں روز افزوں ہے۔ پھر

ہماری مغربی سرحد پر ایک مسلم برادر ملک پر توسیع پسند سرخ سامراج کی تاخت وتاراج نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔ یہ حقائق ہیں' ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے صدر مملکت یہ کہہ رہے ہیں کہ ''ملک میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ٹینکوں کے منتظر ہیں اور بے چین ہیں کہ جارحانہ یورش کرنے والوں کے گلوں میں ہار ڈالیں۔'' اگر ہمارے ملک کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت ان خدشات کا اظہار کر رہی ہے تو اس کے معنی ہیں کہ امر واقعہ تو ہے۔

پس یہ دو نمایاں قسمیں ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ اس میں دوسری قسم کی تقسیم کو مزید تقویت پہنچانے والی چیز ہے علاقائی عصبیت وتعصب اور محاذ آرائی۔ اس صورتِ حال سے فی الواقع ہمارا ملک اس وقت دوچار ہے۔ حقائق کو تسلیم کر کے ان کا حل تلاش کرنا دانش مندی کا تقاضا ہے جبکہ ان سے آنکھیں بند کر لینا یا ان کا سرے سے انکار دینا ناعاقبت اندیشی ہے جو ملک کے مستقبل کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دوسری قسم کا شاید ہی کوئی فرد یہاں موجود ہو۔ اگر ہو تو میری درخواست ہے کہ وہ میری اس گفتگو کو توجہ سے سنیں اور اس پر سنجیدگی سے غور کریں۔ میں اپنی اس رائے کا بھی اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس نقطۂ نظر کے افراد کو بھی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی بات کہنے کا حق ہونا چاہیے۔ قانونی حدود سے باہر کوئی غلط بات کہیں تو ان کو روکیے' ٹوکیے اور اگر ضرورت لاحق ہو تو ان کے خلاف عدالتی کارروائی بھی کیجیے۔ لیکن ان کو منظر (scene) سے بالکل ہٹا دینا دُرست نہیں۔ یہ طرزِ عمل فوری طور پر تو کچھ مفید ہوتا ہے' نتیجے کے اعتبار سے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اس طرح افواہوں کے پھیلنے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ ان کو اپنی بات openly کہنے دیجیے۔ اس کے بعد دوسروں کو اس پر ردوقدح کرنا چاہیے۔ بہرحال اس وقت میرے اصل مخاطب وہ نہیں ہیں۔ ان کے نظریات کچھ اور ہیں۔ ان کی نگاہیں کہیں اور ہیں۔ ان کے عزائم کچھ اور ہیں۔ اس وقت میرے اصل مخاطب پہلی قسم یعنی دائیں بازو کی جماعتوں کے لوگ ہیں۔ ان کی خدمت میں' میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

دائیں بازو کی جماعتوں کی کثرت

اسے مشورہ کہہ لیجیے' اپیل کہہ لیجیے' میری آرزو اور تمنا کہہ لیجیے۔ اپنے فہم کے مطابق صحیح مشورہ دینا میں اپنی دینی اور قومی ذمہ داری خیال کرتا ہوں۔ اگر لوگوں نے قبول کر لیا تو فَهُوَالمطلوب' اگر رد کر دیا تو بھی میں اخلاص وحسن نیت کے اجر سے محروم نہیں رہوں گا۔ قولِ حسن اور قولِ سدید کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل رائیگاں نہیں جاتا اور اگر اس کے ساتھ محنت ہو' کوشش ہو اور عمل صالح بھی ہو تو بات اُوپر اُٹھتی ہے: ﴿يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ (فاطر: ۱۰) ''اُسی کی طرف اُٹھتی ہیں اچھی باتیں اور عمل صالح اسے اوپر اٹھاتا ہے۔'' ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کسی صاحب کے ذریعے یہ باتیں ذمہ دار لوگوں تک پہنچ جائیں اور عمل کی طرف کچھ پیش رفت ہو سکے۔

میرے نزدیک اس polarization میں جس کے آثار فضا میں نظر آ رہے ہیں' دائیں بازو کی جماعتوں کا کثیر تعداد میں موجود رہنا ہی اصل میں تباہ کن ہے۔ یہی بات ہمارے بہت سے مخلص رہنما بار بار کہہ چکے ہیں۔ میں اس کی تائید کر رہا ہوں۔ جماعتوں کی اسی کثرت نے آج تک ہر مرحلے پر شکست دلائی ہے۔ ہر فتح کو شکست میں تبدیل کرایا ہے۔ جماعتوں کی اس کثرت کی بدولت ماضی میں ایسے تلخ اور تباہ کن نتائج سے سابقہ پیش آ چکا ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں کو حالانکہ تریسٹھ فی صد ووٹ ملے تھے اور بائیں بازو کی جماعتوں کو سینتیس فی صد لیکن ۶۳ فی صد ووٹ تقسیم ہو گئے' لہٰذا وہ اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکیں اور ۳۷ فیصد ووٹ لینے والی پارٹی حکمران بن گئی۔

اگر ہم نے اسی طرزِ عمل کا اعادہ کیا تو اس کے نتائج بھی وہی نکلیں گے جو پہلے نکل چکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کا دور یاد کیجیے۔ جو نتائج اس وقت نکلے تھے' اور جن حالات میں نکلے تھے' ویسے ہی حالات میں وہی بلکہ ان سے بھی بدتر نتائج آج بھی نکل سکتے ہیں' چونکہ آج ہماری مغربی سرحد کے پار سے بائیں بازو کی جماعتوں کو تعاون کی بڑی امیدیں ہیں۔ بہر حال یہ اندازے کا معاملہ ہے' میں اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے صدرِ مملکت نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ

ان کا خیال درست ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ بھی اُنہی مغالطوں میں مبتلا ہوں جن میں بھٹو صاحب رہے کہ ان کو اپنی کرسی بڑی مضبوط نظر آتی رہی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے صدر صاحب کے گرد کوئی ایسا ہی ہالہ ہو جو ان کو صحیح حالات اور صورتِ واقعہ سے بے خبر رکھے ہوئے ہو۔ واللہ اعلم!

البتہ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں کی کثرت اور اُن کے اختلافات پیش نظر مقاصد کے حصول میں ایک زبردست رکاوٹ ہیں۔ محاذ آرائی کے اس مرحلے پر سنجیدگی سے غور و فکر اور موثر عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ان جماعتوں کی تعداد کو کم اور اختلافات و تفرقے کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

دو کام اور دو میدان

میرے نزدیک انتہائی ضروری ہے کہ ان دائیں بازو کی جماعتوں کو شعوری اور ذہنی اعتبار سے یہ بات طے کر لینی چاہیے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام کے لیے کرنے کے ''دو کام'' اور ''دو میدان'' ہیں۔ ایک میدان ہے سیاست یعنی انتخابات اور حکومت کا۔ دوسرا میدان ہے دعوت و اصلاح کا۔ پہلے تو یہ طے کیا جائے کہ کون کس میدان میں کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ گڈمڈ والا معاملہ انتہائی تباہ کن ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر آنے والے مرحلے میں ان دائیں بازو (اسلام پسند) جماعتوں نے شکست کھائی تو وہ سابقہ شکست سے کہیں زیادہ ہول ناک اور تباہ کن ہوگی۔ اس مرتبہ معاملہ محض انتخابی شکست تک محدود نہیں رہے گا۔ اب انتقامی جذبات ہیں۔ ایک سپر پاور ہمارے دروازے پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا اگر یہ خیال ہے کہ شاید انڈونیشیا والا معاملہ یہاں ہو جائے گا اور جیسے وہاں ایک خاص نظریے کے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا تھا ایسے ہی یہاں بھی ہو سکتا ہے' تو وہ اس خیال خام کو ذہن سے نکال دیں۔ اوّل تو یہ فعل ہی سرے سے غلط ہے' دوسرے یہاں معاملہ بہت مختلف ہے۔ روس کے اپنے مفادات ہیں جن کے لیے وہ کسی مناسب موقع کا منتظر ہے۔ اب وہ ہم سے براہِ راست متعلق ہے۔ اس کی توپیں اس شاہراہ کی طرف لگی ہوئی ہیں جس پر ہمیں بڑا اعتماد اور ہمارا

انحصار ہے۔ افغانستان کے صوبے واخان کو اس نے پوری طرح قابو کر کے وہاں اپنے جو مورچے قائم کیے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔ پس حالات میں بڑا فرق ہے۔ اب اگر ''اسلام پسند'' جماعتوں کو شکست ہوئی تو وہ بہت ہی خوف ناک تباہی پر منتج ہوگی۔ صرف انسانی جان و مال کے اتلاف ہی پر معاملہ ختم نہیں ہوگا بلکہ پاکستان جس مقصد کے لیے وجود میں آیا اور جو اُمیدیں اس سے وابستہ ہیں اس اعتبار سے معاملہ بہت پیچھے چلا جائے گا۔ لہٰذا جس کے لیے بھی ممکن ہے اور جو شخص بھی اس طبقے کے کسی ذمہ دار شخص تک رسائی رکھتا ہے' اس کا دینی اور قومی فریضہ ہے کہ وہ ان کی خوشامد کرے۔ ان کے سامنے اگر ضرورت ہو تو گڑ گڑائے کہ خدارا اختلافات اور تفرقے کی خلیج کو پاٹنے کی مخلصانہ کوششیں کیجیے۔ جماعتوں کی یہ کثرت اور ان کی باہمی رسہ کشی پاکستان کے مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔

بظاہر فضا میں سکون نظر آ رہا ہے تو اس کی وجہ سیاسی سرگرمیوں پر موجود پابندی ہے' ورنہ بڑے دکھ سے عرض کرتا ہوں کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ یہ جماعتیں ایک دوسرے سے انتہائی خار کھاتی ہیں۔ ان کے زعماء میں سے اکثر کے دل ایک دوسرے کی کدورت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ط﴾ (الحشر:۱۴) والی کیفیت ہے کہ ''تم سمجھتے ہو کہ یہ متحد ہیں حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔'' اندر سے یہ ایک دوسرے کو اڑنگے لگا رہے ہیں' ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹ رہے ہیں۔ ماضی میں یہ لوگ عوام کے سامنے آ کر ایک ساتھ سٹیج پر بیٹھتے تھے لیکن اندرونی حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کو زک دینے کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ یہ محض قیاس و گمان نہیں ہے بلکہ یہ تمام افسوس ناک حالات اخبارات کے ذریعے ملک کے سامنے آ چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کو واقعتاً ختم کرنے ہی میں عافیت ہے' ورنہ ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔

اس سے آگے ایک اور اقدام بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ واضح طور پر متعین ہو جائے کہ کس کو کس میدان میں کام کرنا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ جب تک حکومت کی اصلاح نہیں ہوگی' اس ملک میں نہ اسلامی نظام کے قیام کی طرف صحیح طور پر پیش رفت ہوگی اور نہ ہی معاشرہ ٹھیک ہو سکے گا۔ مجھے اس سے اختلاف ہو بھی' تب بھی میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ

اس نظریے اور رائے میں خلوص ہو سکتا ہے اور یہ عمل کسی نہ کسی درجہ میں شائد مفید مطلب بھی ہو سکے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس رائے کا محرک محض اقتدار پسندی ہی ہو۔ دوسری رائے یہ ہے کہ کُل کا کُل معاشرہ بگڑا ہوا ہے۔ باستثنائے چند یہاں ہر شخص ذاتی مفادات کا غلام بنا ہوا ہے۔ ہر شخص چور ہے' خائن ہے' تناقض و منافقت کے روگ میں مبتلا ہے۔ یہاں ان لوگوں کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا جو دیانت دار اور امانت دار ہوں۔ جن کے پاس کوئی منصب ہو اور وہ اس سے ناجائز انتفاع نہ کر رہے ہوں! حکومت کے ایسے کتنے عمال اور اہل کار ہیں جو رشوت کی لعنت میں گرفتار نہ ہوں! وہ کون سے صنعت کار' تجار' زمیں دار' مزدور اور کاشت کار ہیں جو اپنے اپنے دائرہ عمل میں دیانت و امانت کے ساتھ فرائض انجام دے رہے ہوں! ابھی یہ معاشرہ خیر سے بالکل محروم نہیں ہوا' لیکن اس کا تناسب آٹے میں نمک کے تناسب سے بھی کم ہے۔ درحقیقت پورے معاشرے میں بگاڑ ہے۔ لہٰذا کچھ لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ حکومت کی اصلاح بھی صحیح معنوں میں اُسی وقت ممکن ہو گی جب معاشرے کے معتدبہ حصے کی اصلاح ہو گی۔ میری بھی رائے یہی ہے۔ یہ رائے بھی دیانت و اخلاص پر مبنی ہو سکتی ہے۔ ہمارا معاشرہ فکر و نظر اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے جس حال میں ہے اس میں ممکن ہی نہیں کہ زمام کار صالحین کے ہاتھ میں آ سکے۔ اگر بخت اتفاق سے آ بھی جائے تو حکومت کی مشینری جن کار پردازان پر مشتمل ہے وہ حکومت کی پالیسیوں کو جب چاہیں اور جس طرح چاہیں ناکام بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا اوّلین اہمیت اس کی ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے بڑے وسیع پیمانے پر تطہیر افکار اور تعمیر سیرت و اخلاق کی جدوجہد ہو۔ ایمان باللہ' ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی بنیادیں قلوب و اذہان میں جاگزیں اور پختہ ہوں۔ حقیقی تقویٰ پیدا ہو۔ یہ ہے کام کی پہلی منزل اور پہلا میدان!

اب کیا ہونا چاہیے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے! میری رائے میں یہ طے ہو جانا ضروری ہے کہ کون سی جماعت کس میدان میں کام کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ بہت سی جماعتوں کے مقاصد گڈمڈ قسم کے ہیں۔ کوئی صرف کسی خاص فقہی یا کلامی عقیدے کی بنا پر یا تعبیر یا راج

ومرجوح اور افضل ومفضول کے اختلافات کی بنیاد پر علیحدہ جماعت ہے۔ ایک خاص نوعیت کے عقائد رکھنے والا ہی اس جماعت سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ پھر وہ جماعت سیاست میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ایسی جماعت سیاست کے میدان میں بھی اپنے خاص فقہی مسلک کو پیش نظر رکھ کر کام کرتی ہے۔ ہر موقع پر اپنے خاص مسلک کے تحفظ و تشخص کی کوشش ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے مسالک کے حاملین سے تصادم ہوتا ہے اور اختلافات کی خلیج مزید وسیع ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ دو جدا جدا fields طے ہو جائیں۔ جس جماعت کو اپنے فقہی مسلک کا تحفظ کرنا ہے وہ اپنے حلقہ اثر میں یہ کام کرے۔ عوام الناس میں وہ دعوت و تبلیغ کا ہدف صرف اصلاح اعمال و اخلاق کو بنائے اور قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کو حقیقی مسلمان بننے کی تلقین کرے۔ اپنے مسلک اور دعوتی کام کو سیاسی تفوق کے لیے استعمال نہ کرے اور نہ ہی مناظرہ والی کیفیت ہو بلکہ دعوتی اور علمی انداز میں کام ہو۔ ایسی جماعتوں پر لازم ہو کہ وہ سیاسی اور خاص طور پر انتخابی سیاسی میدان میں کوئی حصہ نہیں لیں گی۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ اس طرح کی فقہی وکلامی مسائل کی بنیاد پر جو جماعتیں بھی انتخابی سیاست میں حصہ لیں گی اور دوسرے مسالک کی جماعتوں کے مقابلے میں سیاسی میدان میں محاذ آرا ہوں گی تو اس ملک کو تباہی سے بچانا تقریباً ناممکن ہوگا۔ اس قسم کی نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں چار پانچ نہیں اگر سمٹ سمٹا کر صرف دو بھی رہیں تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ بھی انتہائی خطرے کی بات ہے۔

دوسرا طبقہ جو فی الوقت پیش منظر میں موجود نہیں ہے لیکن فی الواقع وہ موجود ہے، پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے اثرات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہمارے معاشرے کے تمام مفاد پرست لوگ اس کی پشت پر ہیں۔ اب اس گروہ پر انتقامی جذبات بھی غالب ہیں۔ بیرونی امداد اور آشیر باد بھی اس کو بآسانی حاصل ہو سکتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ اب بھی حاصل ہو۔ پھر یہ گروہ سیاسی ہتھکنڈوں سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صحیح وغلط، جائز وناجائز کا کوئی معیار اس کے سامنے نہیں ہے۔ اخلاق کی ہر قدر سے یہ گروہ تہی دست ہے۔ پھر اس طبقے کے بہت سے لوگ سات سال تک حکومت کے کلیدی

عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے آستین کے سانپ اب بھی حکومت کی صفوں میں موجود ہیں۔ ان لوگوں کو نہ اسلام سے محبت ہے نہ ملک سے۔ لہٰذا اگر دائیں بازو کی جماعتیں زیادہ نہیں بلکہ صرف دو بھی انتخابات میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئیں تو بھی یہ طبقہ ان جماعتوں کے اندرونی اختلافات کو خوب ہوا دے گا اور ان کو آپس میں لڑا کر اپنے لیے کامیابی کی راہ نکال لے گا۔

اس نازک صورتِ حال سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ سیاست کے میدان میں دائیں بازو کی صرف ایک جماعت ہو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیت یا استعداد کو سیاست کے میدان میں استعمال کر کے ملک اور دین کی بہتر اور موثر خدمت کر سکتے ہیں' وہ اس میدان میں بلا تکلف کام کریں۔ البتہ وہ ایک سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور اس کے نظم کے تحت کام کریں۔ میں نام نہیں لیتا کہ وہ واحد سیاسی جماعت کون سی ہو! بہرحال ایک ایسی جماعت لازمی ہے جس میں یہ پابندی ہو کہ اس میں وہی لوگ شامل ہو سکیں گے جو اسلام دوست ہوں۔ اس جماعت میں علماء بھی شامل ہوں' چاہے پارٹی کی قیادت ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔ آخر قیامِ پاکستان کے وقت بھی تو ایک ہی سیاسی پارٹی تھی جس کی قیادت علماء کے ہاتھ میں نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ اسلام دوست سیاست دانوں کے ہاتھ میں تھی' اگرچہ اُس وقت کے اور اس دور کے سیاست دانوں کے کردار میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ قائداعظم اور نام نہاد قائدِ عوام کے مابین معاملہ بڑا مختلف ہو چکا ہے۔ بہرحال اُس وقت قیادت علماء کے ہاتھوں میں ہونے کے بجائے ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو اسلام پسند تھے۔ اس حقیقت کو آج بھی تسلیم کیجیے۔ خوامخواہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کا حاصل کچھ نہیں۔ اس ملک کے عوام کی فکری اور اخلاقی تربیت کی طرف توجہ دی ہی نہیں گئی' اور اگر دی گئی تو بہت کم۔ اس میدان میں جو جماعتیں اور جو لوگ کام کر سکتے تھے' وہ سیاسی کھیل میں لگے رہے اور ووٹروں کی خوشنودی کے پیشِ نظر عوام الناس کی دینی' اعتقادی' عملی اور اخلاقی اصلاح سے غضِ بصر کرنے پر مجبور ہوئے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ تا حال ہمارے عوام میں فکر و نظر اور سیرت و اخلاق کے لحاظ سے کوئی نمایاں اور بنیادی

تبدیلی نہیں آئی ہے' بلکہ معاملہ نیچے ہی گیا ہے۔ پس سیاسی قیادت علماء کے ہاتھ میں آجانے کا فی الحال دُور دُور تک امکان نہیں ہے۔ یہ تو فی الوقت اِسی قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے گی جو سیاسی کہلاتے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ جب معاشرے کی اصلاح کا کام انجام نہیں دیا گیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہاں سے وہ قیادت اُبھر سکے جو نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اسلامی سیرت و کردار کا مکمل نمونہ ہو۔ یہ خواہش و تمنا اپنی جگہ بہت مبارک ہے لیکن محض آرزو اور تمنا سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو پہلے معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی۔ سیاسی میدان میں دائیں بازو کی صرف ایک ہی جماعت ازبس ضروری ہے ورنہ انتشار رہے گا اور شکست یقینی ہوگی۔ اگر کچھ لوگوں کو واقعتاً اس ملک کا مستقبل عزیز ہے اور وہ اس ملک کو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بچانا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہوں کہ اس کے لیے سیاسی میدان میں کام کرنا ضروری ہے تو وہ اس امر کی ہر ممکن کوشش کریں کہ اسلام اور پاکستان سے حقیقی وابستگی رکھنے والے تمام لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہو۔ ایک پلیٹ فارم اور ایک جھنڈا ہو۔ انتخابی میدان میں یہی ایک پارٹی دوسرے نقطۂ نظر رکھنے والوں سے مقابلہ کرے۔

اس مقصد کے لیے جماعتوں کا کوئی ''متحدہ محاذ'' ہرگز مفید مطلب نہیں ہوگا۔ کوئی کتنی احتیاط ملحوظ رکھے' تخریب اور جماعتی عصبیت بہر نوع باقی رہتی ہے اور موقع بموقع گل کھلاتی ہے۔ پہلے مرحلے ہی میں اپنی اپنی جماعتوں کی متناسب نمائندگی کا مسئلہ متنازع فیہ بنتا ہے۔ پھر ہر جماعت شعوری اور غیر شعوری طور پر اس متحدہ محاذ کو اپنی جماعت کا امیج بنانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ قدم قدم پر جماعتی مفادات اور تحفظات آڑے آتے ہیں۔ پھر انتخاب کے مرحلے پر اسمبلیوں کی نشستوں کے لیے نمائندگی کے تناسب پر کھینچ تان ہوتی ہے۔ یہ مراحل طے بھی ہو جائیں تو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق اور یہ خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے کہ انتخاب کے بعد اسمبلی میں ان نمائندگان کا جو مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں' کردار کیا ہوگا! کوئی کسی وقت علیحدہ نہ ہو جائے اور علیحدہ نہ بھی ہو تو تعاون قائم رکھنے کے لیے بے جا دباؤ نہ ڈالے۔ سیاسی شعور کے لحاظ سے فرانس جیسے

ترقی یافتہ ملک میں ''متحدہ محاذ'' والا یہ تجربہ کئی بار ناکام ہو چکا ہے۔ ترکی میں بھی یہی صورتِ حال پیش آ چکی ہے اور ابھی حال ہی میں بھارت میں ''جنتا پارٹی'' کے نام سے مختلف پارٹیوں کا جو ''متحدہ محاذ'' بنا تھا اور اس نے اسمبلی میں اکثریت بھی حاصل کر لی تھی' بُری طرح ناکام ہوا۔ لہٰذا ہمارے ملک کے سیاسی شعور کے معیار کو دیکھتے ہوئے یہ احتمال قوی تر ہے کہ اس قسم کا ''اتحاد'' زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکے گا اور اسمبلی میں جا کر مختلف عوامل اس ''اتحاد'' کی شکست و ریخت کا باعث بن جائیں گے۔ اس لیے واضح و موثر اکثریت حاصل کرنے اور ایک مضبوط حکومت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے تمام سیاست دان اور علماء ایک ہی جماعت کے نظم اور منشور کے پابند ہوں۔

اب رہا ان حضرات کا معاملہ جو اس بات کو ترجیح دیں کہ ہم کو دعوت و تبلیغ اور اصلاح کے میدان میں کام کرنا ہے اور لوگوں کو فکری و نظری اور عملی طور پر اسلام پر کاربند رہنے کی تربیت دینی ہے۔ ان لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ انتخابی سیاست سے ہاتھ اٹھا لیں اور طے کر لیں کہ یہ میدان ان کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔ وہ ہر ہنگامی و وقتی ترغیبات سے اپنا دامن بچائیں گے۔ پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت و اصلاح کے کام میں اپنی توانائیاں' صلاحیتیں' اوقات اور وسائل صرف کریں گے۔ ان کے کام میں اس بات کا ادنیٰ شائبہ بھی نظر نہ آئے گا جس سے شک پیدا ہو کہ یہ کام انتخابی میدان میں اپنے تشخص یا اپنی جماعت کی ساکھ قائم کرنے کے لیے انجام دیا جا رہا ہے۔ ان کے عمل سے یہ ظاہر ہو کہ ان کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ حسبِ ضرورت یہ لوگ نصح و خیر خواہی کے جذبے کے تحت حکومت کو مفید مشورے دینے کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھیں۔ اس نہج پر کام کرنے کی بدولت یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے تناسب کے مطابق ان شاء اللہ حکومت کے معاملات کی بھی بتدریج اصلاح ہوتی چلی جائے گی۔

اس ضمن میں' میں یہ نہیں کہتا کہ دعوت و اصلاح کے لیے بھی کوئی ایک جماعت بن جائے چونکہ یہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ یہ عقائد اور فقہی مسائل میں اختلافات کا معاملہ ہے جو جلد اور آسانی سے بدلنے اور ختم ہونے والے نہیں۔ سیاست کے میدان میں فقہی

اور کلامی مسائل سے زیادہ اہم معاملہ اسلام اور پاکستان کے نظریے کے ساتھ وابستگی کا ہے‘ لہٰذا اس کام کے لیے ایک واحد جماعت کا قیام ممکن بھی ہے اور سہل بھی۔ دعوت و اصلاح کے میدان میں فقہی وکلامی اختلافات سے سابقہ پیش آئے گا۔ مجھے یہ بات پسند ہو یا ناپسند‘ امر واقعہ میں تو اختلافات موجود ہیں۔ ہمارے ہاں مختلف فقہی مکاتب فکر عملاً موجود ہیں‘ ان کا ایک جماعت میں ضم ہونا بہت مشکل ہے۔ البتہ ضروری ہے کہ اس میدان میں کام کرنے کا صحیح نہج یہ ہونا چاہیے کہ فقہی‘ فروعی‘ جزوی اور کلامی نوعیت کے اختلافات میں شدت ومخالفت سے اجتناب کیا جائے۔ اختلاف اور مخالفت میں بڑا فرق ہے۔ معاملہ اختلاف تک رہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تعبیر ورائے کا اختلاف تو صحابہ کرامؓ اور تابعین میں بھی تھا۔ بایں ہمہ وہ باہم شیر وشکر تھے‘ ایک دوسرے کی مخالفت کا کیا سوال! پھر افہام وتفہیم اور تعلّم وتعلیم سے ان اختلافات کو دُور یا شدت کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس میدان میں کام کرنے والوں کے سامنے خدا ترسی کے ساتھ یہ اصول رہنا چاہیے کہ ان اختلافات کو بھی صرف اپنے حلقوں میں بیان کیا جائے گا۔ عوامی سطح پر ان کو بیان کرنے اور بحث ومناظرہ سے پرہیز کیا جائے گا۔ اس سطح پر لوگوں کو حقیقی اور عملی طور پر مسلمان بننے کی دعوت دی جائے گی۔ ان کے قلوب میں ایمان کی شمع روشن اور محاسبہ اُخروی کا یقین پیدا کیا جائے گا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں از روئے قرآن وسنت ان پر عائد ہوتی ہیں‘ ان کو واضح کیا جائے گا۔ ایسے نکات اور مسائل بے شمار ہیں جن میں تمام مسالک اور مکاتب فکر کے متعلقین میں مکمل اتفاق ہے‘ لہٰذا ان کو اپنی سعی وجہد کا مرکز ومحور قرار دینا خدمتِ دین ہے۔ جب حال یہ ہو کہ ہمارے معاشرے میں جمعہ کی نماز بھی آبادی کا بمشکل پانچ فیصد حصہ ادا کرتا ہو وہاں دعوت واصلاح کے اصل موضوعات دعوتِ تجدیدِ ایمان‘ دعوتِ توبۃ النصوح اور دعوتِ تجدید عہد ومیثاق ہونے چاہئیں نہ کہ فقہی اختلافات کی نشر واشاعت۔ ایمان‘ اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع‘ آخر یہ موضوعات ہی تو ہمارے دین کی اساسات ہیں۔ عوامی سطح پر دعوت واصلاح کا نہج یہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح امت میں یکجہتی اور اتحاد پیدا ہو گا۔ ہماری نوجوان نسل اور نئے تعلیم یافتہ لوگ فقہی اختلافات کے بحث و

مناظرے سے اتنے تنگ آ چکے ہیں کہ اس کے باعث نفس دین سے بیزار بلکہ بغاوت کی سرحدوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کا بھی علاج یہی ہے کہ ایک دوسرے پر چھینٹے اُڑانے سے بچا جائے اور دعوت واصلاح کا مرکز ومحور کتاب وسنت کو بنایا جائے۔ ان شاء اللہ اسی طرزِ عمل سے تعاون، اشتراک اور باہمی رواداری کی فضا پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

پس چہ باید کرد

حالات کی سنگینی اس امر کی متقاضی ہے کہ ہمارے سیاسی اور دینی رہنما مل جُل کر بیٹھیں اور آنے والے خطرات کا تدارک کرنے کی عملی تدابیر اختیار کریں۔ آپ میں سے جو لوگ بھی اثر انداز ہو سکتے ہوں وہ ان حضرات پر اپنا اثر استعمال کریں۔ اس میں اپیل یہ ہو کہ دیکھیے بنیوں کا بھی دستور ہے کہ ''ساری جاتی دیکھیے تو آدھی دیجیے بانٹ۔'' اگر یہ خطرہ نظر آتا ہے کہ ملک ہاتھ سے چلا جائے گا اور یہاں اسلام کا مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا تو خدارا اس خطرے سے بچنے کی عملی تدابیر اختیار کیجیے۔ حال ہی میں افغانستان سے مختلف طبقات کے لوگوں کو روس لے جایا جا رہا ہے جہاں سے وہ ٹریننگ لے کر آ رہے ہیں۔ معاشیات دان وہاں سے اشتراکی معاشیات کی تربیت حاصل کر کے آ رہے ہیں۔ مدرسوں اور کالجوں کے اساتذہ کی کھیپ کی کھیپ روس سے وہ تکنیک اور طریقے سیکھ کر آ رہی ہے جس سے پوری نئی نسل کی ایسی برین واشنگ ہو گی کہ ان کا اسلام سے تعلق قائم رہنا تو درکنار وہ اس سے بالکل باغی ہو جائیں گے۔ ترکستان میں یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ آج تقریباً دو کروڑ کی مسلمان قوم، بڑی جوشیلی اور گرم خون رکھنے والی قوم، بڑی حریت پسند قوم جس نے کبھی کسی دوسری قوم کی غلامی قبول نہیں کی، اسلام سے قلبی تعلق رکھنے والی قوم روسی سامراج کے خونی شکنجے میں بُری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ اس کا خون مسلسل بہہ رہا ہے اور پوری قوم کی قلبِ ماہیت کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ بات جان لیجیے کہ نظامِ تعلیم میں جدید نفسیات کو جس قدر کامیابی سے روس نے استعمال کیا ہے، کسی نے نہیں کیا۔ تعلیم کے ذریعے اذہان کو ایک خاص رُخ پر موڑنے اور یکسر بدلنے کے جو ہتھکنڈے روس کے پاس ہیں، کسی کے پاس نہیں۔ وہ مصیبت کسی بھی وقت ہم پر بھی نازل ہو سکتی

ہے۔لہٰذا موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے اختلافات میں اعتدال آئے' ان کی شدت کم سے کم تر ہو اور ہماری دفاعی قوت مضبوط سے مضبوط تر ہو۔ دفاع صرف فوج اور اسلحہ کا نام نہیں ہے بلکہ ملک میں مکمل ذہنی وفکری اور عملی ہم آہنگی بھی دفاعی قوت میں شامل ہوتی ہے۔لہٰذا ایسا اتحاد ضروری ہے کہ جس کے ذریعے قوم ایک بنیانِ مرصوص بن جائے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ تمام فقہی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا جائے یا ان کو ختم کر دیا جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے۔ ہر ایک کے پاس کتاب وسنت سے دلائل ہیں۔ یہ فقہی مسائل انہی دونوں ماخذ سے مستنبط ہیں۔ یہ اپنی جگہ قائم رہیں' اس میں کوئی ہرج نہیں۔ البتہ ان کو صحیح مقام اور حدود میں رکھنا چاہیے۔ ان کی مخالفت اور تردید کے لیے مستقل مورچے بنا کر اپنی توانائیاں اسی کام میں لگانا دین کی خدمت نہیں ہے۔ اس خدمت کا اصل ہدف ہے اسلام وایمان کی دعوت' تقویٰ وبرّ کی دعوت' فرائض کی ادائیگی کی دعوت' اعمالِ صالح کی دعوت' معروفات کے اختیار اور منکرات کو ترک کرنے کی دعوت۔ الغرض پوری زندگی کو اللہ کی بندگی میں دینے کی دعوت اور تلقین۔

آج ہمارا معاشرہ اس کا شدید محتاج ہے کہ اُس کو جھنجوڑا جائے۔ اس میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے۔ اس میں توبہ کی ایک عمومی تحریک بپا کی جائے کہ اللہ کے بندو باز آؤ معصیت اور نافرمانیوں سے' باز آؤ حرام خوریوں سے' باز آؤ رشوت دینے اور رشوت خوری سے' باز آؤ ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی سے' باز آؤ سودی کاروبار سے۔ اپنی تمام بداعمالیوں اور بےعملیوں سے توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کرو۔ اپنے رب کے ساتھ ازسرِنو عہد کرو کہ ہم تیرے مخلص بندے بن کر انفرادی طور پر دین کے مطابق زندگی بسر کریں گے اور اس ملک کو بھی ایک مثالی اسلامی ریاست بنائیں گے۔ چند سال قبل ملک گیر پیمانے پر' ایک ''یومِ میثاق'' منایا گیا تھا۔ لیکن حاصل کیا ہوا؟ دن منانے آسان ہیں لیکن فی الواقع قلوب واذہان کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق اصلاح قبول کرنے پر راغب کرنا ایک مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اس کے لیے تو ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی مخلصانہ سعی

ومحنت کی ضرورت ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور وہ لوگ جو واقعی دین سے محبت کرتے اور معاشرے کی اصلاح کا ولولہ رکھتے ہیں' وہ کمر ہمت کسیں' انھیں اور توبہ کی منادی کریں کہ ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (التحریم: ۸) ''اے ایمان والو! اللہ سے توبہ کرو۔ خالص توبہ' بعید نہیں کہ اس توبہ کی بدولت اللہ تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے۔'' ان کی پکار یہ ہو کہ ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم: ٦) ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو نارِ جہنم سے۔'' اجتماعی توبہ سے عذاب خداوندی ٹل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ قوم یونسؑ پر عذاب الٰہی کے آثار شروع ہو گئے تھے لیکن ان کی اجتماعی توبہ سے یہ ٹل گیا تھا۔ آج داخلی وخارجی طور پر ہم جن حالات سے دوچار ہیں' یہ دراصل عذابِ الٰہی کے آثار ہیں۔ اس وقت ہم اجتماعی توبہ کے محتاج ہیں' یہی چیز ہم کو اللہ کی پکڑ سے بچا سکتی ہے۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اس کے لیے ضروری ہوگا کہ جو لوگ اس میدان میں کام کر رہے ہیں' وہ فقہی وکلامی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے لوگوں میں ایمان' تقویٰ' اخلاق اور کردار کی اصلاح کی تبلیغ وتلقین پر اپنی توانائیاں مرتکز کریں۔ غور کیجیے کہ ان اختلافات کی نوعیت ہے کیا! کوئی رفع یدین کرتا ہے کوئی نہیں کرتا' کوئی آمین زور سے کہتا ہے کوئی آہستہ' کوئی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا قائل ہے کوئی نہیں۔ یہ جزوی اختلافات ہیں۔ ان سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ دونوں مسالک کے لیے احادیث بھی موجود ہیں اور آثارِ صحابہؓ بھی۔ اب ان مسائل کی تائید یا تردید پر تمام توجہات مرکوز کرنا کون سی خدمتِ دین ہے! کرنے کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو نماز ادا کرنے کی ترغیب دی جائے۔ ان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ ان کی سیرت وکردار اور اخلاق ومعاملات کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

ہمارے عوام اللہ کے نام لیوا، آخرت کے ماننے والے اور نبی اکرم ﷺ کے اُمتی ہیں۔ مشرکانہ اور مبتدعانہ اوہام کی وجہ سے عقیدۂ توحید میں جو رخنہ آ گیا ہے، اس کی اصلاح کی صورت دین کی صحیح تعلیمات کی نشر واشاعت ہے۔ یہی حقیقی خدمتِ دین ہے۔

ملک کی تمام دینی جماعتیں ایک جماعت میں مدغم ہو جائیں، یہ ممکن العمل نہیں ہے۔ یہ کام تو سیاسی میدان میں کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا انحصار مخلصانہ سعی و کوشش اور چند بڑی سیاسی شخصیتوں کے ایثار پر ہے۔ میں آج کی اس تقریر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو یہ بات بھی ذہن میں آئی تھی کہ دینی جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ ہیں، کاش ان کا کوئی ''اتحاد'' عمل میں آ سکے۔ ۱۹۷۷ء میں انتخابات کے لیے تو ''قومی اتحاد'' بنا تھا، اب کاش دعوت و اصلاح اور احیائے اسلام کے لیے کوئی ''اسلامی اتحاد'' وجود میں آ جائے۔ اگر اسلام اور پاکستان کی حقیقی خدمت کرنی ہے قطع نظر اس سے کہ سیاسی چودھراہٹ ملتی ہے یا نہیں، تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ ایسا ''اتحاد'' قائم نہ ہو سکے۔

سیاسی میدان سیادت و اقتدار کی جنگ کا میدان ہے۔ یہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور نیچا دکھانے کا راستہ ہے۔ اس راہ میں دلوں میں کدورتیں اور تلخیاں بڑھتی ہیں۔ چونکہ ووٹروں کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اس لیے ان کے غلط افکار و اعمال اور معاملات پر مداہنت اختیار کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس راہ پر چلنے والے اپنی حریف جماعتوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں جبکہ دعوت و اصلاح درحقیقت خیر خواہی اور نصح کی راہ ہے۔ دلوں کو جیتنے اور باہمی الفت و مودت پیدا کرنے کی راہ ہے۔

دعوت و اصلاح کے لیے رہنمائی

میں اپنی ان دردمندانہ معروضات کو ختم کرنے سے قبل چاہوں گا کہ اس گفتگو کے آغاز میں سورۂ آل عمران کی جن آیات کی تلاوت کی گئی تھی ان سے دعوت و اصلاح کے لیے رہنمائی کا لائحہ عمل سامنے آ جائے تا کہ آپ کو اپنے حلقہ ہائے اثر تک پہنچانے میں مدد مل سکے۔ ان آیات میں سب سے پہلے تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ

اختیار کرو جیسا کہ اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔'' ہمارے دین میں ''تقویٰ'' ایک جامع ترین اصطلاح ہے۔ اجمالاً یہ سمجھ لیجیے کہ تقویٰ اس طرزِ عمل کا نام ہے کہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کے غضب' سزا کے خوف اور اس کے انعام' نگاہِ کرم کے شوق سے نافرمانی ومعصیت کے ہر عمل سے بچتا ہوا دین کے تقاضوں کو ادا کرنے کی فکر کرے۔ آیت کا اگلا حصہ اسی تقویٰ کی زندگی کی شرح ہے کہ ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار ہو۔'' یعنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی شعوری طور پر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی میں نہ گزرے۔ لہٰذا دعوت واصلاح کا پہلا نکتہ تو ہوگا اسی تقویٰ کی دعوت' تطہیر افکار و اعمال کی دعوت' اخلاق کی درستگی اور تمام منکرات سے اجتناب کی دعوت۔

دعوت و اصلاح کا دوسرا نکتہ ہوگا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقے میں نہ پڑو۔'' اللہ کی رسی سے مراد ''قرآن مجید'' ہے' اس میں کسی نوع کا اختلاف نہیں ہے۔ یہ کتاب اسلامی اتحاد کی اولین اور مضبوط ترین بنیاد ہے۔ یہی اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی ہے۔ اسی کا وصف لَا انْفِصَامَ لَهَا ہے۔ اسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقے سے بچنے کا آیت کے اس حصے میں حکم دیا گیا ہے۔ تفرقہ وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنے والا عمل ہے۔

اختلاف اور تفرقے میں بڑا فرق ہے۔ اختلافات دین کے دائرے میں رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن رائے اور تعبیر کے اختلاف کی بنیاد پر باقاعدہ علیحدہ علیحدہ فرقے بنالینا دینی نقطہ نظر سے بالکل غلط ہے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ (الانفال: ۴۶) ''اور آپس میں جھگڑو نہیں۔ اس سے تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' یہ حکم صحابہ کرامؓ کو دیا گیا تھا جبکہ ان کے درمیان نبی اکرم ﷺ بنفس نفیس موجود تھے۔ ان کو متنبہ کیا گیا تھا کہ حضور ﷺ کے وجودِ مسعود کے باوجود تنازعات تم کو کمزور کرنے کا باعث ہوں گے۔ یہ سنتِ الٰہی ہے۔ یہ ہدایت دائمی ہے۔ سوچ لیجیے کہ تنازعات اور تفرقہ بازی اُمت

کے لیے کتنی ہلاکت آفرین ہو سکتی ہے' اور فی الواقع ہو رہی ہے۔ اس تفرقہ بازی کا علاج بھی خود اللہ تعالیٰ نے اعتصام بالقرآن بتادیا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت اور احسان کا ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید اور ایمان و اسلام نے ان قبیلوں کو باہمی شیر و شکر اور بھائی بھائی بنا دیا جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اس طرح تباہی کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔

فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ﴾ ''اور ذرا یاد کرو اللہ کا جو انعام تم پر ہوا جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر اُلفت پیدا کر دی' پس تم اللہ کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے' (بس اس میں گرنے ہی والے تھے) تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔'' قرآن حکیم کا اعجاز یہی ہے کہ اس کے وقتی احکام میں ابدالآباد تک کے لیے ہدایات موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حالات کی اصلاح کے لیے ہی ان آیات کا نزول ہوا ہے اور ان میں ہمارے لیے پوری رہنمائی موجود ہے۔ ہم فی الواقع تفرقے اور انتشار کے تباہ کن اور ہلاکت خیز گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہم تباہی اور بربادی سے بچائے جا سکتے ہیں' لیکن اس کی شرط ہم کو پوری کرنی ہوگی۔ وہ یہ کہ ہم تقویٰ' اسلام اور اعتصام بالقرآن کو اپنا لائحہ عمل اور مقصود و مطلوب بنالیں۔ آخرت میں اللہ کی رضا کا حصول ہمارا نصب العین بن جائے۔

آگے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾﴾ ''اس طرح اللہ تمہارے سامنے اپنی نشانیاں واضح کرتا ہے' شاید کہ ان نشانیوں سے تمہیں اپنی فلاح کا راستہ سیدھا نظر آجائے۔'' ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں بھی یہ بات بڑی واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ تجدید ایمان' توبہ' تجدیدِ عہد اور اصلاحِ اعمال کی دعوت اس ملک میں وسیع پیمانے پر اُٹھنا انتہائی ضروری ہے جس کے کارکن خود بھی جاگیں اور لوگوں کو بھی جگائیں۔ فروعی اور جزوی مسائل کے خلاف تم ایک دوسرے سے

دست بگریباں ہو جبکہ حال یہ ہے کہ وہ پورا جہاز ڈوبنے کو ہے جس میں تم سب سوار ہو۔ کچھ لوگ بیدار ہو جائیں اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں' لیکن اس کے لیے محنت اور قوت صرف کرنی ضروری ہے۔

اگلی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت بیان کر کے اس کے مقاصد کی طرف واضح رہنمائی دی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾﴾ ''تم میں سے ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی اور خیر کی طرف بلانے والی ہو' جو بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ جو لوگ اجتماعی طور پر دعوت کا یہ کام کریں گے' وہی فلاح پائیں گے۔'' یہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت تو ایسی ہونی ضروری ہے جس کی تاسیس کسی فقہی مسلک پر نہ ہو بلکہ جس کا مقصد وجود دعوت الی الخیر ہو۔ اس کو نہ اقتدار مطلوب ہو نہ حکومت۔ اس جماعت کو دنیا میں کسی بدلے اور اجر کی خواہش نہ ہو۔ الغرض اس جماعت کا مقصدِ وجود و حیات اس ہدایتِ ربانی کے مطابق دعوت الی الخیر' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اس جماعت کے وابستگان بس یہی تین کام کریں' ان کے سوا کسی چوتھے کام کے خیال کو اپنے ذہن میں گزرنے بھی نہ دیں۔ وہ علی رؤس الاشہاد اعلان کر دیں کہ ہمیں انتخابی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہمارے نزدیک تو یہ پھندے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

الیکشن' ممبری' کونسل' صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

جو لوگ انتخابی سیاست سے اپنا دامن بچا کر پوری یک سوئی کے ساتھ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سہ نکاتی قرآنی منشور میں مصروف ہو جائیں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نوید جاں فزا ہے کہ ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾﴾ ''یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' جب کسی اُمت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو ایسے معاشرے میں تین طرح کے طبقات بن جایا کرتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو بگاڑ میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بگاڑ سے خود تو بچے ہوئے ہوتے

ہیں لیکن دوسروں کو روکتے نہیں' ان کو نصیحت کرنے میں تغافل شعاری اختیار کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو خود بھی بگاڑ سے مجتنب رہتا ہے' لوگوں کو روکنے کے لیے وعظ و نصیحت کرتا ہے اور اصلاحِ احوال کی سعی و کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اللہ کی سنت ہے کہ یہ تیسرا طبقہ عذابِ الٰہی سے بچا لیا جاتا ہے۔ اگر دنیا میں وہ کہیں اس کی لپیٹ میں آ بھی جائے تو آخرت میں وہ فلاح و فوز سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

ہم آج جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اور جو آنے والے واقعات کا واضح طور پر پیشگی پتہ دے رہی ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ سیاسی میدان میں دائیں بازو یعنی اسلام دوست حضرات کی ایک سیاسی جماعت ہو جبکہ جو لوگ یا جماعتیں اپنا مقصود و مطلوب دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کو بنانا چاہیں' وہ انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہو کر دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں لگ جائیں۔ تفرقے سے اپنا دامن بچائیں۔ فقہی مسالک کے اختلافات میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کریں۔ ورنہ اس بات کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ آنے والے دور میں اختلافات پر بحث و نظر تو ایک طرف اس ملک میں جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا' اسلام کا نام لینا ہی ناممکن بنا دیا جائے گا۔ آخر بخارا' بلخ' سمرقند اور تاشقند میں جو کبھی دینی علوم اور اسلامی تہذیب کے گہوارے تھے' یہ صورت حال رونما ہو چکی ہے۔ آج ہمارا پڑوسی مسلم ملک افغانستان بھی اس ابتلا میں گرفتار ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی شامت اعمال کی وجہ سے یہ دن ہم کو بھی دیکھنا پڑ جائے۔ خدانخواستہ یہ دن آیا تو نہ یہ فروعی اختلافات ہمارے کام آسکیں گے اور نہ ہی ہمارے حقیر سے ذاتی مفادات' ہمیں محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ یہ سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ بقول نظیر اکبر آبادی ؏ ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔''

وہ وقت سامنے نظر آ رہا ہے۔ دین و ملک کی بھلائی اور خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ لوگ اس عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں کہ ہمارا مرنا جینا اور ہماری محنت و کوشش صرف دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد کے لیے وقف ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے'

عرصہ پندرہ سولہ سال سے اسی کام میں لگا ہوں۔ اسی دعوت الی اللہ اور دعوت رجوع الی القرآن کے تقاضے کی ادائیگی کی خاطر یہاں تقریر اور خطبہ جمعہ کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ یہ میرا کوئی پیشہ نہیں۔ دروسِ قرآن کا سلسلہ بھی اسی دعوت کے لیے جاری کیا ہے۔ تجدید ایمان ہو اصلاحِ اعمال ہو دعوتِ توبہ اور تجدید عہد ہو وہ موثر ہو گی تو اسی قرآن مجید سے ہو گی۔ یہی سرچشمہ ومنبع ہدایت ہے۔ اسلامی اتحاد قائم ہو گا تو اسی کی بنیاد پر ہو سکے گا چونکہ قرآن ہی حبل اللہ ہے۔ اسی کام کے لیے مَیں نے ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن قائم کی تھی تاکہ علوم و حکمتِ قرآنی کی وسیع پیمانے پر نشرواشاعت ہو سکے۔ اسی کے لیے مَیں نے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی ہے جس کے مقاصد اوّلی دعوت تجدید ایمان توبہ اور تجدید عہد ہیں۔ اس کے نظام العمل میں طے کر دیا گیا ہے کہ الیکشن میں تنظیم کبھی حصہ نہیں لے گی اور نہ اس کے رفقاء اس میدان میں کام کریں گے۔ دعوت و اصلاح کا کام بڑا عظیم کام ہے۔ اس میدان میں کام کرنے کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں افراد چاہئیں جو اسی میں کھپ جائیں جن کا لائحہ عمل یہ ہو کہ ﴿يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ﴾۔ یہ بنیادی کام دراصل انہی لوگوں اور جماعتوں کے لیے مفید ترین اور انتہائی موثر ہو گا جو سیاست کے میدان میں اسلام کا کام کر رہے ہوں گے۔ اسی نہج سے کامیابی کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں ورنہ جس طرح اب تک کی تمام کوششیں لاحاصل رہی ہیں اسی طرح آئندہ کی محنتیں اور کوششیں نسیاً منسیا ہو جائیں گی۔ جن حضرات کو میری بات نے اپیل کیا ہو اب ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو آگے پہنچائیں۔ دائیں بازو کے سیاسی زعماء کے پاس جائیں ان کو ایک سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت پر قائل کریں۔ ان سے دردمندانہ اپیل کریں کہ وہ انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنی تمام مساعی کا ہدف دعوت وتبلیغ اور اصلاح معاشرہ کو بنائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ اِنَّهٗ تَعَالٰى جَوَّادٌ كَرِيْمٌ مَلِكٌ بَرٌّ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

***

مجلس شوریٰ میں شمولیت

* خطاب جمعہ' مسجد دار السلام (۱۵ جنوری ۱۹۸۲ء)
* ''میثاق'' مارچ ۱۹۸۲ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی: اَمَّا بَعْدُ:
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۭ﴾ (المائدۃ:۲)

وَعَنْ اَبِیْ رُقَیَّۃَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِیِّ رضی اللہ عنہ :
اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ : ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ)) (رواہ مسلم)
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : ((اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا))

آج مجھے مجلس شوریٰ میں اپنی شرکت کے ضمن میں اپنا موقف وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے رکھنا ہے۔ یہ آپ کا بھی حق ہے اور میرے مخلصین' معاونین اور مجھ سے ہمدردی رکھنے والوں کا بھی حق ہے کہ اس معاملے میں ان کو نفیاً یا اثباتاً جو تشویش ہوئی ہے' اس کے متعلق مَیں اپنی رائے ان کے سامنے رکھ دوں۔ آپ بھی حتی الامکان کوشش کریں کہ پہلے سے طے شدہ رائے اور خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور جو باتیں مَیں اس وقت گوش گزار کرنے والا ہوں ان پر غور کریں۔ اس کے بعد جو رائے آپ کی ہوگی اور جو رہنمائی بھی آپ میری فرما سکیں گے' مَیں خود بھی اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں' چاہے وہ مشورہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی شکل میں۔

اسلامی تحریک کی بنیاد

سب سے پہلی بات جس کی طرف آپ کی توجہ منعطف ہو یہ ہے کہ یقیناً میرے کچھ نہ کچھ سماجی' سیاسی اور معاشی نظریات ہیں۔ زیادہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ میرا اپنا مطالعہ ہے قرآن حکیم کا اور اسلام کا' جس کی رو سے میری ایک رائے ہے کہ اسلام کا سماجی نظام کیسا ہونا چاہیے' عائلی نظام کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے اور اسلام کی معاشی اور سیاسی تعلیمات کیا ہیں!

گزشتہ ایک سال کے دوران مَیں ان تینوں موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں۔ اپنے سفر امریکہ سے پہلے مَیں نے ''اسلام کا معاشی نظام'' یا ''قرآن حکیم کی معاشی تعلیمات'' کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ امریکہ سے واپسی کے بعد ''اسلام کے سیاسی نظام'' کے موضوع پر چھ خطباتِ جمعہ میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد چار یا پانچ خطباتِ جمعہ میں اسلام کے عائلی یا معاشرتی نظام پر سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں۔ یہ میرے ذاتی نظریات نہیں ہیں بلکہ قرآن حکیم' سُنّت نبوی ﷺ سے اُخذ ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مَیں ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد نظریے کے حق میں کوئی تحریک لے کر اٹھوں اور اس کو اپنی جدّ و جہد کا ہدف بنالوں۔

مثال کے طور پر مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ''پردہ'' قرآن اور سُنّت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ خواتین اور مردوں کا جداگانہ دائرہ کار اسلام کی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول ہے۔ لیکن اس ایک issue کو اپنی تمام جدّ و جہد اور توانائیوں کا ہدف بنا لینا مَیں مناسب نہیں سمجھتا —— جس طرح ایک بزرگ دینی جذبے کے تحت قینچی ہاتھ میں لے کر بے پردہ عورتوں کی چوٹیاں کاٹا کرتے تھے۔ یہی ان کی جدّ و جہد کا ہدف تھا اور یہی جہاد کرتے کرتے وہ جیل میں پہنچ گئے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی بھی سماجی یا تہذیبی برائی کو اپنی جدّ و جہد کا موضوع بنا کر کوئی تحریک اٹھائیں اور تمام محنت اُس پر صَرف کر دیں' لیکن میرا یہ طریق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک ان تمام خرابیوں کی ایک جڑ ہے۔ جب تک اس جڑ پر وار نہ ہوگا اور اس بنیاد میں تبدیلی نہ ہوگی تو شاخوں اور پتوں کی تراش

خراش کرانا سعیٔ لاحاصل ہوگا۔ لہٰذا جہاں تک کسی نظریہ کو بیان کرنے کا تعلق ہے' وہ بغرض تفہیم ضرور بیان کروں گا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے' اس کا سیاسی نظام کیا ہے'، اس کو بیان کرنے میں مَیں ہرگز کسی مداہنت سے کام نہ لوں گا۔ اپنے دوستوں کا خیال یا زمانے کے چلن کا خیال میری زبان پر تالا بن کر نہ پڑ سکیں گے۔ البتہ جہاں تک میری جدّ و جُہد کا' میری کوشش کا اور اپنی توانائیوں کو مرتکز کرنے کا ہدف ہے وہ ان شاء اللہ وہی رہے گا جس کو مَیں نے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا ہے۔

اسی طرح میرے نزدیک قرآن مجید کی معاشی تعلیمات کے ضمن میں سود بہت بڑی برائی ہے جس نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مَیں اس کی مذمت حسبِ موقع ضرور کروں گا۔ اسی طرح مزارعت میرے نزدیک حرام ہے۔ مَیں اپنی یہ رائے پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کے اس فتویٰ پر مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل درست ہے جس میں امام اعظمؒ نے مزارعت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ جان لیجیے کہ اس بنیاد پر بھی مَیں کسی تحریک کو اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ نہ اب تک کوئی تحریک اٹھائی ہے اور ان شاء اللہ نہ آئندہ اٹھاؤں گا' لیکن اس ضمن میں اپنے مطالعہ قرآن و سُنّت سے جو بات میرے سامنے آئی ہے اُس کے بیان کرنے میں کسی قسم کی کوئی مداہنت اختیار نہیں کروں گا۔ یہ ملک بنیادی طور پر جاگیرداروں اور زمینداروں کا ہے اور یہاں اس شخص کے لیے سانس لینا مشکل ہو جائے گا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ مزارعت حرام ہے۔ اس ملک کی اصل معیشت زرعی ہے اور اس بارے میں عام دستور کے بالکل خلاف اس قدر بڑی رائے رکھنا حالات کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے' لیکن مَیں حالات کے تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنے فیصلے نہیں کیا کرتا بلکہ میرے فیصلے الحمد للہ صرف اس بنیاد پر ہوتے ہیں کہ قرآن حکیم اور سُنّت نبوی کی تعلیمات کیا ہیں! ع

مَیں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بایں ہمہ مَیں اس مسئلے پر بھی تحریک اٹھانے کو صحیح نہیں سمجھتا اس لیے کہ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ اگر اس نوعیت کی کوئی تحریک چلائی جائے تو اُس کا تمام فائدہ

کمیونسٹوں کو پہنچے گا۔ اگرچہ میرے اور اُن کے درمیان ایک جزوی اتفاق ہے لیکن مَیں یہ نہیں چاہتا کہ اس کا سارا نفع وہ قوتیں لے جائیں اور فصل وہ کاٹیں جو یہاں سوشلزم اور کمیونزم کے لیے جدّوجہد کر رہی ہیں۔ ان کا بنیادی نقطہ نظر خالص مادہ پرستانہ ہے' انہیں دین سے کوئی سروکار نہیں ہے اور ایمان کے بنیادی حقائق کے بارے میں ان کا کوئی مثبت طرزِ عمل نہیں ہے۔

اسی طریقے پر میرے سیاسی نظریات بھی ہیں۔ مَیں نے برملا کہا ہے کہ عہدِ حاضر میں جس کو جمہوریت کہا جاتا ہے اور جس کی بنیاد ہے عوامی حاکمیت' یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اگر اس بنیاد کو نکال دیا جائے اور popular sovereignty کی بجائے Divine sovereignty یعنی حاکمیتِ الٰہیہ کی بنیاد پر پورا نظام عوامی خلافت (popular vicegerency) کے اصول پر قائم کرنا مطلوب ہو تو میرے نزدیک یہی دین کا تقاضا ہے۔ **أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** کا تقاضا بھی اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ حکومت کو بنانے اور اس کے نظام کو چلانے میں یہاں کے بسنے والوں کی رائے کو عمل دخل ہو اور یہ نہ سمجھا جائے کہ کوئی ایک طبقہ' خاندان یا گروہ ہم پر حکمران ہے اور ہمارے سیاسی حقوق پر ڈاکا ڈالا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں مَیں تفصیل کے ساتھ عرض کر چکا ہوں' لیکن اس کے باوجود مَیں کسی بحالی جمہوریت کی تحریک میں نہ کبھی پہلے شریک ہوا ہوں اور نہ آئندہ شریک ہوں گا۔ اس لیے کہ اس ضمن میں اگر کوئی کوشش ہوگی تو وہ سیکولر ڈیموکریسی کا ذہن رکھنے والے حضرات کی تقویت کا موجب ہوگی۔ ان لوگوں کے ہاں دین زندگی کے ایک گوشے میں علیحدہ سے رکھی جانے والی کوئی چیز ہے اور اُس کا عمل دخل بھی محدود ہے۔ اصل میں ان کے ذہن میں لادینی جمہوریت یا قومی جمہوریت کا تصور ہے۔ میرے نزدیک اس قسم کی کوئی تحریک خواہ وہ ایوب خان کے دور میں اٹھی ہو خواہ بعد میں' درست نہیں تھی اور مَیں نے ان میں سے کسی میں بھی قولاً یا عملاً کوئی حصہ نہیں لیا۔

جس وقت صدر ایوب کے خلاف مہم چلی ہے تو ڈاکٹر مبشر حسن صاحب اور جناب حنیف رامے نے ابتدائی کام کرنا شروع کیا تھا۔ بھٹو صاحب تو میدان میں بہت بعد

میں آئے۔ مَیں انہی دنوں لاہور منتقل ہوا تھا تو ان حضرات نے مجھ سے بھی اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا۔ مَیں چونکہ دورانِ طالب علمی اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک فعال کارکن تھا اس لیے ان حضرات نے مجھے دعوت دی کہ آؤ اور ہمارے ساتھ کام کرو۔ مَیں نے اُن سے عرض کر دیا تھا کہ میرا کام یہ نہیں ہے۔ میری ترجیحات کچھ اور ہیں۔ مَیں کسی اور کام میں اپنی توانائیاں صَرف کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آیا اور اس میں بھی تحریک اٹھی لیکن مَیں نے اس میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس زمانے میں کسی شخص کا ''نظام مصطفیٰؐ'' کی تحریک کے متعلق کوئی منفی بات کرنا نہایت مشکل کام تھا لیکن الحمدللہ کہ مَیں نے اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ یہ نظام مصطفیٰؐ کی تحریک نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ غلط نام تجویز کر دیا گیا ہے۔ یہ اصلاً ''بحالیٔ جمہوریت'' کی تحریک ہے۔ اس میں سیکولر لوگ بھی شامل ہیں' اس میں leftist بھی شامل ہیں اور کمیونسٹ بھی۔ لبرل مسلمان بھی ہیں جو جلسہ عام میں کھڑے ہو کر برملا کہتے ہیں کہ ''نماز مَیں بھی نہیں پڑھتا۔'' دوسری طرف اس میں علمائے دین بھی ہیں۔ گویا یہ ایک مستبد حکمران سے نجات حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اس کو ایک دینی تحریک قرار دے کر لوگوں کو exploit کرنا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ اگر بحالیٔ جمہوریت کے لیے کام کرنا مقصود ہوتا تو مَیں اُس وقت ہی میدان میں آجاتا لیکن میرے پیش نظر ''دوسرا'' کام مقدم تھا۔

اسی طرح کافی عرصے سے میری رائے یہی ہے کہ مارشل لاء کا تسلسل ملک وملت کے لیے انتہائی مہلک ہے اور اس کے بڑے دُوررَس مضر اثرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ''مارشل لاء ہٹاؤ'' کی تحریک اور ''جمہوریت بحال کرو'' کی تحریک اٹھانا نہ میرے پیش نظر ہے اور نہ میرے اُس مزاج سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے جو مطالعہ ٔ قرآن وسُنّت سے بنا ہے۔ لہٰذا اگر آپ میرے موقف کا خلاصہ سمجھنا چاہیں تو وہ یوں ہوگا کہ:

''میرے کچھ سماجی نظریات بھی ہیں' میرے کچھ معاشی نظریات بھی ہیں' میرے کچھ سیاسی نظریات بھی ہیں۔ زیادہ صحیح تر الفاظ میں میرا قرآن حکیم اور سُنّت نبوی کا جو مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میرا ایک نظریہ بنا ہے کہ اسلام کی سماجی تعلیمات کیا

ہیں' اسلام میں معاشرے کو کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے' اسلام کی معاشی اور سیاسی تعلیمات کیا ہیں اور ہماری حکومت کے ڈھانچے کو کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ تاہم مَیں ان میں سے کسی issue کو موضوع بنا کر اپنی توانائیوں' قوتوں کو اور اپنے اوقات کو اس ہدف پر مرتکز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ میرا ایک اور نقطۂ نظر ہے جس پر میں سولہ سترہ سال سے کام کر رہا ہوں۔''

ترجیحات کا معاملہ

ہر شخص کی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں اور جس شخص کی نہیں ہیں' وہ زندگی میں کوئی مفید کام نہیں کر سکتا۔ وہ شخص حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ کبھی اُدھر اور کبھی اِدھر۔ ایک زوردار لہر آئے گی وہ اس کو کسی تحریک میں بہا کر لے جائے گی' کوئی دوسری زبردست لہر آئے گی وہ اسے کسی دوسری سمت میں لے جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ہی چہرے بدل بدل کر کبھی مسلم لیگ میں ہوتے تھے' کبھی ری پبلکن پارٹی میں۔ کوئی اور دور آیا تو یہی لوگ یا ان کے قریبی ساتھی یا عزیز کنونشن لیگ میں آ گئے۔ اس کے بعد زمانہ بدلا تو یہی لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ تھے۔ اب انہی میں سے ایک خاصی تعداد مجلس شوریٰ میں بھی بیٹھی نظر آ رہی ہے۔ ان حضرات کی بھی ترجیحات ہیں اور وہ ہیں ''اپنے مفادات اور ان کا تحفظ'' یا پھر ''ان کی چودھراہٹ اور اس کی بقا''۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نظام میں ان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہے اگر ان کے تعلقات حکومتِ وقت کے ساتھ نہ ہوں اور بیوروکریسی کے ساتھ ان کے مراسم اور میل جول نہ ہوں۔ انہیں زندہ رہنا ہے اور ان کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ زندگی میں وہ جتنے بھی آگے بڑھ سکیں اور جو زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کی جا سکیں وہ حاصل کی جائیں چاہے حکومتِ وقت کوئی بھی ہو کس باشد۔ یہ ہیں ان حضرات کی ترجیحات یعنی priorities۔

میری ترجیحات

میری ترجیحات بالکل معین ہیں' الحمد للہ۔ اس میں اولین ترجیح ''دین'' ہے۔ میری تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اس اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے وقف ہیں جس نے

مجھے ان سے نوازا ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام)

"بے شک میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔"

اس کا فیصلہ مَیں نے اپنی عملی زندگی کے آغاز پر کیا تھا۔ میرے اس دور کی تحریریں بھی اس کی گواہ ہیں کہ یہ ایک شعوری فیصلہ تھا۔ پروفیشن (ذریعہ معاش) ثانوی درجے میں ہوگا' مقدم ہر حال میں اللہ اور اس کا دین رہے گا۔ زمانۂ طالب علمی میں میرا تعلیمی ریکارڈ بہت سے طالب علموں کے لیے قابل رشک ہوسکتا ہے۔ میرے پاس ایک وقت میں دو دو وظیفے بھی رہے ہیں۔ ایک وظیفہ ایف ایس سی کی بنیاد پر تھا اور دوسرا میڈیکل کالج کے فرسٹ ایئر میں اوّل آنے کی بنیاد پر۔ البتہ جب مَیں نے اپنی ترجیحات معین کیں تو پھر دین کے لیے بھاگ دوڑ اوّلین درجے میں تھی اور میڈیکل کی تعلیم ثانوی حیثیت میں۔ ظاہر ہے ایسے میں تعلیم کا معاملہ وہ نہ رہا اور اس میں کافی کمی رہ گئی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تعلیمی دور میں failure کے داغ سے بچائے رکھا۔ زمانہ طالب علمی کے بعد جب پروفیشن میں آیا ہوں تو ایک دن کے لیے بھی یہ بات نہیں ہوئی کہ پیشہ مقدم رہا ہو اور دین اس کے تابع ہو' الحمد للہ۔ یا یہ کہ اپنے پروفیشن کی مصروفیات کے بعد جو وقت بچے گا وہ دین کے لیے لگ جائے گا۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ اصل فرض دین کا ہے' باقی تمام مصروفیات اس کے تابع ہیں۔ زندگی میں جسم اور جان کا تعلق قائم رکھنے کے لیے جو کچھ ناگزیر ہے' اس سے زائد کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ کسی پیشہ کے کھونٹے سے بندھے رہنے کو اوّلیت حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دین کی خدمت بھی ہو جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل کھونٹا تو اللہ کا کھونٹا ہے اور اس کے رسول ﷺ کا کھونٹا ہے جس سے بندھے رہنا فرض ہے' باقی ہر شے جو بھی ہے وہ ثانوی درجے میں ہے۔

میری خوش بختی

مجھے بہت خوش بختی اور خوش قسمتی کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات

پیدا فرما دیے کہ مجھے اس سرزمین میں پہنچا دیا جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کے لیے اگر بنیاد ہے تو دین۔ اس کے قائم رہنے کا جواز اگر ہے تو دین کی بنیاد پر۔ اگر اس کے استحکام کا کوئی امکان ہے تو دین کی بنیاد پر۔ لہٰذا اگر دین کے لیے مَیں اپنی صلاحیتیں صرف کرتا ہوں تو مجھے پورا اطمینان ہوتا ہے کہ مَیں اپنے ملک اور اپنی قوم کے حقوق بھی ادا کر رہا ہوں اس لیے کہ ہماری قوم وملت کی بنیاد بھی اسلام پر ہے۔ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!

مَیں پاکستان کو وطن سمجھ کر اور وطن پرستی کے تصور کے تحت محنت اور سعی نہیں کر رہا بلکہ اس کو اسلام کا قلعہ سمجھ کر اور اس وجہ سے کہ اس سرزمین سے ہمیں بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں' کام کر رہا ہوں۔ اس وطن کا تحفظ مجھے اس لیے عزیز ہے کہ یہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ ہے۔ ؎

اے آندھیو! سنبھل کے چلو اس دیار میں
اُمید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

یہ ملک اس نعرہ پر لیا گیا تھا کہ ہمیں یہاں اسلام کا نفاذ کرنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے لیے اسلام کے سوا اور کوئی بنیاد موجود ہی نہیں ہے۔ اس کا استحکام تو دُور کی بات ہے' اس کی بقا کا کوئی امکان نہیں ہے بغیر اسلام کے۔ مَیں مطمئن ہوں کہ اگر مَیں دین کے لیے کام کر رہا ہوں تو اسی ذیل میں ملک وملت کے جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں' وہ بھی ادا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے اس ایک کام یعنی خدمت دین پر مجتمع ہو جانے کو مَیں اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

اصل جڑ

اس ضمن میں بھی میری ایک معین اور پختہ رائے ہے کہ ہماری اصل کوتاہی ایمان کی کمی ہے۔ مجھے اس شہر لاہور میں کام کرتے ہوئے سولہ برس ہو چکے ہیں۔ مَیں دین کے لیے یہ درست نہیں سمجھتا کہ ہر چلنے والی تحریک کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ چار آدمی مل کر

اگر کوئی بڑا سا نعرہ لگا دیں اور لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیں تو مَیں بھی ان کے پیچھے لگ جاؤں۔ الحمدللہ' ثم الحمدللہ کہ میری زندگی کا یہ عرصہ ایک کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہے۔ بہت سی تحریکیں اٹھی ہیں اور ایسے دور آئے ہیں کہ انسان میں اگر کوئی لیڈری کی سوئی ہوئی خواہش موجود ہو تو پوری کر لے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہے تو دھو لے۔ دُنیوی مفادات اگر مطلوب ہوتے تو اس کے امکانات اور مواقع بہت آئے لیکن میرا معین لائحہ عمل ہے کہ اصل کمی ایمان کی ہے۔ جب تک revival of faith یعنی تجدیدِ ایمان نہیں ہوگی اسلام کے لیے کوئی مفید کام یہاں نہیں ہوسکتا' کوئی پائیدار نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ تحریکوں' جلوسوں اور ہنگاموں سے اسلام کی تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اسلام کا نعرہ لگا کر اور الیکشن کے میدان میں اتر کر اگر کسی کو اسلام کی خدمت کرنے کا خیال ہے تو میرے نزدیک وہ جنت الحمقاء (Fool's Paradise) میں بس رہا ہے۔ اس راستے سے کبھی یہاں اسلام کا حقیقی اور مستحکم کام نہیں ہو سکے گا۔ اسلام کے کام کے لیے ایک ہی طریق کار ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کا منبع اور سرچشمہ دراصل قرآن مجید ہے لہٰذا اس کی طرف لپکو' اس سے تمسک کرو' اس سے اعتصام کرو' قوم کو قرآن کی طرف متوجہ کرو تاکہ ان کے دلوں میں قرآن کی عظمت قائم ہو۔ لوگ اس کو سمجھنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو ایمان کی تجدید اور ایمان کو تقویت حاصل ہوگی۔ اسی قرآن کے ذریعے قلوب واذہان میں ایمان راسخ ہوگا۔ سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال میں انقلابی تبدیلی رونما ہوگی۔ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

لہٰذا جب یہ جڑ مضبوط ہو جائے گی تو جو برگ و بار آئیں گے وہ پائیدار ہوں گے۔ مثلاً

﴿كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ (۲۴)

(ابراھیم) ''کلمہ طیبہ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک پاکیزہ درخت' اس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔'' اگر کوئی شخص اپنے اخلاصِ نیت کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ جلوس اور ہنگاموں سے اسلام کا نفاذ ممکن ہے تو اس کے اپنے خلوص کا معاملہ ہے اور میری

دعائیں بھی اس کے ساتھ ہوں گی لیکن مَیں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ طریقہ صرف یہی ایک ہے۔ یہی ہے وہ نقطہ نظر جس کو مَیں نے ۱۹۶۷ء میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ والے مضمون میں پیش کیا تھا۔ جب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب اور حنیف رامے صاحب میرے پاس آئے تھے کہ ہمارے ساتھ کام کرو تو مَیں نے اپنا یہ مضمون ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' ان کو تھما دیا تھا اور ان سے عرض کیا تھا کہ جو حقیر سی قوتیں اور صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہیں وہ صرف اس کام کے لیے وقف ہیں اور میرے پیش نظر جو کام ہیں وہ اس مضمون میں مَیں نے بیان کر دیے ہیں۔

اگرچہ مَیں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت ہونی چاہیے لیکن مَیں اس کو اپنی توانائیوں کا اصل ہدف نہیں بنا سکتا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ معاشی ناانصافیاں دُور ہونی چاہئیں لیکن مَیں صرف معاشی انصاف کی بحالی کو ایک تحریک کی شکل میں لے کر چلنے والوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اسی طرح سماجی معاملات میں بھی میرے نظریات ہیں اور مَیں اپنی جگہ ان پر پوری طرح کاربند ہوں۔ مَیں نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی ایسے نکاح میں شریک نہیں ہوں گا جو مسجد میں نہیں ہوگا۔ الحمدللہ' مَیں دس برس سے زائد عرصے سے اس پر قائم ہوں اور اس کی وجہ سے ایک تحریک چل نکلی ہے اور نکاح مساجد میں ہو رہے ہیں۔ میرا اپنے اُن قریب ترین دوستوں کے ہاں آنا جانا نہیں ہے جن کے ہاں پردہ نہیں ہے' اس لیے کہ اگر اُن کا سماجی ڈھانچا کچھ اور ہے اور میرا کچھ اور تو معاملہ اس نہج کا نہیں ہو سکتا جس نہج کا یک رنگی اور یکسانی رکھنے والے حضرات کے مابین ہوتا ہے۔ اپنے نظریات پر جو مَیں نے قرآن و سُنّت سے اخذ کیے ہیں' مَیں الحمدللہ ثم الحمدللہ قائم ہوں۔ مَیں نے اپنی بچیوں کو سکول تک نہیں بھیجا' کالج تو دُور کی بات ہے۔ ان کی پڑھائی کا انتظام مَیں نے اپنے گھر میں کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے امور اصلاح طلب ہیں لیکن ان میں کسی چیز کو بھی کوئی تحریک بنا کر کھڑا کر دینا مَیں صحیح نہیں سمجھتا۔ میری priority نمبر ایک ہے دین اور احیائے اسلام۔ اس ضمن میں مَیں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اس کام کے ذریعے میرے ملک وملت کے فرائض بھی ادا ہو رہے ہیں۔ سولہ برس ہو گئے ہیں' مَیں نے

اپنی زندگی کا بہترین دور اس میں لگایا اور کھپا دیا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے' علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ گویا بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ﴾

(یوسف :۱۰۸)

''اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ یہ ہے میری راہ۔ مَیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں اپنی بصیرت کے مطابق اور وہ بھی جس نے میری پیروی کی۔''

پس جو کام مَیں کر رہا ہوں' لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہوں۔ میرے ساتھی بھی اسی کام میں میرے مددومعاون ہیں اور اس کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ یہ ہے میرا اصل لائحہ عمل۔ اسی میں میری صلاحیتیں لگ رہی ہیں۔

یہ کام جو مَیں کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں' یہ کسی خلا میں نہیں کر رہا۔ ایسا کام کسی ماحول میں ہوتا ہے' جہاں کوئی نظام پہلے سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کے ساتھ انسان کا رویہ کیا ہوگا' اس حوالے سے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی ہدایات ہیں جو قرآن حکیم سے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سُنّت سے ملتی ہیں۔

غیر مسلم ماحول میں کام کا منہج

اگر کوئی شخص یہ کام خالص غیر اسلامی ماحول اور غیر مسلم ملک میں کر رہا ہو تو وہاں طریق کار خالص انقلابی ہوگا۔ انقلابی طریق کار سے مراد یہ ہے کہ اُس نظام سے کسی درجے میں کوئی تعاون نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ وہ نظام کفر پر قائم ہے۔ کفر ہی اس کی جڑ اور بنیاد ہے اور کفار ہی اس نظام کے چلانے والے ہیں۔ کافروں کی اکثریت وہاں آباد ہے تو ایسے ماحول میں مسلمانوں کے تعاون کا کوئی سوال نہیں ہے۔ وہاں تو تصادم ہی تصادم ہوگا۔ تصادم سے مراد یہی نہیں ہے کہ جنگ ہی ہو' بلکہ اس کی ایک شکل وہ بھی ہے جس کو passive resistance کہتے ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کو عام کرنے کے لیے آپ ہمہ تن لگے ہوئے ہیں۔ ماحول کی طرف سے جو تشدد ہو رہا ہے اسے آپ جھیل بھی رہے ہیں اور برداشت بھی کر رہے ہیں۔ اس غلط ماحول کے ساتھ آپ کسی درجے میں بھی کوئی

تعاون نہیں کر رہے ہیں اور کسی بھی تشدد یا دباؤ کے باوجود آپ اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ یہ بھی تصادم کی ایک شکل ہے' چاہے ہاتھ میں تلوار نہ ہو اور جنگ نہ ہو رہی ہو۔ اس ماحول میں آپ اپنے ہم خیال اور اپنے نظریہ کے حامی لوگوں کو جمع کریں گے' ایک منظم طاقت پیدا کریں گے اور وقت آنے پر اور قوت کے فراہم ہو جانے پر مسلح تصادم (armed conflict) کا مرحلہ بھی آئے گا۔ یہ ہوگا ایک خالص انقلابی طریق کار جو اس ماحول میں ہوگا جہاں پر اکثریت بھی کافروں کی ہو' کافر ہی حکمران بھی ہوں اور پورا کا پورا نظام بھی کفر پر مبنی ہو۔

مسلمانوں کے ملک میں کام کا نہج

اگر ملک مسلمانوں کا ہو' حکمران مسلمان ہوں تو ایسی صورت میں ہمارے طرزِ عمل میں زمین آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ ہمارے پاس حضور اکرم ﷺ کی واضح تعلیمات موجود ہیں کہ اگر حاکم مسلمان ہو اور وہ کفر بواح کا حکم نہ دے تو اس کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ آپ حکمران پر اور اُس نظام پر تنقید کر سکتے ہیں' مشورے دے سکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو "قول حق عند سلطان جائر" کی توفیق دے گا تو یہ افضل الجہاد ہوگا لیکن اس حکومت کے خلاف بغاوت' محاذ آرائی (confrontation) کی پالیسی اور مسلح تصادم ہمارے دین کی تعلیم نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ چیزیں سب کے سامنے نہیں ہیں۔ اگر ہمارے ہاں دینی کام ہوتا ہے تو وہ "نور و بشر" کے جھگڑے پر ہوتا ہے جو نہ چُک سکا ہے اور نہ چکے گا' رفع یدین جائز ہے یا نہیں' آمین بالجہر کہنا درست ہے یا نہیں .. خوب دھواں دار تقاریر ہوتی ہیں تو اس پر یا اگر کوئی کام ہوتا ہے تو وہ خالص سیاسی حزب اختلاف کے طرز پر ہوتا ہے اور ہر قائم حکومت کی ٹانگ گھسیٹنی مقصود ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اس میں اعتدال کی راہ اور معتدل طرزِ عمل ہمارے سامنے نہیں رکھا جاتا۔

حاصل بحث

مختصراً یہ کہ اگر کافر حکومت ہے اور نظام کافرانہ چل رہا ہے تو اس میں وہ طرزِ عمل اختیار کرنا پڑے گا کہ Armed Conflict تک نوبت پہنچ جائے۔ یہ اس کی انتہا ہو

گی۔ اگر حکومت مسلمانوں کی ہو اور اکثریت بھی مسلمانوں کی ہو' چاہے حکمران فاسق و فاجر ہو تو قانونی طور پر معاملہ مختلف ہو گا۔ وہ شخص مسلمان ہے چاہے وہ نماز نہ پڑھتا ہو اور اس کا کردار بھی مؤمنانہ نہ ہو۔ ذرا غور کیجیے کہ آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کتنی کچھ چھان پھٹک کرتے ہیں کہ لڑکے کی کمائی جائز ہے یا اس میں حرام بھی شامل ہے؟ رشتہ تو آپ صرف اس بنیاد پر کر دیتے ہیں کہ لڑکا مسلمان ہے' چاہے فاسق اور فاجر ہو۔ معلوم ہوا کہ قانونی طور پر مسلمان ہونے سے ایک بہت بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی قانونی طور پر مسلمان ہو گیا تو گویا اس کی جان اور مال بالکل محفوظ ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے تو حضرت اُسامہؓ سے وضاحت طلب کر لی تھی۔ ایک غزوہ کے موقع پر حضرت اُسامہؓ نے ایک کافر کو گرا لیا اور اسے قتل کرنا چاہتے تھے کہ اُس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے صرف اس خیال سے کہ اُس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے' اُس کو قتل کر دیا۔ اس کی خبر بعد میں حضور ﷺ کو ہو گئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اے اسامہ! اللہ کو قیامت کے دن کیا جواب دو گے جب کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا؟'' تو ذہن میں رکھیے کہ قانونی طور پر مسلمان ہونے سے زمین آسمان کا فرق واقع ہوتا ہے۔

اسی طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام مناسب نہیں تھا اگرچہ مبنی برخلوص تھا' اس لیے کہ جناب یزید کافر نہیں تھے۔ کون ہے وہ شخص جو یہ کہہ سکے کہ یزید کافر تھے؟ جناب یزید نے صحابہ کرامؓ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ان کی امامت میں بڑے بڑے صحابہ نے نمازیں ادا کی تھیں۔ حضرات حسنینؓ یعنی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے ان کی سپہ سالاری میں جنگ لڑی ہے۔ میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ نے خواہش کر کے اس جنگ میں حصہ لیا تھا جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئی تھی' اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ لشکر جو قیصر روم کے دار الحکومت پر سب سے پہلے حملہ آور ہو گا ان سب کی مغفرت ہو چکی ہے۔ اس لشکر کے سپہ سالار کون تھے؟ وہی جناب یزید بن معاویہؓ جن کے نام کو لوگوں نے گالی بنا دیا ہے۔

ذرا سوچیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت حسینؓ کے ساتھ کیوں شامل نہیں تھے جب وہ کوفہ کے لیے مکہ مکرمہ سے نکلے ہیں! کیا وہ قرآن اور حدیث رسولؐ سے واقف نہیں تھے؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وہ ہیں جن کو ہم حِبرُ الاُمّۃ (اُمت کا سب سے بڑا عالم) کہتے ہیں اور جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی تھی کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ (اے اللہ! ان کو دین میں تفقہ عطا فرما)۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا رد کر دی تھی! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ آپؐ کی تو صرف ایک ہی دعا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا اور اس دُعا کے الفاظ ہیں: ((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا)) (رواہ البخاری) "میری بڑی تمنّا ہے کہ مَیں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور شہید ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر شہید کیا جائے' پھر زندہ کیا جائے' پھر شہید کیا جائے' پھر زندہ کیا جائے' پھر شہید کیا جائے' پھر زندہ کیا جائے۔" یہ دعا اس لیے قبول نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک تو آپؐ خاتم الرسل ہیں' یعنی آپؐ کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔ دوسرے' رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اصول ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہوں گے' ان کو لازماً غلبہ حاصل ہوگا یا وہ قوم جس کی طرف رسول بھیجا جائے وہ ہلاک کر دی جائے گی۔ باقی یہ ناممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی دعا کی ہو اور وہ بارگاہِ خداوندی سے ردّ کر دی گئی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جن سے ہماری احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ مروی ہے' وہ بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ نہ نکلے۔ غور کیجیے کہ یہ دونوں حضرات یعنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کیا معاذ اللہ بزدلی کی وجہ سے حضرت حسینؓ کے ساتھ نہ نکلے! یہ بات بدقسمتی سے ہمارے ذہنوں میں بٹھا دی گئی ہے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! یہ سب کچھ صرف اس اختلاف کی وجہ سے تھا کہ چونکہ جناب یزید کسی کفر کا حکم نہیں دے رہے تھے' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول موجود تھا کہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف بغاوت اور خروج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کفر کا حکم نہ دے۔ اسی لیے ان دونوں حضرات رضی اللہ عنہما نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہ دیا۔ ان دونوں حضرات نے جناب

یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی اس وجہ سے کہ ولی عہدی کی بیعت کو وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ جب ان کی حکومت قائم ہو گئی اور بیعت خلافت ہو گئی تو اب ان کے خلاف خروج کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے بھی بیعت خلافت کر لی تھی۔ یہ تھا اصل اختلاف جس کے اوپر نہ جانے کیا کیا نمک مرچ لگا کر ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بدظن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے نزدیک حضرت حسینؓ کا اقدام خالص خلوص پر مبنی اور جذبہ ایمانی کے تحت تھا۔ میں اس سے پہلے حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ میرے نزدیک ان کا قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کو قانونی تعلیمات سے خلط ملط (confuse) کرنا درست نہیں تھا' حالانکہ اُن کے زہد کا عالم یہ تھا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يَسُرُّهُ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى زُهْدِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى صَاحِبِىْ اَبِىْ ذَرٍّ))

''اگر کسی کو خواہش ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو میرے اس دوست ابوذرؓ کو دیکھ لے۔''

البتہ خطا ہو سکتی ہے' اور یہ خطائے اجتہادی ہوتی ہے جس کو ہم گناہ نہیں کہتے بلکہ اس پر ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ حضرت حسینؓ نے یقیناً خلوص اور اخلاص کے ساتھ اسلام کے لیے جان دے دی ہے اور انہوں نے شہادت کا تاج اپنے سر پر پہنا ہے۔

یہ چند مثالیں دے کر میں پھر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں مسلمان حاکم ہو اور وہ کفر کا حکم نہ دے تو اس کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اس معاملے میں جو طرزِ عمل ہو گا' اب میں وہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

مسلمان حکمرانوں کے ساتھ صحیح طرزِ عمل

خلافت راشدہ ہمارا آئیڈیل نظامِ حکومت تھا جو ہر لحاظ سے کامل تھا۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں کا دور آیا اور اسے ہم خلافتِ راشدہ میں شمار نہیں کرتے۔ اصولاً اس دور میں بعض لحاظ سے کمی آ گئی۔ ہم معاذ اللہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اسلام ختم ہو گیا تھا (اس کو میں تمثیلاً یوں بیان کرتا ہوں کہ چھ منزلہ عمارت کی ایک منزل گر گئی)۔ اُس وقت کے حکمران

آج کے بڑے بڑے علماء اور صوفیاء سے بڑھ کر مومن تھے۔ عبدالملک بن مروان اپنے عہد کے بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ بنواُمیہ کا دور خلافتِ راشدہ کے بعد ہماری تاریخ کا بہترین دور تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی یہاں تک کہ مغربی استعمار (western imperialism) کا سیلاب آ گیا اور بالآخر وہ دور آیا کہ اسلام کی عمارت بالکل ڈھے گئی۔ اب ہم پر ''کافر'' حکمران ہو گئے اور جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ جب کافر حکمران ہوں تو ہمیں مسلح تصادم بھی اختیار کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں حضرت سید احمد شہید بریلوی جہاد اور قتال کا غلغلہ بلند کر رہے ہیں۔ تلوار اور قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر جہاد و قتال کر رہے ہیں۔ یہی وہ دور ہے کہ جس میں لیبیا میں سنوسی تحریک اُٹھ رہی ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں مہدی سوڈانی تلوار ہاتھ میں لے کر اُٹھ رہے ہیں۔ گویا گلشنِ اسلام میں ہر طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہمارے لیے بہت سی اعلیٰ اور عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

پھر وہ دور آ گیا کہ حکمران مسلمان ہیں اور اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے۔ یہاں سے میری گفتگو قیامِ پاکستان کے بعد کے مرحلے کے بارے میں ہوگی۔ آج کے دور کے مسلم ممالک کے حکمران اکثر و بیشتر نام کے مسلمان ہیں۔ ان کا کردار اور سیرت مسلمانوں کی سی نہیں، اِلا ماشاءاللہ۔ شاہ فیصل شہیدؒ کی عظمت اور ان کا کردار بھی ہمارے سامنے ہے، لیکن یہ معاملہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اکثریت کا حال وہی ہے کہ نام کے مسلمان ہیں۔ فاسق و فاجر ہیں لیکن کفر کا حکم نہیں دیتے۔ گویا اب صورت بدل گئی ہے۔ چنانچہ احیائے اسلام کے طریق کار کے لیے حکم بھی بدل جائے گا، یعنی مسلح تصادم کی روش اختیار نہیں کی جائے گی۔ تصادم کی ایک شکل اور بھی ہے جس کو constitutional confrontation یعنی حکمرانِ وقت کو دستوری طریق پر ہٹانے کی مہمات کہتے ہیں۔ اس کے لیے دوسرا نام ہے سیاست بازی۔ تم لوگ حکومت چلانے کے اہل نہیں ہو، ہم حکومت چلائیں گے۔ ہم زیادہ صالح لوگ ہیں۔ ہمارے اندر زیادہ صلاحیت ہے اور ہم ہی اس قابل ہیں کہ حکومت کا نظام چلا سکیں۔ میرے نزدیک سیاست کا یہ میدان قطعاً صحیح

نہیں ہے۔ یہ بات میں نے ہر دور میں کہی ہے اور آج بھی کہہ رہا ہوں کہ اس الیکشن بازی کی سیاست کو میں درست نہیں سمجھتا اور اس کو ہم نے اپنے لیے شجر ممنوعہ قرار دے رکھا ہے۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن میں مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے مجھے کھڑے ہونے کے لیے ٹکٹ مل رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار شخص کی طرف سے بھی یہ بات سامنے آئی تھی کہ اس کی طرف سے تمہاری سپورٹ کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ بالآخر مجبور ہو کر میں پاکستان سے باہر چلا گیا تھا، صرف اس لیے کہ ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے دلائل کا ذخیرہ میرے پاس ختم ہو چکا تھا۔ پورا رمضان مبارک مدینہ منورہ میں گزارا اور الیکشن کے نتائج وہیں سنے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ سیاست کے اس میدان کو میں بالکل غلط سمجھتا ہوں۔ جماعت اسلامی سے میں صرف اس بنیاد پر الگ ہوا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں الیکشن نہ ہوں۔ عوامی رائے کا اظہار ہونا چاہیے لیکن اگر خالص اسلام کے لیے کام کرنا مقصود ہو اور اسلامی معاشرے کی تشکیل مطلوب ہو تو اس میں الیکشن کا طریق کار ہرگز مفید نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ذہن، فکر، اخلاق، اعمال اور نقطۂ نظر کو تبدیل کیا جائے۔ اگر یہ تبدیلی آ جائے اور ووٹر کا ذہن بدل جائے تو آپ چاہے الیکشن میں نہ بھی آئیں، نمائندہ خود بخود بدل جائے گا۔ نمائندہ تو آج ووٹر کے پیچھے ہاتھ جوڑ کر چلنے والا ہے۔ ہمارا تو معاملہ یہ ہے کہ ہم حکمرانِ وقت کے مزاج کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاسوں میں میں نے دیکھا ہے کہ کس قدر کثیر تعداد میں لوگ نماز ادا کر رہے ہیں۔ اگر سابقہ دور ہوتا تو ان لوگوں کی اکثریت نماز کا رخ تک نہ کرتی۔ یہ سب ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ جہاں تک الیکشن کے ذریعے اسلام کا کام کرنے کا طریقہ ہے، میرے نزدیک وہ درست نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سے اس نظریے پر کاربند رہا ہوں اور اب بھی اس پر کاربند ہوں۔

اس وقت میں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے یعنی مجلس شوریٰ میں شمولیت، تو وہ الیکشن کا اور سیاست کا معاملہ نہیں ہے۔ میں اس کے لیے امیدوار نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے کسی شخص سے ووٹ کی بھیک نہیں مانگی اور نہ میں نے یہ کہا ہے کہ میں آپ کا نمائندہ بن کر

وہاں جارہا ہوں۔ میرا موقف اس کے بالکل برعکس ہے۔

میرے نزدیک اس طرح کے حالات میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل ان دو امور پر منحصر ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ اور دوسری طرف ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ یعنی ''اور نیکی و تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور تعدی کے کاموں میں عدم تعاون کرو''۔ اشخاص ہوں، حکومت ہو، ادارے ہوں ان سب کے کسی غلط کام میں تعاون نہ کیا جائے جبکہ ہر نیک اور بھلے کام میں تعاون کیا جائے۔ یہ قرآن مجید کا صریح حکم ہے۔ حدیث رسولؐ کی روشنی میں بھی اس معاملے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

عَنْ اَبِیْ رُقَیَّۃَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ : اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ)) (رواہ مسلم)

ابی رقیہ تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دین تو بس وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے۔'' ہم نے کہا: ''کس کی؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی اور اس کی کتاب کی اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے رہنماؤں کی اور عوام سب کی۔''

نصیحت کا لفظ عربی زبان میں نَصَحَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ''خالص'' ہو جانا۔ خلوص اور اخلاص اس لفظ کی جڑ میں شامل ہیں۔ جب یہ خلوص اور اخلاص اللہ کے لیے اور اس کے رسولؐ کے لیے ہوگا تو اس کے معنی ہوں گے وفاداری کے، یعنی اللہ سے جو عہد لیا ہے اس کی وفاداری۔ پھر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفاداری، چاہے زمانے کا رنگ کتنا ہی بدل گیا ہو۔ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا حق اس طرح ادا ہوگا کہ ڈٹ جاؤ اور جم جاؤ اس طریقے پر جو اللہ کے رسولؐ کا طریقہ ہے چاہے تم پر دقیانوسیت کے فقرے چست کیے جائیں اور استہزاء ہو، تم پر انگلیاں اٹھیں اور تم معاشرے میں ایک اجنبی بن کر رہ جاؤ۔ جیسا کہ آپؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا:

((بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(مسلم)

''اسلام کی ابتدا بھی اجنبیت کی حالت میں ہوئی تھی اور بالآخر یہ اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ تو اے لوگو! سن لو کہ خوشخبری' تہنیت اور مبارک باد ہے ان اجنبیوں کے لیے جو اس دور میں بھی اسلام کا ساتھ دیں گے اور اس کے دامن کے ساتھ وابستہ رہیں گے۔''

اللہ کی' اس کی کتاب کی اور اس کے رسولؐ کی وفاداری کے بعد الفاظ ہیں کہ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔ یہاں نصیحت سے مراد ہوگی خیر خواہی یعنی مسلمانوں کے امام' راہنما' اولی الامر اور جن کے کاندھوں پر مسلمانوں کے امور کی ذمہ داریاں ہیں' ان کے ساتھ خیر خواہی کا تعلق۔ آخر میں خیر خواہی' بھلائی اور نیکی ہے عامۃ المسلمین کے لیے' پورے اسلامی معاشرے کے لیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ((اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظلم کرے خواہ وہ مظلوم ہو۔'' اس پر صحابہ کرامؓ کافی متعجب ہوئے کہ مظلومی کی حالت میں مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ظالم بھائی کی مدد کیسے کی جائے! آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ظالم کی مدد اس طرح کرو کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ اس کو ظلم سے روک دو۔ یہی اس کی مدد ہے۔''

میری یہ گفتگو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گزشتہ سولہ سال گواہ ہیں کہ ہمیشہ سے مَیں یہی کہتا آیا ہوں۔ مَیں نے بھٹو کے زمانے میں مسجد شہداء میں منبر پر بیٹھ کر بھی یہی باتیں کہی تھیں۔ میرا نقطۂ نظر اس وقت بھی یہی تھا کہ بھٹو مسلمان ہے۔ اگرچہ فاسق اور فاجر ہے لیکن ہے تو مسلمان۔ اسلام کے نام لیوا بہت سے حضرات اور اس کے کردار میں کوئی بڑا بنیادی فرق نہیں تھا۔ آج بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو شراب بھی پیتے ہیں اور اسلام کا نام بھی لیتے ہیں۔ مجھے تو دکھ اس بات پر ہے کہ وہ باصلاحیت ثابت نہ ہوا۔ تاریخ نے جس قدر بڑا موقع اس کو دیا تھا' اگر وہ اسلام کی خدمت کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ عوام کی تائید کے ساتھ اتنی واضح اکثریت حاصل کرنے والا بدقسمتی سے اس ملک میں صحیح خطوط پر کام نہ کر سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ خارجہ پالیسی کے ضمن میں اس نے حکمتِ عملی سے کام کیا تھا۔ مجلس

شوریٰ کے اجلاسوں میں بھی مَیں یہی بات کہہ آیا ہوں کہ یہاں موجودہ خارجہ پالیسی پر تعریف کے ڈونگرے برسائے گئے ہیں' حالانکہ یہی خارجہ پالیسی اُس دور میں بھی تھی جس کا آج نام لینے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تو تسلسل کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ ہماری اصل کمی اور کوتاہی خارجی نہیں بلکہ اندرونی ہے۔ ملک مستحکم نہیں ہے۔ اصل معاملہ سوچنے کا یہ ہے کہ اندرونی استحکام کس طرح ممکن ہو!

مسلمان ہونے کے اعتبار سے چاہے صدر ایوب ہوں' بھٹو ہو یا اب صدر جنرل ضیاء الحق ہوں' تمام مساوی ہیں۔ قرآن حکیم اور سُنّت نبویؐ کے مطالعہ سے میرے نزدیک ان حضرات کے ساتھ ایک مسلمان کا طرزِ عمل پانچ بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

پانچ نکاتی طرزِ عمل

(i) اُن کو نیک مشورے خیر خواہانہ جذبات کے تحت دیے جاتے رہیں۔ اگر منبر رسول ہے تو وہاں بیٹھ کر ان کو صحیح مشورے دیے جائیں۔ جب صدر ضیاء الحق صاحب یہاں مسجد میں پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے' اس وقت بھی مَیں نے ان کو مشورے دیے تھے اور اگر وہ یہاں نہ ہوں تب بھی مشورے دیتا ہوں۔ یہ نہ سمجھیے کہ یہاں دیے جانے والے مشورے یا تنقید اُن تک نہیں پہنچتی (چاہے وہ مسخ شدہ پہنچتی ہو)۔ اگر نیک مشورے کے پردے میں ان کی ٹانگ کھینچنا مقصود ہو تو یہ میرے نزدیک بہت مہلک طرزِ عمل ہوگا جو نصح اور خیر خواہی کے خلاف ہوگا۔

(ii) اُن کے غلط کام پر تنقید کی جائے۔ جو غلط بات ہے' اس پر نکیر ہو اور برملا ہو۔ اس میں مداہنت نہ ہو۔ اگر انفرادی طور پر ملنے کا موقع ملے تو وہاں ہو اور اگر کوئی اجتماع ہو تو وہاں پر تنقید کی جائے۔ البتہ یہ تنقید بھی خیر خواہانہ جذبہ کے ساتھ ہو۔ یہ نہ ہو کہ تنقید کی آڑ میں ان کی بے عزتی کرنا مقصود ہو اور لب ولہجہ میں طنز اور استہزاء کا رنگ نمایاں ہو۔

(iii) جو بھلا کام وہ کریں' اس میں اُن کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

(iv) کسی غلط کام میں اُن کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔

(v) ان کے لیے اپنے ربّ سے تنہائی میں دعائیں کی جائیں۔

یہ وہ پانچ بنیادیں ہیں جن پر میرا طرزِ عمل رہا ہے اور اِن شاء اللہ رہے گا۔ مَیں لاہور میں اب تک مختلف حکومتوں کے تین ادوار گزار چکا ہوں اور یہ چوتھا دور ہے جو چل رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کب تک چلے گا' اس لیے کہ ہمیشہ رہنے والا یہ بھی نہیں ہے۔ بھٹو کے دور میں ٹیلی ویژن پر جماعت اسلامی کی کردار کشی کی جو مہم شروع ہوئی تھی' اس میں مجھ سے بھی رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ کہا گیا کہ آپ جو بات صحیح سمجھتے ہیں وہی ٹی وی پر کہیں' ہم آپ کو dictate نہیں کریں گے۔ انہوں نے مثالیں دیں کہ اس پروگرام میں فلاں مولانا صاحب نے بھی حسب منشابات کہی تھی اور اسے من وعن ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ مَیں نے ان سے صاف طور پر کہا تھا کہ اگر مَیں تمہارے غلط کام میں تعاون کر کے صحیح بات بھی کہوں گا تو وہ غلط ہو جائے گی' اس لیے کہ درحقیقت یہ ایک غلط مہم ہے جو تم چلا رہے ہو۔ مَیں جو بات کروں گا وہ بھی اس context میں لی جائے گی جس میں ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ میرا معاملہ اگر ہوگا تو حُبِّ علیؓ پر ہوگا' بغضِ معاویہؓ پر نہیں۔ مجھے جماعت اسلامی کے موجودہ طریق کار سے اختلاف ہے' اس کے فکر سے نہیں۔ مَیں جماعت کے مخالفین میں سے نہیں ہوں! تاہم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جماعت اسلامی کے بارے میں مَیں نے اپنا اختلافی نقطۂ نظر بیان نہ کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے یہ خیال آجاتا کہ اگر حکومت کی طرف سے ٹی وی پر اظہارِ خیال کی دعوت ملی ہے تو اس ذریعہ ابلاغ سے زیادہ وسیع پیمانے پر مَیں اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکوں گا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان حضرات کی نیتیں نیک نہیں ہیں' اس لیے مَیں نے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

اس موقع پر مجھے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں: كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ ''حق بات سے بھی باطل تقویت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' سچی بات ایسی بھی ہوسکتی ہے جو غلط مقصد اور نیت کے لیے کی جارہی ہو۔ اس لیے مَیں نے ان سے تعاون نہیں کیا۔ اس کے برعکس اگر مجھے دعوت ملتی کہ آؤ اور ٹیلی ویژن پر درسِ قرآن دو تو مَیں ضرور قبول کرتا۔ اگر مَیں نہ جاتا تو گویا اپنے مقصد کے ساتھ غداری کرتا۔ ؎ ''مَیں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے

بل گیا۔'' جہاں کہیں موقع ملا ہے' مَیں گیا ہوں۔ بھٹو کے دور میں بھی اگر کبھی کسی ادارے میں جانے کا موقع ملا ہے تو مَیں نے وہاں اپنی بات کہی ہے۔ NIPA میں گیا ہوں۔ کسی کالج میں خطاب کرنے کا موقع ملا ہے تو جو مَیں اب تک سمجھ پایا ہوں وہاں جا کر بھی وہی بات کہی ہے کہ لوٹو قرآن کی طرف' پلٹو قرآن کی طرف اور رجوع کرو قرآن کی طرف! یہ ہے میرا consistant طرزِ عمل جو ہمیشہ سے رہا ہے۔ محاذ آرائی بمعنی الیکشن کی سیاست سے مَیں ہمیشہ کنارہ کش رہا ہوں۔ جہاں تک نظری سیاست کا تعلق ہے' مَیں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ مَیں اس کو دین کا جزو سمجھتا ہوں۔ ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ مَیں جس سیاست کا قائل ہوں وہ اس قدر مقدس کام ہے کہ: ((كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءِ)) ''بنی اسرائیل کی سیاسی زمامِ کار انبیاء کے ہاتھوں میں تھی۔'' جس سیاست کا ذکر اس حدیث میں ہے یہ نظری سیاست ہے نہ کہ انتخابی سیاست۔ مَیں تو ہمیشہ سے نظری سیاست کا قائل ہوں۔ انتخابی سیاست کو مَیں شجرِ ممنوعہ سمجھتا ہوں۔ اُس سیاست میں مَیں کبھی قدم نہ رکھوں گا' ان شاء اللہ العزیز!

ہم نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا مقصد سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ منظم ہو کر دین کا کام کیا جائے۔ مَیں آپ کو تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس سے چند اوراق پڑھ کر سناتا ہوں۔ یہ قرارداد ۱۹۶۷ء میں اُس وقت مرتب کی گئی تھی جب جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین نے فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں ایک جماعت بنا کر اور منظم ہو کر دین کا کام کرنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس موقع پر وہ تنظیم قائم نہ ہو سکی لیکن الحمدللہ' ثم الحمدللہ کہ مَیں نے ۱۹۷۵ء میں خود اس تنظیم کو قائم کیا۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

''تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ''دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''الدين النصيحة'' کی روح اور ''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے۔'' (اس نکتے کی توضیح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ) ''اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ

شامل ہونا چاہیے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ' رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد' گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آ جائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دل سوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دُور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو' کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنّت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے' تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اوّلیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا' نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی......."

یہ بات ہم نے اس وقت کہی جب صدر ایوب "قوس لمن الملک" بجا رہے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں جب بھٹو برسر اقتدار تھے' یہی بات کہی۔ مَیں نے یہ باتیں ہر دور میں کہی ہیں کہ دین کے نام پر لوگوں میں اشتعال پیدا کر کے ہنگامے کھڑے کر دینے سے صرف منفی کام ہو سکتا ہے' مثبت کام نہیں ہو سکتا۔ ان ہنگاموں کی وجہ سے نقصان اس ملک کو پہنچا ہے۔ فلک شگاف نعرے لگ۔ گئے' جلوس نکل گئے' ہنگامے ہو گئے' حکومت ختم

ہو گئی لیکن پھر آپ وہیں کے وہیں رہے جہاں سے چلے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایوب صاحب کو گرایا تو بھٹو صاحب قابض ہو گئے۔ ع شامتِ اعمال باصورت بھٹو گرفت۔ پھر آپ نے اس کو ہٹایا تو اب فوج ہے اور وہی حال کہ بہت سی پارٹیاں اس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ تمام توانائیاں اور قوتیں مثبت کام کی طرف صرف کر دی جاتیں۔ اس کام سے جو تبدیلی آتی وہ اگرچہ تھوڑی اور تدریجاً ہوتی لیکن پائیدار اور مستقل ہوتی۔ میرا طرزِ عمل اس اساس اور بنیاد پر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں قراردادِ تاسیس کا اگلا اقتباس:

> ''....... رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کُلّی اجتناب لازمی و لابدی ہے۔ ہمارے نزدیک ''أئمةُ المسلمین'' اور ''عامتهم'' دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں! یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے۔ بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔''

یہ ہے وہ نہج جس پر مَیں کام کر رہا ہوں اور آج سے نہیں ۱۹۶۷ء سے کر رہا ہوں۔ یہ تحریر بھی اُس وقت میرے قلم سے نکلی تھی۔ اگرچہ اس موقع پر ہمارے بزرگوں نے جہاں کہیں مناسب سمجھا، کمی بیشی کر دی لیکن بنیادی طور پر یہ تحریر میری ہے۔ اس نہج پر مَیں عمل پیرا ہوں۔ مَیں اس کو ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔

جماعت اسلامی سے میرا اصل اختلاف

مجھے دکھ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا بھی ابتدا میں یہی موقف تھا۔ وہ اس طریقے پر عمل پیرا تھی جس کو مَیں درست سمجھتا ہوں۔ قیامِ پاکستان کے چند ہی سالوں بعد وہ اپنی غلط

حکمت عملی کی وجہ سے سیاست کی دلدل میں پھنس گئی۔ مَیں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مولانا مودودی مرحوم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مَیں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ مَیں ان کی گود میں پلا ہوں اور مَیں نے اپنی شعوری آنکھ ان کی گود میں کھولی ہے۔ مَیں نے ان کی آنکھ سے دیکھنا اور ان کے کانوں سے سننا سیکھا ہے۔ انہی کے دیے ہوئے تصورِ فرائض دینی کو مَیں نے اختیار کیا ہے اور اسی پر آگے چل رہا ہوں اگرچہ اس میں کمی بیشی کا امکان ہے' البتہ ان کی سیاسی حکمت عملی اور ان کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' سے مَیں اعلانِ براءت کرتا ہوں جس کو مَیں بڑی مہلک کتاب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے دین کے لیے جو بنیادی کام شروع کیا تھا' میرا موجودہ طریق کار وہی ہے۔

مجھے دکھ ہے تو اس بات کا کہ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے محاذ آرائی کی پالیسی اختیار کی۔ انہیں چاہیے تھا کہ جو مواقع ان کو مل رہے تھے' ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہی کام کرتے رہتے جو قیامِ پاکستان سے قبل کر رہے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہ عملی سیاست میں نہیں آئے اور تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔ مَیں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی یا نہیں کی' لیکن یہ متفق علیہ بات ہے کہ انہوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو اوّلین قیادت تھی اس میں آج کے مسلمانوں سے کہیں بہتر مسلمان تھے۔ سردار عبدالرب نشتر جیسے لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین جیسے لوگ تھے۔ مولوی تمیز الدین اور خواجہ ناظم الدین جیسی شخصیتیں موجود تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسی شخصیت قومی اسمبلی کی رکن تھی۔ اس پہلی حکومت نے جماعت اسلامی کے ساتھ ہرگز کوئی معاندانہ روش اختیار نہیں کی تھی۔ مولانا مودودی مرحوم کے لیے ریڈیو کھول دیے گئے' کالجوں کے دروازے کھول دیے گئے کہ جایئے اور تقاریر کیجیے۔ مولانا مودودی مرحوم کی بہترین تقریریں ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر تھیں لیکن جلد ہی ان کی پالیسی محاذ آرائی کی ہو گئی یعنی تم ہٹو' ہم نظامِ حکومت چلائیں گے۔ میرے خیال کے مطابق بعد میں پیش آمدہ حالات کا سب سے بڑا سبب مولانا مودودی کا یہی غلط موقف تھا۔ مَیں نے جماعت

میں رہتے ہوئے اس پالیسی سے اختلاف کیا' تبدیلی کی کوشش کی۔ جب مجھے نظر آیا کہ یہ پالیسی تبدیل ہونی ممکن نہیں تو مَیں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس کے بعد سے میرا طرزِ عمل وہی ہے جو ایک مسلمان کا ایک مسلمان حکومت کے ساتھ ہونا چاہیے۔

مجلس شوریٰ میں شمولیت

چنانچہ جب موقع ملا تو مَیں نے خطاباتِ جمعہ میں منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر حکمرانِ وقت کو مشورے دیے اور تنقیدیں کیں۔ اب موجودہ مسلمان حکمران نے اس کا موقع دیا کہ اس کے پاس چل کر جاؤں اور اس کو مشورہ دوں تو آخر کیا جواز ہے میرے پاس کہ مَیں وہاں نہ جاؤں! مَیں نے آج تک صدر صاحب کی کوئی مدح سرائی نہیں کی' اگر کی ہے تو صرف اس حد تک کہ ان میں سننے کی صلاحیت بہت ہے۔ بہت کڑوی کڑوی باتیں بھی سن سکتے ہیں' اور میرے نزدیک یہ بھی بڑے صبر کا کام ہے۔ **يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ** کی صلاحیت تو اللہ نے ان کو خوب دی ہے' اگر کہیں اللہ کرے کہ **يَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ** کا معاملہ بھی پیدا ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے گا۔ بہرحال اس وقت وہ حاکم ہیں' آپ کو پسند ہو یا نہ ہو۔ جو شخص بھی بغاوت کا نعرہ لگا کر سڑک پر نہیں نکلا ہے وہ اس حکومت کو تسلیم کیے ہوئے ہے۔ میرے نزدیک یہاں کے رہنے والے ہر شخص کو جو بھی اس حکومت کو تسلیم کیے ہوئے ہے' پانچ باتوں پر اپنا معاملہ پورا رکھنا چاہیے:

(۱) صحیح کام میں تعاون کیا جائے　　(۲) صحیح مشوروں سے نوازا جائے

(۳) غلط کام میں تعاون نہ کیا جائے　　(۴) غلط کام پر تنقید کی جائے

(۵) اللہ سے دعا کی جائے کہ: تو نے اس وقت جس شخص کے ہاتھ میں حکومت کی ذمہ داری سونپی ہے اس کو صحیح سمجھ دے اور صحیح رخ پر اس کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔

ہمارا معاملہ تو اِن شاء اللہ یہ رہے گا کہ صحیح بات کہیں گے اور صحیح بات میں تعاون کریں گے' غلط بات پر تنقید کریں گے اور اس میں تعاون نہیں کریں گے چاہے ایسا کرنے سے اس حکومت کی طرف سے ہم پر عتاب نازل کیوں نہ ہو جائے۔ درحقیقت اس پس منظر میں میرا یہ فیصلہ تھا کہ اگر وہ شخص مشورے کے لیے بلائے تو مَیں جاؤں گا۔ لہٰذا

جب مجھ سے پوچھا گیا کہ تم مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے تیار ہو' تو مَیں نے حامی بھر لی اس لیے کہ یہ میرے موقف کے بالکل مطابق تھا۔ وہ کون سی شرعی' فقہی یا عقلی دلیل ہے کہ کوئی شخص مجھے مشورے کے لیے بلائے اور مَیں نہ جاؤں! اگر کوئی مجھے ایسی دلیل دے سکے تو مَیں اس کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ اگر مجھے ایک بڑے پلیٹ فارم پر' حکمرانِ وقت کے سامنے اور ان لوگوں کے سامنے جن کے ہاتھوں میں ملک کی زمامِ کار ہے صحیح بات اور کلمۂ حق کہنے کا موقع دیا گیا ہے تو میرے پاس انکار کا کیا عذر ہے! مَیں الحمدللہ' ثم الحمدللہ صدفی صد مطمئن ہوں کہ میرا یہ طرزِ عمل میری پالیسی' نقطۂ نظر اور میرے سولہ سالہ موقف کے عین مطابق ہے۔ مَیں نے کہیں اس سے انحراف نہیں کیا ہے۔ البتہ مَیں آپ سے ایک بات ضرور عرض کر دیتا ہوں کہ میری consent لینے سے قبل مجھے معلوم نہ تھا کہ اس شوریٰ میں کون کون اور کس کس قسم کے لوگ بلائے جائیں گے۔ پہلے اجلاس میں شرکت کے بعد تین چیزیں ایسی آئی ہیں جنہوں نے مجھے اپنے اس فیصلے پر سوچنے کے لیے مجبور کیا ہے' لیکن مَیں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔

پہلی یہ کہ صدر ضیاء صاحب کا یہ موقف کہ یہ صرف مشورہ نہیں ہے بلکہ حکومت میں شرکت کے بھی مترادف ہے۔ اگر حکومت میں شرکت یا شراکت کا معاملہ ہے تو مَیں یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن اگر صرف مشورے کا معاملہ ہے تو مَیں مشورہ ضرور دوں گا۔

دوسری یہ کہ مَیں نے وہاں دیکھا ہے کہ مجلس شوریٰ صرف اس کا نام ہے۔ اصل میں یہ ایک پارلیمنٹ کے طور پر کام (function) کر رہی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ مَیں اگلی مرتبہ وہاں اس معاملے کو بھی سامنے رکھوں کہ پارلیمنٹ کی طرز کے قواعد وضوابط کے تحت اگر کام کرنا ہے تو اس میں بہت سا وقت ضائع ہو جائے گا۔ جو حضرات اس پارلیمانی طرز سے واقف ہیں' ان کو تو اس کے آداب از بر ہیں۔ میرا حال تو یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تحریک التواء کس بلا کا نام ہے! اس میں اور قرارداد میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست مولانا سمیع الحق صاحب کا معاملہ یہ ہوا کہ انہوں نے قرارداد کو تحریک التواء

کے نام سے پیش کر دیا' جو خلافِ قاعدہ سمجھ کر مسترد کر دی گئی۔ مجھے وہاں تا حال صرف ایک ہی تقریر کا موقع ملا ہے جو خارجہ پالیسی پر تھی۔ مَیں اس کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے کہ وہ ''اِن کیمرہ'' ہوئی تھی۔ پرانے parliamentarians کو خوب معلوم ہے کہ کس طرح کو دکر درمیان میں بات کی جا سکتی ہے۔ میرے لیے تو شاید کافی عرصے تک وہ طور اطوار اور انداز اختیار کرنے ممکن نہ ہوں۔

تیسری بات یہ کہ مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ اس میں بہت وقت صرف ہو گا۔ اگر میری ترجیح (priority) کا معاملہ suffer ہونے پر آیا تو مجھے سوچنا ہو گا کہ مَیں کس چیز کے لیے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا کتنا حصہ صرف کر سکتا ہوں۔

یہ تین چیزیں ہیں جس کی بنا پر مَیں نظرِ ثانی کروں گا' لیکن جہاں تک اصولی طور پر ان کی دعوت پر لبیک کہنے کا تعلق تھا اُس پر مَیں اب بھی جازم ہوں۔ اگر ہم واقعتاً یہ محسوس کریں کہ کوئی مفید خدمت سرانجام دے سکتے ہیں اور دوسرے وہاں کے طریق کار میں کوئی تبدیلی آ سکے تو ہم وہاں رہیں گے' ورنہ نہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ جمعے کو یہاں باغِ جناح میں جو استقبالیہ ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ ہم آپ کا محاسبہ کریں گے اور عوام کو بڑی امیدیں آپ سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ مَیں نے ان سے عرض کیا تھا کہ آپ کے اس جملے سے مجھے بڑا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ صورتِ حال تو یہ ہے کہ مَیں آپ کا نمائندہ ہو کر جا ہی نہیں رہا ہوں۔ مجھے تو ایک شخص نے اپنی ذاتی حیثیت میں دعوت دی ہے کہ مشورے میں آ کر شریک ہو جاؤ۔ مَیں نے صرف اس پر لبیک کہا ہے۔ نہ مجھے آپ کے محاسبہ کا ڈر ہے اور نہ یہ خوف کہ مجھے واپس آ کر آپ سے ووٹ مانگنے ہیں۔ مَیں تو نہ آپ کے ووٹوں سے جا رہا ہوں اور نہ کبھی آپ کے ووٹوں کی مجھے بھیک مانگنی ہے۔ مَیں اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہوں اپنے ضمیر کے سامنے اور اپنے اللہ کے سامنے۔

یہ ہے میرا موقف اس ادارے میں شمولیت کے ضمن میں۔ مَیں نے یہ وضاحت اتنی تفصیل کے ساتھ اس لیے کر دی ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر یہ حق ہے۔ جو حضرات بھی دُور دراز سے چل کر جمعہ میں آتے ہیں چاہے وہ میرے ''کام'' میں شریک

ہوں یا نہ ہوں' مَیں ان کا اپنے اوپر ایک حق سمجھتا ہوں۔ اگر وہ میری بات سننے آتے ہیں تو میرے اقدام سے ان حضرات کو اگر کوئی تشویش لاحق ہوئی ہو اور ان کو احساس ہوا ہو کہ مَیں نے کہیں اپنے موقف میں ترمیم کر دی ہے تو مجھے اپنی طرف سے پوری وضاحت پیش کر دینی چاہیے۔ مَیں اس پر بھی مطمئن ہوں کہ اس خطبہ جمعہ میں مَیں نے کوئی سیاسی تقریر نہیں کی ہے۔ مَیں نے تو ایک حدیث بیان کی ہے اور آپ کو یہ بتایا ہے کہ ایک مسلمان ملک میں جہاں کا حکمران بھی مسلمان ہو' کے مقابلے میں ایک غیر مسلم ملک میں جہاں کا حکمران بھی غیر مسلم ہو' ایک مسلمان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے!

جو لوگ حالات کی تبدیلی میں فرق کو نہیں سمجھ پاتے وہی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اپنی قوتیں اور توانائیاں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات
واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین OO

***

مجلس شوریٰ سے خطاب اور استعفا

* ضمیمہ
* ''میثاق'' مئی ۱۹۸۲ء

مجلس شوریٰ سے خطاب (جزوی حصہ)

(۱۴/اپریل ۱۹۸۲ء)

محترم صدر مجلس! مَیں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں اور آپ کی وساطت سے تمام حاضرین مجلس کی خدمت میں ہدیۂ سلامِ مسنون پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد مَیں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اظہارِ خیال کا موقع عنایت فرمایا، خصوصاً اس لیے کہ مَیں نے بروقت اپنا نام نہیں دیا تھا۔ مَیں گزارش کروں گا کہ مجھے اظہارِ خیال کے لیے قدرے کھلا وقت دیجیے۔ اس سلسلے میں میرا ایک استحقاق بھی ہے جو مجروح نہیں بلکہ قائم ہوا ہے اور وہ اس لیے کہ مَیں نے اس پورے سیشن کے دوران تا حال ایک سیکنڈ بھی اس ایوان کا نہیں لیا ہے۔

مَیں جو خاموش رہا ہوں تو بہت سے احباب نے اس کے بارے میں مجھ سے استفسار بھی کیا ہے۔ مَیں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس وقت اس کی بھی مختصر وضاحت کر دوں اس لیے کہ یہ معاملہ پرسنل explanation کی نوعیت کا ہے۔ میری اس مسلسل خاموشی کی دو وجوہات ہیں۔

ایک یہ کہ اس وقت ایک خاص مسئلہ میں میری حیثیت پورے ملک میں نزاعی یا مختلف فیہ (controversial) سی بن گئی ہے۔ میں آپ کی وساطت سے تمام احباب

اور پوری قوم کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو اٹھانے کی میری قطعاً کوئی نیت نہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی خرابیاں ہیں جن کی اصلاح تدریجاً ہی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کسی مسئلے کو ایک مہم کے طور پر اٹھانا میرے نزدیک غلط بھی ہے اور مضر بھی۔ تاہم اگر کہیں کوئی سوال کیا جائے تو دین کا جو تھوڑا بہت فہم کسی شخص کو حاصل ہے اس کے لیے صحیح جواب اور اظہارِ خیال ضروری ہوگا۔ اعمال کے اعتبار سے ہم سب ہی سے کوتاہیاں سرزد ہوجاتی ہیں لیکن اگر ہمیں ان کا شعور اور اعتراف ہو اور ہم اصلاح کی جانب بتدریج بڑھ رہے ہوں تو کوئی مایوسی یا پریشانی کی بات نہیں ہے۔ البتہ خدانخواستہ اگر ہم نے دین کی تعلیمات کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا تو پھر وہ فریم آف ریفرنس ہی ختم ہوجائے گا جس کے حوالے سے ہمیں اصلاح کی طرف پیش قدمی کرنی ہے۔ فی الوقت میں صرف یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ پردے وغیرہ کے مسئلے کو مہم بنا کر اٹھانا قطعاً میرے پیش نظر نہ تھا۔

میری خاموشی کا دوسرا سبب جو مسئلہ زیر بحث سے براہِ راست متعلق بھی ہے' یہ ہے کہ میں شدید بے اطمینانی محسوس کر رہا ہوں کہ ہم نے اس ایوان کی کارگزاری میں وہ شکل اختیار کر لی ہے کہ جیسے گھوڑے کو گاڑی کے آگے باندھنے کی بجائے اس کے پیچھے باندھ دیا جائے۔ ہماری ترجیحات (priorities) میں سب سے پہلے اس امر پر غور کیا جانا تھا کہ اپنے ملک کو اسلامی خطوط پر اور اس معاشرے کو اسلام کے راستے پر لانے کے لیے ہم عمل کو کس طرح تیز کریں۔ اس ضمن میں آپ نے ایک سب کمیٹی بھی بنائی تھی' لیکن اس پورے سیشن کے دوران تاحال ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کی سفارشات ہمارے سامنے آئیں گی یا نہیں! معاشرے میں اسلام کو رائج کرنے کے لیے قانونِ اسلامی کی تنفیذ یقیناً ایک اہم قدم ہے' لیکن میرے نزدیک اس سے اہم تر یہ ہے کہ اسلام کے نظریات اور اقدار کے مطابق ذہن' فکر' اخلاق و اعمال کی تطہیر اور تعمیر تو ہو۔ اگر ہم نے ان چیزوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر صرف قانون سازی کی طرف ساری توجہات مرتکز کر دیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک بُعد اور فاصلہ (gap) پیدا ہوجائے' اس اعتبار سے کہ قانون تو ہم

بناتے چلے جائیں لیکن اس کے لیے مناسب ماحول موجود نہ ہو۔ اس طرح شدید خطرہ پیدا ہو جائے کہ بجائے فائدہ کے ہمیں نقصان اٹھانا پڑے اور ہماری اس غلط حکمتِ عملی سے اسلام بدنام ہو جائے۔ اس پہلو سے ان ترجیحات کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز جس کا ذکر بھی پورے شدّومدّ کے ساتھ پچھلے اجلاس میں ہوا تھا' یہ ہے کہ ہمیں اسلامی جمہوری نظام کا ایک ڈھانچا تیار کرنا ہے لیکن اس پورے سیشن کے دوران اس کا بھی قطعاً کوئی ذکر تا حال سننے میں نہیں آیا۔ اس مسئلے کی خصوصی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہ ایوان ایک عارضی انتظام ہے اور ملک و وطن کے لیے کوئی مستقل انتظام ہمیں جلد از جلد سوچنا ہے۔

بہر حال ان دو وجوہات کی بنا پر مجھے شدید بے اطمینانی ہے۔ چودھری محمد اکبر صاحب نے دو دن قبل جو باتیں کہی تھیں' اگرچہ وہ اپنی علالت کی وجہ سے ان کو درست طور پر ادا نہیں کر سکے لیکن میرے نزدیک وہ بہت اہم بھی تھیں اور کلیتاً درست بھی! میں انہیں خراجِ تحسین ادا کرتا ہوں کہ صحت کی خرابی کے باوجود بھی وہ اپنا قومی اور ملی فریضہ ادا کرنے کے لیے اس ایوان میں آتے ہیں حالانکہ ان کے لیے چلنا تک دوبھر ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی اپنے اوپر شدید سختی جھیل کر ہی کر پاتے ہیں۔ بہر حال مَیں ان کے خیالات کی پوری تائید کرتا ہوں۔

حق شفعہ کے قانون کے زیر غور مسودے کے بارے میں بہت سے احباب نے فرمائش کی کہ مَیں بھی اظہارِ خیال کروں۔ مَیں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون پر اتھارٹی تو بہت دور کی بات ہے' میں تو عالم دین ہونے کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں صرف خادم دین ہوں اور علومِ دینی میں سے بھی میری اصل دلچسپی قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں سے بھی اس کے فلسفہ حکمت اور اس کی اخلاقی و ایمانی تعلیمات میرا اصل موضوع ہیں۔ تاہم شفعہ کا جو مسودہ قانون اس وقت زیر بحث ہے' اس کے بارے میں اپنے تاثرات اور خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مَیں پہلے دو دن کی بحث کے دوران یہاں موجود نہ تھا۔ تاہم احباب سے جو کچھ سننے میں آیا اور پھر ڈیڑھ دن میں جو کچھ میں

نے خود سنا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ایک طرف تو ہمارے ہاں یہ تشویش ناک صورت پیدا ہو رہی ہے کہ علماء اور وکلاء کے مابین محاذ آرائی (confrontation) اور طبقاتی تقسیم (polarisation) کا سا سماں بندھ رہا ہے جبکہ دوسری طرف اس مسئلہ پر عوام کی جانب سے شدید تشویش کا اظہار ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک معزز رکن نے تو بڑا ثقیل لفظ بھی استعمال کر دیا تھا جسے کارروائی سے حذف کیا گیا۔ یہ تو یقیناً ٹھیک ہے کہ وہ لفظ ہرگز استعمال نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے ذریعے جو تشویش سامنے آ رہی ہے اسے نظرانداز کر دینا صحیح نہ ہوگا۔ تیسری جانب اس مسئلہ کے ضمن میں اجتہاد ایسے اہم لیکن مشکل موضوع پر بھی بحث بڑی شدومد سے چھڑ گئی ہے۔ یہ ایک بڑی ٹیکنیکل بحث ہے کہ کس کو اجتہاد کا حق ہے! اجتہاد کی حدود کیا ہیں؟ اجتہاد کی شرائط کیا ہیں؟ ہمیں بہت سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ ہم اجتہاد کرنے کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں علمائے کرام کا یہ حق تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلامی قانون کے ماہر وہی ہیں۔ انہوں نے علوم دینی کی تحصیل میں پوری زندگی کھپائی ہے۔ لہٰذا ان معاملات میں ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں۔

اسی بحث کے دوران میرے نزدیک اہم ترین بات فقہی مسلکوں کے اختلاف سے متعلق سامنے آئی ہے۔ اس ملک میں اگر ہم اسلامی قانون کو فی الواقع نافذ کرنا چاہتے ہیں تو اہم ترین رکاوٹ یہی فقہی اور مسلکی اختلاف کا مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں جو بات بھی سامنے آئے اس پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ اس وقت میری مراد اس نکتے سے ہے جو علامہ سید محمد رضی صاحب کی تقریر سے سامنے آیا۔

استعفا

محترم و مکرم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدر پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے پرسوں (بتاریخ ۵ مئی ۱۹۸۲ء) گورنر ہاؤس لاہور میں مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ میری معروضات کو ہمدردی اور توجہ سے سنا اور مجھے وفاقی کونسل (مجلس شوریٰ) سے مستعفی ہونے کی پوری خوش دلی سے اجازت دے دی۔ بنابریں تحریر ہذا پیشِ خدمت ہے:

جیسے کہ زبانی بھی عرض کر چکا ہوں، میرے استعفے کے بنیادی اسباب دو ہیں:

ایک یہ کہ کونسل کے پہلے اجلاس میں کی گئی آپ کی افتتاحی تقریر میں وفاقی کونسل کی رکنیت کو حکومت میں شمولیت کے مترادف قرار دیا گیا تھا۔ پھر دوسرے اجلاس کی افتتاحی تقریر میں آپ نے مزید آگے بڑھ کر کونسل کے قیام کو سیاسی عمل کا آغاز قرار دے دیا۔ اس سے قطع نظر کہ آپ کی جانب سے ایسا کیا جانا صحیح ہے یا غلط، میرا اصل مسئلہ یہ ہے کہ مَیں نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ مروّجہ مفہوم میں عملی سیاست کے میدان سے کنارہ کش رہوں گا۔ اس کا اعلان میری جانب سے بارہا ہو چکا ہے، لہٰذا میرے لیے اس پوزیشن کو قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ کونسل کی ہیئتِ تشکیلی اور پھر اس کی کارروائی کے لیے پارلیمانی قواعد و ضوابط کے جوں کے توں قبول کر لیے جانے سے اس کی اصل حیثیت مجلس شوریٰ کے بجائے نامزد پارلیمنٹ کی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس میں مفید کام کی رفتار بے حد کم اور وقت کا صَرف بے حد زیادہ ہے۔ اس بنا پر میرے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی مشاغل پر نقصان دہ اثرات مترتب ہو رہے ہیں، جس کو مَیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔

بنابریں یہ تحریری استعفا حاضرِ خدمت ہے۔

فقط، والسلام

اسرار احمد

***

قومی ترانے کے لیے ''قیام''

اور

پرچم کو ''سلام''

* ''میثاق'' جون ۱۹۸۲ء

آج کل وطن عزیز کے طول و عرض میں قومی ترانے کے دوران احتراماً اور تعظیماً کھڑے ہونے اور قومی پرچم کو سلامی دینے کے بارے میں میری ایک رائے پر بہت چہ میگوئی ہو رہی ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے میری رائے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس سے از خود بعض نتائج اخذ کر کے انہیں میری جانب منسوب کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اگرچہ مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ جو لوگ یہ کام دیدہ و دانستہ کسی مذموم مقصد کے تحت کر رہے ہیں ان کے رویے میں کوئی تبدیلی آئے گی' تاہم عوام الناس کو مغالطے سے بچانے کے لیے حسبِ ذیل وضاحتیں ضروری ہیں۔

(۱) اسلام دین توحید ہے اور توحید کی ضد شرک ہے۔ چنانچہ اسلام کی رو سے سب سے بڑا گناہ' سب سے بڑی معصیت اور عظیم ترین جرم شرک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک ہی سورت (سورۃ النساء) میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''اللہ اسے تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے البتہ اس سے کمتر گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا!'' (آیات ۴۸ و ۱۱۶)

(۲) یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اُمت کی خیر خواہی اور اس پر شفقت و رحمت کے جذبے کے تحت نہایت باریک بینی سے ہر اُس چیز پر ٹوک دیا کرتے تھے جس میں کسی ادنیٰ درجے میں بھی شرک کا شائبہ ہونے کا احتمال ہوتا تھا۔ اسی کی مثال ہے وہ واقعہ کہ ایک صحابیؓ کی زبان سے نادانستہ یہ الفاظ نکل گئے کہ "مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ" "جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں!" ظاہر ہے کہ ان صحابیؓ کے ذہن میں ادنیٰ خیال بھی شرک کا نہیں ہوسکتا تھا لیکن الفاظ بظاہر ایسے تھے جو کسی دوسرے سننے والے کے لیے غلط فہمی کی بنیاد بن سکتے تھے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے ٹوک دیا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا)) "کیا تم نے مجھے اللہ کا مدمقابل بنا دیا ہے؟" اس کائنات میں مشیت و ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کا کارفرما ہے' لہٰذا صرف یہ کہنا چاہیے کہ "جو اللہ چاہے"۔ اسی کی ایک دوسری مثال یہ ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی تشریف آوری پر صحابہ کرام ؓ کو احتراماً و تعظیماً کھڑا ہونے سے منع فرمایا کرتے تھے! فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِدَاهُ آبَائُنَا وَاُمَّهَاتُنَا!

(۳) شرک صرف جلی ہی نہیں' خفی بھی ہوتا ہے اور ظاہری ہی نہیں' معنوی بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں کسی بُت کو سجدہ کرنا ظاہر و باہر شرک ہے جس کے مرتکب پر بغیر کسی تامل کے مشرک ہونے کا فتویٰ لگا دیا جائے گا وہاں زر پرستی (یعنی دولت انسان کو اتنی عزیز ہو جائے کہ اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈال دے اور حرام و حلال کی تمیز اُٹھا دے) بھی یقیناً شرک ہے اگرچہ ظاہری نہیں' معنوی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) "ہلاک ہوگیا یا ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ!" اسی طرح ریاکاری بھی شرک ہے جس کے ضمن میں آنحضور ﷺ کا حد درجہ لرزا دینے والا فرمان ہے کہ ((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) "جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے خیرات کی اس نے شرک کیا!" (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین!)

(۴) شرک کی گمراہی ہمیشہ ایک ہی صورت میں نہیں رہتی بلکہ ہر دور میں ابلیس لعین ع ''نیا جال لائے پرانے شکاری'' کے مصداق شرک کی نت نئی صورتیں ایجاد کر کے بندگانِ خدا کی گمراہی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اس کے توڑ کے لیے اُمت محمد ﷺ کے اصحابِ بصیرت کو اللہ تعالیٰ وہ صلاحیت عطا فرماتا ہے کہ وہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

کے مصداق شرک کی ہر نئی صورت کو پہچان کر خلق خدا کو متنبہ کریں اور اس سے بچنے کی تلقین کریں۔ یہ صلاحیت اگر حاصل نہ ہو تو عین ممکن ہے (اور یہ صورتِ حال ہر دور میں موجود رہی ہے) کہ سابقہ دور کے علماء کرام نے جن چیزوں کو شرک قرار دیا بعد کے مقلدین نے ان کو تو شرک سمجھ کر اس سے خود بھی اجتناب کیا اور خلق خدا کو بھی اجتناب کرنے کی تلقین کی لیکن اپنے دور کے نئے شرک کو نہ پہچاننے کے باعث شرکِ جدید میں نادانستہ اور غیر شعوری طور پر ملوث ہو گئے!

(۵) عہدِ حاضر کے عظیم ترین نابغہ اُمت علامہ اقبال مرحوم نے اس کیفیت کا مشاہدہ نہایت دقتِ نظر سے کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ شرک اور کفر کو صرف چند ظاہری باتوں تک ہی محدود نہ سمجھو بلکہ اس کی حقیقت کا شعور حاصل کرو۔ مثلاً: ؎

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

اور ؎

جو مَیں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اور ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

(۶) عہد جدید کے اجتماعی فلسفوں اور عمرانی نظریوں میں ایک نظریہ وطنیت بھی ہے، جس پر جدید تصورِ قومیت (نیشنل ازم) کی اساس قائم ہے۔ علامہ مرحوم نے تہذیب حاضر کی فکری و فلسفیانہ اساسات کا گہرا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ثمرات و نتائج کا براہِ راست مشاہدہ بھی کیا تھا، بقول خود ان کے ع ''کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل''۔ لہٰذا ان کی نگاہِ حقیقت شناس نے اس نظریہ میں شرک کی آمیزش کو بھانپ لیا اور نہایت پُرشکوہ الفاظ میں بیانگ دہل اس کا اعلان بھی فرمایا کہ: ؎

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

مسلمانوں کو للکار کر دعوتِ عمل دی کہ عہدِ جدید کے اس ہبل اعظم کو ایک ہی ضربِ محمودی سے پاش پاش کر دیں ؎

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

مزید برآں یہ وضاحت بھی فرما دی کہ نبی اکرم ﷺ نے اگر وطن کی محبت کو جز وایمان قرار دیا ہے تو وہاں وطن سے مراد کچھ اور ہے جبکہ جدید عمرانی نظریات میں وطنیت کا مفہوم کچھ اور ہے۔ محض لفظی اشتراک سے دھوکا نہ کھایا جائے۔ ؎

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے!

(۷) علامہ مرحوم کی اس خداداد بصیرت اور ژرف نگاہی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے مزید غور فرمایئے تو یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آئے گی کہ ہر معبود کے لیے ایک نماز ہوتی ہے، ہر بت کے لیے ڈنڈوت کی جاتی ہے اور ہر صنم کے لیے بھجن گائے جاتے ہیں، جن میں اُس معبود کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں اور اس کی تعظیم کے اظہار کے لیے قیام و سجود کے مراسم ادا کیے جاتے ہیں۔ معبودِ برحق سبحانہ وتعالیٰ کے لیے بھی نماز ہے،

جس میں اس کا ترانۂ حمد (سورۂ فاتحہ) جزوِ لاینفک کی حیثیت سے شامل ہے اور قیام و رکوع و سجود بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عہدِ حاضر کے مذہب وطنیت میں وطن کے دیوتا کے لیے بھی قومی ترانے ایجاد کیے گئے ہیں جن میں اس کی عظمت و تقدس کے راگ الاپے جاتے ہیں اور اُن کے دوران تعظیماً کھڑے ہونے اور وطن کی عظمت کے نشان کے طور پر قومی پرچم کو سلامی دینے کے مراسم عبودیت کی طرحِ نو ڈالی گئی ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانانِ عالم کی عظیم اکثریت نے بھی مغرب سے درآمد شدہ ان تمام چیزوں کو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔

(۸) روایتی علماء کی اکثریت حتیٰ کہ وہ بھی جن کا جذبہ توحید بہت قوی ہے' جو قبر پرستی کے خلاف صبح و شام تقریریں کرتے ہیں اور میلاد کی محفلوں میں قیام کو شرک قرار دیتے ہیں' وہ بھی اس شرک کو پہچان سکے نہ اس نئے دیوتا کے مراسم عبودیت پر ان کی رگِ توحید پھڑک سکی۔ اس کی نشان دہی کا سہرا اس مردِ قلندر کے سر ہے جو اپنے بارے میں خود یہ کہتا ہے ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا!
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

اور یہ کہ ؏

اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند!

(۹) میرے نزدیک اس معاملے میں علامہ اقبال مرحوم کو ایک معنوی نسبت حاصل ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ سے' جنہوں نے مغل دربار میں رائج **سجدۂ** تعظیمی میں چھپے ہوئے شرک کو پہچانا اور اُس کے خلاف علماء سوء کے فتوؤں کے علی الرغم علم جہاد بلند کیا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

کاش کہ جس طرح حضرت مجددؒ کے خلفاء کبار نے ان کے بعد ان کے مشن کو نہ

صرف جاری رکھا بلکہ آگے بڑھایا' علامہ مرحوم کے بھی ایسے معنوی خلفاء ہوتے جو عہد حاضر میں اُمت کی راہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہتے۔ ان سطور کا عاجز راقم اسے اپنے اوپر اللہ کے فضل کا مظہر اور علامہ اقبال سے ایک نسبتِ معنوی کا ثمرہ سمجھتا ہے کہ اسے اس حقیقت کا مشاہدہ ہوا کہ یہ قومی ترانہ اور اس کے دوران قیام اور قومی پرچم کو سلام دراصل معبودِ وطن کی نماز ہے۔ اسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اختیار کرلیا ہے۔ ان چیزوں کے ساتھ ہمیں وہی معاملہ کرنا چاہیے جو علامہ مرحوم نے تجویز کیا تھا کہ ؎

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے!

(۱۰) فلسفۂ توحید و شرک پر مبنی اس اصولی بحث سے قطع نظر اس مسئلہ کا ایک اہم پہلو اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔ جب ہم آپؐ کی شخصیت و سیرت کو اُسوۂ حسنہ اور اُسوۂ کاملہ مانتے ہیں تو سوچنا چاہیے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی قومی یا ملی ترانہ تلقین فرمایا تھا؟ اس کے بارے میں تو شاید یہ کہہ دیا جائے کہ اس زمانے میں اس کا چلن ہی نہیں تھا اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ممانعت ثابت نہیں' لہٰذا یہ مباح ہے لیکن اس معاملے میں بھی غور کریں کہ ترانوں کا رواج اس وقت بھی تھا (اگرچہ قومی ترانوں کا نہیں)۔ چنانچہ غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ کرامؓ کا یہ ترانہ بھی منقول ہے کہ وہ بیک زبان یہ شعر پڑھتے تھے: ؎

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدَا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا!!

''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمدؐ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی ہے جب تک بھی جان میں جان ہے!''

یہ بھی منقول ہے کہ صحابہؓ فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةْ ''اے اللہ! عیش تو بس آخرت ہی کا عیش ہے'' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی بحر اور قافیے میں جواباً فرماتے تھے: فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةْ ''اے اللہ! مغفرت فرما دے انصار اور مہاجرین کی اس جماعت مقدسہ کی!'' بایں ہمہ کوئی قومی ترانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو نہیں دیا۔ اس سے بھی زیادہ قوی دلیل یہ ہے کہ علَم مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تھا۔ اس علَم کو اونچا رکھنے کی

اہمیت آنحضورﷺ اور اہل ایمان کے نزدیک اتنی تھی کہ غزوۂ حنین میں جب ایک عام بھگدڑ مچ گئی تو آنحضورﷺ خود بنفس نفیس سواری سے اُترے‘ علم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔ غزوۂ اُحد میں حضرت مصعب بن عمیرؓ جو صاحب علم نبویؐ تھے‘ جب ان کا ایک بازو کٹ گیا تو دوسرے سے علم کو تھاما۔ وہ بھی کاٹ دیا گیا تو پھر دونوں بازوؤں کے بچے کھچے حصوں کی مدد سے علم کو سینے سے لگا لیا‘ لیکن گرنے نہ دیا تا آنکہ روح ہی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بایں ہمہ آنحضورﷺ نے کبھی علم کو سلامی نہیں دی اور نہ ہی صحابہؓ سے دلوائی۔ فافھموا وتدبروا!

(۱۱) اگرچہ ہمارے نزدیک اصل دلیل کتاب اللہ اور سنت رسولؐ ہے‘ تاہم اس معاملہ میں ایک مثال ہمیں سعودی عرب کی موجودہ حکومت کے طرزِ عمل سے بھی ملتی ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ ان کے یہاں جھنڈے کی سلامی کا رواج ہے یا نہیں‘ لیکن قومی پرچم کے ضمن میں انہوں نے پوری دنیا میں رائج اس رواج کو اختیار نہیں کیا ہے کہ افسوس یا ماتم کے مواقع پر جھنڈا سرنگوں (at half mast) کر دیا جائے۔ یہ ایک مثال ہے کہ ہمیں دنیا میں مروّجہ رسومات کو جوں کا توں قبول نہیں کر لینا چاہیے بلکہ اپنے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اُن کا جائزہ اور تجزیہ کرنا چاہیے۔ پھر خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَر کے اصول کے تحت صحیح اجزاء کو اختیار اور غلط کو ترک کر دینا چاہیے!

(۱۲) میری رائے جن دلائل سے بنی ہے وہ اوپر درج ہو گئے۔ مَیں اہل علم اور اصحابِ دانش سے درخواست کروں گا کہ وہ ان معروضات پر غور فرمائیں اور اس میں غلطی محسوس کریں تو اس کی نشان دہی فرمائیں۔ مَیں ان کا شکر گزار رہوں گا۔ اگر مَیں قائل ہو گیا تو ان شاء اللہ کسی جھوٹی انا یا عزتِ نفس کو آڑے نہیں آنے دوں گا‘ بشرطیکہ دلائل کتاب و سنت سے ہوں۔ بقول امام احمد بن حنبلؒ: اِيْتُوْنِيْ بِشَيْءٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ حَتّٰى اَقُوْلَ ’’لاؤ میرے پاس کوئی دلیل اللہ کی کتاب سے اور اُس کے رسولؐ کی سنت سے تو مَیں مان لوں گا۔‘‘ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا !

(۱۳) یہ مجھ پر بہتان ہے کہ مَیں نے قومی ترانے کے دوران کھڑے ہونے والوں یا

قومی پرچم کو سلامی دینے والوں کو مشرک قرار دیا ہے۔ میری یہ بات بظاہر عجیب لگے گی کہ مَیں ان چیزوں میں شرک کا شائبہ تو پاتا ہوں لیکن ان کے مرتکبین کو مشرک قرار نہیں دیتا' لیکن ذرا سے تامل سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ دیکھئے! الف با تا بھی یقیناً علم ہی نہیں' کل علم کی اساس ہے لیکن کیا الف با تا پڑھ جانے والا عالم قرار دے دیا جائے گا؟ لفظ عالم کا اپنا ایک مفہوم (connotation) ہے۔ جب تک وہ مفہوم کسی ادنیٰ درجے میں بھی پورا نہ ہو' کسی پر لفظ عالم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی چیز میں شرک کا شائبہ یا آمیزش ہونا اور بات ہے جبکہ اس کے مرتکب کو مشرک قرار دینا بالکل دوسری بات ہے۔ یہ منطقی مغالطے (logical fallacies) بڑے خوف ناک ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ بعض لوگ اس حدیث نبویؐ سے کہ ((مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ)) یہ منطقی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی' وہ کافر ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! صحیح بات یہ ہے کہ نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دینے میں یقیناً کفر کا شائبہ ہے لیکن بقول امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ مستقل تارکِ صلوٰۃ بھی کافر نہیں ہوتا۔ البتہ منکر صلوٰۃ (یعنی جو نماز کی فرضیت ہی کا انکار کر دے) ضرور کافر ہو جاتا ہے! لہٰذا میری اس رائے کو اس پر قیاس کیا جائے کہ قومی ترانے کے دوران قیام اور قومی پرچم کو سلام میں شرک کا شائبہ موجود ہے اگرچہ ان امور کے مرتکبین کو خصوصاً جبکہ وہ یہ سب کچھ نادانستہ اور غیر شعوری طور پر کر رہے ہوں' مَیں ہرگز مشرک قرار نہیں دیتا!

سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ!!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

***

محترم جناب جنرل محمد ضیاء الحق!

* تصریحات وتوضیحات
* ''میثاق'' جولائی ۱۹۸۲ء

(۱)

۳۱/اگست ۱۹۸۱ء

محترم ومکرم جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب بالقابہ

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر وصدرِ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ نے اس ناچیز کو ''ستارۂ امتیاز'' عطا فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے ورنہ ''من آنم کہ من دانم!'' خصوصاً عالم دین ہونے کا تو سرے سے مَیں مدعی ہی نہیں ہوں۔ میری اصل حیثیت قرآنِ حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی ہے اور زیادہ سے زیادہ حیثیت اس کے ایک خادم کی۔ اسے مَیں ''زیادہ سے زیادہ'' اس لیے قرار دے رہا ہوں کہ میرے نزدیک واقعتاً اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بندے کا سب سے بڑا اعزاز واکرام یہی ہے کہ وہ اسے اپنی کتاب کی خدمت کی توفیق عطا فرما دے۔ اس لیے کہ اس میں ایک ادنیٰ سی مناسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شانِ جلالت نشان سے قائم ہو جاتی ہے جو سورۃ القصص کی آیت ۸۵ میں واردشدہ الفاظِ مبارکہ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ میں بیان ہوئی ہے۔ بہرحال یہ سراسر اُسی کا احسان ہے کہ اس بندۂ ناچیز کو اس خدمت کے لیے قبول فرمالیا۔

منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی

منّت شناس از او کہ بخدمت بداشتت!

اس ''عطیہ'' پر میرے دل میں آپ کی قدر ومنزلت میں خصوصی اضافہ اس لیے بھی ہوا کہ میرا رویہ آپ کے لیے ہمیشہ چاپلوسی اور خوشامد کے بالکل برعکس تنقید وتنبیہ کا رہا' جس میں کبھی کبھی مَیں نے خود بھی محسوس کیا کہ قدرے تندی اور تیزی بھی آئی۔ اس سب کے باوصف اگر آپ میرا اعزاز واکرام فرما رہے ہیں تو یقیناً یہ آپ کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی دلیل ہے۔

اس موقع پر مَیں دو باتیں گوش گزار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ''الھُدیٰ'' کا ٹی وی پروگرام بفضلہٖ تعالیٰ جس قدر مقبول ہوا ہے' اس کا اندازہ آپ کو یقیناً ہوگا۔ کیا اس کے باوجود آپ اس کے وقت میں اضافے کی ہدایات جاری نہ فرمائیں گے؟ فی الوقت ٹی وی والے مجھے اپنی طے شدہ شرح سے معاوضہ دے رہے ہیں اور وہ مَیں قبول بھی کر رہا ہوں' لیکن میری پیشکش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ مَیں یہ خدمت بالکل بلا معاوضہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے خیال میں اس کا وقت کم از کم ایک گھنٹہ ہونا چاہیے' جس میں چالیس پینتالیس منٹ کا بیان ہو اور پندرہ بیس منٹ کے سوال وجواب۔

میری رائے میں آپ آخری انسان ہوسکتے ہیں جسے یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہو کہ اسلام کے نفاذ کے لیے لوگوں کے ''دل ونگاہ'' کو ''مسلمان'' بنانا ضروری ہے اور اس کے لیے فہم قرآن سے زیادہ موثر چیز کوئی نہیں ہوسکتی! لہٰذا آپ اس معاملہ پر غور فرمائیں اور ضروری احکام صادر فرمائیں۔

دوسرے یہ کہ مَیں اگرچہ ایک خالص غیر سیاسی انسان ہوں تاہم اندرونِ ملک اور وطن عزیز کے گردوپیش کے حالات کے بارے میں غور وفکر ضرور کرتا ہوں۔ ملک کے اندرونی مسائل کے بارے میں مَیں نے ایک مشورہ خالصتاً نصح وخیر خواہی کے جذبے کے ساتھ گزشتہ سال علماء کنونشن سے متصلاً قبل منعقد ہونے والی مشاورت کے موقع پر چند منٹ کی نجی گفتگو میں دیا تھا۔ اب ایک بات خارجہ پالیسی کے ضمن میں گوش گزار کرنا چاہتا

ہوں، جس کے لیے مَیں بالکل علیحدگی میں اطمینان کے ساتھ ایک ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اس کے لیے جلد از جلد طلبی کا پروانہ جاری فرما دیں۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

✿✿✿

(۲)

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ آج (۲۸ نومبر ۱۹۸۰ء) صدرِ مملکت جناب محمد ضیاء الحق صاحب نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے اس مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ ایک پہلو سے ذرا تکلیف بھی ہوئی ہے، چونکہ باغ میں ہم نے سکیورٹی کا کچھ زیادہ ہی اہتمام دیکھا (یہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ انڈونیشیا کے صدر جناب سوہارتو عصرانہ میں شرکت کے لیے باغ جناح میں تشریف لانے والے تھے)۔ بایں ہمہ صدر مملکت کی موجودگی ہمارے لیے بڑی مسرت کی بات ہے۔

مَیں اس موقع پر چند باتوں کی طرف صدر صاحب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ کام مَیں اس اُمید پر کر رہا ہوں کہ صدر صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں ایک خالص غیر سیاسی آدمی ہوں۔ مَیں اُس وقت بھی عملی طور پر غیر سیاسی آدمی تھا جب یہاں سیاست کی بڑی کھچڑیاں پک رہی تھیں اور بہت سے لوگوں نے بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے تھے۔ مَیں تمام ہنگاموں سے بالکل الگ تھلگ رہا اور اُسی کام میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہا جس کو مَیں نے پورے شعور اور محاسبۂ اُخروی کے احساسِ مسئولیت کے ساتھ اختیار کر کے اپنا نصب العین بنایا تھا، یعنی قرآن حکیم کی روشنی میں اعلائے کلمۃ اللہ اور تجدید ایمان کے لیے سعی و جہد اور دعوت و تبلیغ۔ الحمد للہ مَیں اس کام میں پوری یکسوئی کے ساتھ لگا رہا اور لگا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا صد ہزار شکر کہ اس نے ہر قسم کی سیاسی اور ہنگامی ترغیبات کی طرف مجھے آنکھ اٹھانے سے محفوظ رکھا ہے۔ میں فی الوقت

صاحب صدر کی خدمت میں جو معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اس اُمید پر کہ موصوف ان کو تحمل کے ساتھ سنیں گے۔

مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے۔ علماء کنونشن میں صدر صاحب نے لوگوں کی لمبی لمبی تقریریں جس تحمل وصبر کے ساتھ سنی ہیں' میں ان کے حوصلہ اور ہمت کی داد دیتا ہوں۔ لوگوں کی فکری و ذہنی سطح میں عظیم تفاوت ہوتا ہے۔ مختلف ذہنی وفکری سطح کے لوگ جب کسی پلیٹ فارم پر تقریروں کے لیے آتے ہیں تو ان میں کام کی تقریریں بھی ہوتی ہیں اور بھرتی کی بھی۔ ایسے مقررین بھی ہوتے ہیں جو زورِ بیان کے اظہار کے لیے اپنی تقریر طویل تر کر دیتے ہیں اور متعلق وغیر متعلق موضوعات پر کافی وقت لے لیتے ہیں۔ علماء کنونشن میں صدر صاحب نے بڑے سکون اور توجہ کے ساتھ سب کی باتیں سنیں۔ ان کے اس حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ لہٰذا میں نے ان کے اس وصف کا تذکرہ امریکہ کے اپنے حالیہ دورے میں متعدد مقامات پر اور یہاں اپنی تقریروں اور اپنے احباب و رفقاء کی مجالس میں بھی کیا ہے۔

مَیں اس موقع پر چند چھوٹی باتوں کی طرف صدر مملکت کی توجہ منعطف کرانا چاہوں گا۔ بڑی باتوں کا ذکر مَیں دانستہ نظر انداز کر رہا ہوں' چونکہ بات موقع ومحل کی مناسبت سے کہنی مفید ہوتی ہے۔ باتیں گو صرف بظاہر ہی چھوٹی ہیں ورنہ ان کا گہرا تعلق ہمارے مجموعی فکر کے ساتھ ہے۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا' اور بالکل درست کہا تھا' کہ ''ہم مسلمانوں کی ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ہم بڑی بڑی باتوں کے متعلق تو بہت سوچتے ہیں لیکن چھوٹی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں' حالانکہ یہ چھوٹی باتیں بسا اوقات بڑی باتوں کے حل میں مانع ہوتی ہیں۔''

مَیں صدر صاحب کی خدمت میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے جائزہ لیجیے کہ ہمارے ملک میں کرکٹ کو حکومت کی جو غیر معمولی سرپرستی حاصل ہے تو کیا یہ کھیل قرآن مجید کی طرف سے ہم پر عائد کیا گیا ہے یا سنت رسولؐ سے ماخوذ ہے؟ یا پھر ہماری روایات اور تہذیب کا کوئی لازمی حصّہ ہے؟ اس کھیل کی وجہ سے پانچ پانچ دن

ہماری پوری قوم معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس دوران دفتروں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ لوگ یا تو ٹی وی کھولے میچ دیکھتے ہیں یا ٹرانسسٹر ریڈیو کے ذریعہ اس کی کومنٹری سنتے ہیں۔ غور کیجیے کہ کتنا قیمتی وقت قومی سطح پر ضائع ہوتا ہے۔ ہماری اور بھی گیمز ہیں' جو ڈیڑھ دو گھنٹے میں مکمل ہو جاتی ہیں۔ ان میں ایکشن ہے' حرکت ہے' جواں مردی ہے۔ ایسی گیمز کی سرپرستی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن کرکٹ کا کھیل واقعہ یہ ہے کہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر کیوں ہم نے اس کو سرفہرست رکھ چھوڑا ہے جبکہ اس کا ہماری روایات اور تہذیب سے کوئی تعلق نہیں! کیا محض اس لیے کہ یہ ہمارے سابق بدیشی حکمرانوں کا خاص اور پسندیدہ کھیل ہے' اس کو جاری رکھا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کھیل کی سرپرستی کا کوئی جواز یا فائدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ قومی سطح پر محض وقت کا زیاں ہے۔ پھر اس کھیل پر لاکھوں کا خرچ ہوتا ہے جو فضول خرچی اور اسراف کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لیے میں عرض کروں گا کہ ہمدردی سے جائزہ لیجیے کہ اس کھیل کی سرپرستی سے قومی سطح پر نقصان اور فائدے کا تناسب کیا ہے۔ پھر کوئی مثبت قدم اٹھائیے۔

دوسری بات میں نبی اکرم ﷺ کے قول مبارک کے حوالے سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

> ''میں اپنی اُمت کے بارے میں جس بات کا سب سے زیادہ اندیشہ رکھتا ہوں وہ عورتوں کا فتنہ ہے۔'' (او کما قال ﷺ)''

خدا کے لیے سوچیے کہ ہمارے دین کی کچھ روایات ہیں' کچھ شعائر ہیں۔ ہماری شریعت میں جہاں زنا اور قذف کے لیے حدود و تعزیرات مقرر کی گئی ہیں' وہاں ستر و حجاب کے لیے بھی کچھ احکامات دیے گئے اور کچھ قیود عائد کی گئی ہیں۔ اگر آپ شریعت کے تمام احکام کو نافذ نہیں کریں گے تو یہ شریعت پر ظلم ہوگا اور لوگوں پر بھی ظلم ہوگا۔ ہمیں اپنی روایات کی طرف دیکھنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ ہم ان سے روگردانی تو نہیں کر رہے!

میں بڑی دل سوزی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ پتہ نہیں میری زندگی کتنی ہے اور کتنی زندگی صدر صاحب آپ کی ہے۔ لہٰذا قولِ حق کہنے میں نہ مجھے مداہنت اختیار

کرنی چاہیے اور نہ ہی آپ کو اس پر سنجیدگی سے غور وخوض کرنے میں تامل کرنا چاہیے۔ آپ سوچیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپ کے عہدِ حکومت میں پاکستان میں خواتین کی ہاکی ٹیم باہر جانے کے لیے تیار ہورہی ہے اور ایسے معاملات میں قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ سیلاب کا رخ موڑیں اور معاشرے سے وہ طور طریقے ختم کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دین کی رُو سے برائیاں ہیں اور ہماری اخلاقی اقدار کے قطعی منافی ہیں۔ خدا نے آپ کو اس کا موقع دیا ہے۔ سیاسی باتیں مَیں اس موقع پر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے۔ مَیں اپنا دینی فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے کتاب وسنت سے جو کچھ معلوم ہوا ہے‘ وہ نبی اکرم ﷺ کے قول مبارک الدِّین النَّصِیحۃ کی تعمیل میں آپ کے سامنے رکھ دوں۔

حجاب کے احکام ہماری شریعت کا جزو لاینفک ہیں۔ اُمہات المومنین ؓ کے لیے سورۃ الاحزاب میں جو احکام آئے ہیں‘ وہ محض تلاوت کے لیے نہیں بلکہ عمل کے لیے ہیں۔ جیسے ہمارے مردوں کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ اُسوۂ حسنہ ہیں‘ ہماری خواتین کے لیے بھی تو اُسوہ چاہیے تھا۔ سورۃ الاحزاب ہی میں یہ آیت آئی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) ’’بلاشبہ اے مسلمانو! تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ ایک بہترین و کامل نمونہ ہے۔‘‘ خواتین کی زندگی کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے لیے نبی اکرم ﷺ کی زندگی اُسوہ نہیں بن سکتی۔ اس ضرورت کے لیے ہماری خواتین کے لیے اُسوہ ہے اَزواجِ مطہرات ؓ کا۔ اسی لیے سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (آیت ۳۲) ’’اے نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو‘‘ یعنی تمہیں تو اُمت کی خواتین کے لیے نمونہ بننا ہے۔ ’’اگر تم میں سے کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو اسے دہری سزا دی جائے گی‘‘ (آیت ۳۰) اور ’’تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی‘ اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے۔‘‘ (آیت ۳۱) ازواجِ مطہرات کو جو تنبیہ کی گئی اور جو بشارت دی گئی تو یہ معاملہ غور وفکر کا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان آیات پر

تدبر کریں اور ان سے جو ہدایات اخذ ہوں' ان پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں سے عمل کرانے کی حتی الامکان اور حتی الوسع کوشش کریں۔ انگریز کی غلامی اور دوسرے اسباب سے ہمارے معاشرے کی ذہنی واخلاقی اقدار وروایات میں زبردست انحطاط آیا ہے۔ ہماری معیشت کا ایسا ڈھانچا بن گیا ہے جس میں عورتیں معاشی میدان میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا مسئلہ کافی پیچیدہ ہے۔ لیکن Where there is a will, there is a way۔ یعنی عزم مصمم ہو اور یہ ارادہ کرلیا جائے کہ کام کرنا ہے' اپنی روایات اور اپنے دین کی تعلیمات کو اختیار کرنا ہے تو ان شاء اللہ راہ آسان ہو جائے گی۔

تیسری بات یہ کہ صدر ایوب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے تھے' ان کو پاکستان کے ہر مکتبِ فکر کے علماء کرام نے غلط قرار دیا تھا لیکن آج بھی ان کو تحفظ حاصل ہے۔ خدا کے لیے سوچیے کہ جو قوانین بالاتفاق شریعت سے متصادم ہیں' وہ کیوں نافذ رہیں! ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لے اور آپ اس ملک کی تاریخ میں ایک عظیم شخصیت کا مقام حاصل کریں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لوگ پہلے بھی اقتدار میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مواقع دیے لیکن بدقسمتی سے وہ محروم رہ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا نام بھی ایسے لوگوں میں شامل ہو۔ لہٰذا میری مخلصانہ اپیل ہے کہ جو مواقع آپ کو حاصل ہیں' ان کو غنیمت سمجھا جائے۔ تبدیلی اور اصلاح کا آغاز چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے کیجیے۔ ''قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔'' مَیں نے کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ قولِ حق کو سنیں اور قرآن حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ کا کامل مصداق بنیں: ﴿اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ (الزمر: ۱۸) ''جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں' پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔'' یعنی جو صحیح بات بھی آپ کے گوش گزار ہو' اس کو عزمِ مصمم اور بہترین طریق سے روبعمل لانے کی توفیق پائیں۔ آمین یاربّ العالمین!

***

سیاسی تعطل کا خاتمہ: ایک تجویز

* صدرِ پاکستان کے نام خط
* ''میثاق'' فروری ۱۹۸۳ء

۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء

مکرمی و محترمی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدرِ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! مندرجہ ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں:

مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ میں معروف اور مروّجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں ہوں اور میرے بیشتر اوقات اور تمام تر مساعی مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لیے میدان ہموار کرنے کی غرض سے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لیے وقف ہیں۔ (چنانچہ یہی مجلس شوریٰ سے میرے استعفیٰ کا اہم ترین سبب تھا!)

ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکتی کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہوسکتا۔ بایں معنی کہ وہ ملک و ملت کے حالات سے قطعاً بے خبر یا لاتعلق رہے اور قوم و وطن کی صلاح و فلاح یا ان کو درپیش خطرات و خدشات کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر سے بھی کام نہ لے۔

چنانچہ مَیں بھی اس ضمن میں اپنی امکانی حد تک حالات کا مشاہدہ بھی کھلی آنکھوں سے کرتا ہوں اور دوسروں سے تبادلہ خیال بھی کھلے قلب و ذہن کے ساتھ کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے ان دَوروں اور سفروں سے بھی مدد ملتی ہے جو دعوتی و تبلیغی مساعی کے ضمن میں اندرونِ ملک یا بیرونِ وطن کرنے پڑتے ہیں۔ پھر خود غور و فکر بھی کرتا ہوں اور

اس کے نتیجے میں جو رائے بھی میری بنے' مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے مطابق مشورہ پورے نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ عوام کو بھی دوں اور ان کو بھی جن کے ہاتھوں میں ملک وقوم کی زمامِ کار ہے۔ ازروئے فرمانِ نبویؐ: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ)) یعنی دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی اور وفاداری کا ہے۔ جب پوچھا گیا: ''لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟'' یعنی حضورﷺ! کس کے ساتھ؟ تو ارشاد ہوا: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ)) یعنی اللہ اور اُس کی کتاب اور اُس کے رسول کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور مسلمانوں کے اولوالامر اور عوام دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی!

آج سے سوا دو سال قبل اغلباً ۱۸/اگست ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں علماء کنونشن سے قبل منعقدہ مشاورتی اجلاس کے موقع پر مَیں نے چند منٹ علیحدگی میں گفتگو کے دوران بعض مشورے آپ کے گوش گزار کیے تھے جن کا تعلق اکثر و بیشتر ملک کی سیاسی صورتِ حال سے تھا۔ پھر جب اوائل مئی ۱۹۸۲ء میں لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ''شوریٰ'' سے اپنا استعفا پیش کرنے حاضر ہوا تھا' تب بھی میں نے بعض مشورے دیے تھے جن کا تعلق اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ سے تھا۔ اللہ گواہ ہے' اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل بھی گواہی دے گا کہ ان دونوں مواقع پر میرا محرک مندرجہ بالا حدیث نبویؐ کے مطابق نصح و خیر خواہی کے جذبے کے سوا اور قطعاً کچھ نہ تھا! خالصتاً اسی جذبے کے تحت آج پھر مَیں اس عریضے کے ذریعے حاضر خدمت ہو رہا ہوں' اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے حق کہنے اور آپ کو حق سننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

آمِین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ

جہاں تک اس ملک میں اسلامی شعائر کی ترویج اور شریعت اسلامی کے نفاذ یا بالفاظِ دگر اسلامی نظام کے قیام کا تعلق ہے' اس کے بارے میں مجھے اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا۔ اس کا اصل سبب معذرت کے ساتھ یہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں اور عرض و معروض یا گلہ و شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو!

ذہنی وفکری اور اخلاقی و عملی ہر اعتبار سے نہایت بگڑے ہوئے اس معاشرے میں اسلام کا قیام ونفاذ کوئی آسان کام نہیں اور اس کے لیے یقین محکم پر مبنی جرأتِ مؤمنانہ اور علم راسخ پر مبنی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ آپ کو تقدیر الٰہی نے ایک موقع عطا فرمایا تھا کہ ع ''بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا'' کے مصداق اگر دین حق کے قیام ونفاذ کے لیے بھرپور کوشش اور پورے جرأت مندانہ اقدام کے باوجود خدانخواستہ ناکام رہتے تو کم از کم ایک ایسی مثال تو تاریخ میں چھوڑ جاتے کہ اگر ایک غیر مسلم (ایڈورڈ ہشتم' پرنس آف ویلز بعدہٗ ڈیوک آف ونڈسر) ایک عورت کی خاطر وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تخت سے دست بردار ہو سکتا ہے تو ایک مسلمان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اسلام کی خاطر حکومت و اقتدار کو قربان کر سکتا ہے۔ مجھے شدید افسوس ہے کہ آپ اس موقع کا حق ادا نہ کر سکے!

اس ضمن میں' جیسا کہ میں نے ۲۰/اگست ۱۹۸۰ء کو علماء کنونشن میں عرض کیا تھا' ابتدائی تین سال جو اس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ ''تحریک نظامِ مصطفیٰ ؐ'' کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظام اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا' تعطل اور تربص کی نذر کر دیے گئے۔ اس طرح اُسی غلطی کا اعادہ ہو گیا جس کا ارتکاب پاکستان میں برسر اقتدار آنے والی اوّلین قیادت نے کیا تھا۔

پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈیننس کا اجرا ہوا اور اس پر اہل تشیع کی جانب سے جارحانہ ردعمل آیا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیے گئے بلکہ زیادہ قابل افسوس بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سنیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا' اس کے باوجود کہ مَیں نے ۱۸/اگست ۱۹۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسب سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دے دیں لیکن خدارا اس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمائیے گا۔

اجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے۔ اس ضمن

میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرہ کار میں لانے کی جرأت آپ اس لیے نہیں کر پا رہے کہ اعلیٰ طبقات کی بعض بیگمات اور کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردّ عمل کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف معاشرے میں خواتین کے مقام و کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں ''چادر اور چار دیواری'' کے ضمن میں اسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گزشتہ دنوں ہمارے ملک میں زور شور سے ظاہر ہوئے' اس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لیے اطمینان بخش تھیں لیکن عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند حلقے میں ڈال رکھا ہے۔ (بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سر سے چادر بھی اُتر گئی اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو گیا از خود بھی فیصلہ کن تھا' لیکن اس پر مزید مہر تصدیق آپ کے ان فرمودات سے ثبت ہو گئی جو اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے گئے تھے۔)

بنا بریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کا عظیم معرکہ آپ کے ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی۔ مجھے اس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے آسکتا ہے' آپ کے اس جملے نے بھی مدد دی ہے جو رحیم یار خان میں بلدیاتی نمائندوں کے اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کہ ''آپ نفاذِ اسلام کے لیے یہ کیوں نہیں کرتے؟ اور وہ کیوں نہیں کرتے؟'' کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''بیٹی! اس ملک میں اسلام کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں نہیں آ رہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اٹھا سکیں۔'' (یہ روایت ہے رحیم یار خان کے معروف دینی اور سماجی کارکن ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب کی' جو اس خاتون کونسلر کے ماموں ہیں)

تاہم پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے ضمن میں ایک مشورہ میں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور اصلاً اسی کے لیے یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں' چونکہ مجھے اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور حالات کے تجزیے اور جائزے سے شدید اندیشہ لاحق

ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ کہے کہ ''۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی جو عظیم ترین مملکت وجود میں آئی تھی اُسے اولاً تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کے مزید ٹکڑے ہونے (balkanisation) کا حادثہ رونما ہوا ایک پابندِ صوم وصلوٰۃ اور دین دار و پرہیز گار شخص کے ہاتھوں!'' معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ!!

۱۸/اگست ۱۹۸۰ء کو بالکل علیحدگی میں گفتگو کے دوران مَیں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ ''ملک میں جو سیاسی خلا مارشل لاء کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے' اس کو دور کرنے کے لیے آپ کے ذہن میں نقشہ کیا ہے؟ میری رائے میں تو یہ سیاسی خلا خودکشی کے مترادف ہے!'' اس پر آپ نے گہرے تأثر کے انداز میں فرمایا تھا کہ ''ڈاکٹر صاحب! مَیں نے اپنا تو جائزہ لے لیا ہے کہ میرے اندر ہمت نہیں ہے (جس کے معنی مَیں نے یہ لیے تھے کہ آپ صدر ایوب مرحوم کے طرزِ عمل کی جانب اشارہ کر رہے ہیں) لیکن موجودہ سیاسی جماعتوں کو حکومت دے دینے کو بھی میں اتنا ہی suicidal سمجھتا ہوں اور تیسری کوئی شکل موجود نہیں ہے!'' اس پر مَیں نے عرض کیا تھا کہ ''نہیں جناب! تیسری صورت موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ غیر جماعتی بنیاد اور shortest possible notice پر الیکشن کرا دیں۔'' آپ نے فرمایا تھا کہ ''ہاں اس پر ہم غور کر رہے ہیں کہ شارٹ نوٹس اور no party basis نیز ایک ایل ایف او کے ساتھ الیکشن کرا دیں!'' آخر میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ ''یہ بالکل درست خیال ہے لیکن آپ آخر کب تک سوچتے رہیں گے؟ جلدی کیجیے! Time is running out for you۔'' آج اس گفتگو کو سوا دو سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن افسوس ہے کہ وہ سیاسی خلا جوں کا توں موجود ہے اور آپ کی جانب سے اس کو دور کرنے کے لیے تا حال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اس ضمن میں غالباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے خلاف کوئی عوامی تحریک نہ تا حال چل سکی ہے' اور نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے۔ مَیں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اس صورتحال سے دھوکا نہ کھائیے۔ اس لیے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبّ وطن بالخصوص دینی و

مذہبی مزاج کے لوگ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہیں۔ بین الاقوامی حالات میں کوئی تبدیلی کسی بھی وقت رونما ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کہ کسی ملک کے بقا واستحکام کے لیے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے' لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کا اطمینان ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بالخصوص اندرون سندھ جو لاوا پک رہا ہے' مجھے یقین ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہوگا' لیکن بعض اوقات صاحب اقتدار لوگوں کے اردگرد ایسے لوگوں کا حصار قائم ہو جاتا ہے جو اسے صحیح صورت حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔ واللہ اعلم!

میرے اندازے میں ''سندھو دیش'' کے لیے میدان پوری طرح اُسی انداز سے ہموار ہو چکا ہے جیسے ''بنگلہ دیش'' کے لیے ہوا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دور اور کٹا ہوا تھا' اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی جبکہ سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جا سکتا ہے۔ البتہ میرے نزدیک اس عامل (factor) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔

ایک جانب ہم اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں' اس میں اکثر سیاسی جماعتوں کے ''مبینہ'' موقف کے مطابق ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتقالِ اقتدار کے لیے فوری انتخاب میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں۔ دوسری جانب ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں آپ کے ذہن میں جو مختلف تجویزیں ہیں' وہ بھی ملک وملت کی خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہیں۔ تیسری جانب مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بھی جو اختلافِ رائے سامنے آ رہا ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط؟ — حسبِ سابق ہوں یا متناسب نمائندگی کے اصول پر؟ وغیرہ وغیرہ — وہ بھی یقیناً خلوص واخلاص ہی پر مبنی ہیں۔ تاہم' میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے! کیا صرف آپ اور آپ کے ''رفقاءِ کار'' یعنی مارشل لاء انتظامیہ؟ یا زیادہ سے زیادہ وہ سیاسی جماعتیں جو کسی درجے میں آپ کی منظورِ نظر ہیں یا کم از کم آپ کے لیے قابل قبول ہیں؟ یا کوئی اور؟

مَیں اس مسئلہ پر کم وبیش چھ ماہ سے مسلسل غور کرتا آ رہا ہوں۔ ایک رائے جس پر

میرا دل ٹھک گیا ہے‘ تجویز کی صورت میں خالصتاً ملک وملت اور خود آپ کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت سامنے رکھ رہا ہوں۔ وہ تجویز یہ ہے کہ:

(۱) ملک میں ایک انتخاب فوراً ہو‘ یعنی فروری یا مارچ ۱۹۸۳ء میں۔ یہ انتخاب انتقالِ اقتدار یا تشکیل حکومت کے لیے نہ ہو بلکہ ایک ''منتخب مجلس شوریٰ'' یا ''مجلس ملی'' کے لیے ہو۔ اس میں حق رائے دہی کی اساس اور حلقہ جات کی تشکیل تو بالکل وہی ہو جس پر فروری ۱۹۷۷ء میں انتخابات ہوئے تھے لیکن ہو یہ خالص غیر جماعتی بنیاد پر!

(۲) اس طرح جو مجلس شوریٰ یا مجلس ملی وجود میں آئے‘ اس کے سامنے ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں جو تجاویز آپ کے سامنے ہیں‘ وہ آپ رکھیں اور طرزِ انتخاب وغیرہ کے ضمن میں جو باتیں دوسرے لوگوں کے سامنے ہیں‘ انہیں وہ رکھیں۔ ان تمام امور پر یہ مجلس ایک سال کے عرصے کے اندر اندر فیصلہ دے‘ جو نہ صرف یہ کہ دو تہائی اکثریت پر مبنی ہو بلکہ ہر صوبے سے منتخب شدہ لوگوں کی بھی کم از کم نصف تعداد لازماً اس میں شامل ہو!

(۳) اگر یہ مجلس اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے سر کر لے اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ نظام تجویز کر دے تو مارشل لاء انتظامیہ تین سے چھ ماہ کے عرصے کے اندر اندر اس کے مطابق انتقالِ اقتدار اور تشکیل حکومت کے لیے الیکشن کرا دینے کی پابند ہو۔ اگر وہ مجلس ایک سال کے اندر اندر تفویض کردہ ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو وہ از خود تحلیل ہو جائے اور پھر تین سے چھ ماہ کے عرصے میں اسی کا انتخاب دوبارہ ہو اور جب تک مطلوبہ اتفاق رائے (consensus) حاصل نہ ہو‘ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس دوران میں فوج کے لیے نہ صرف اخلاقاً جائز بلکہ ملک وقوم کی حفاظت و سالمیت کے اعتبار سے لازم سمجھا جائے کہ وہ care taker کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلاتی رہے!

اس تجویز کے محاسن یا روشن پہلوؤں پر گفتگو کو میں اس لیے تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں۔ البتہ اس کے خلاف اس واحد دلیل کا جائزہ لینا لازمی ہے جو

بادی النظر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے‘ یعنی کہ مجوزہ مجلس شوریٰ یا مجلس ملی کہیں ایک بھرپور ”دستوریہ“ (full-fledged Constituent Assembly) کا کردار اختیار نہ کر لے اور دستور کے Pandora's Box کھول کر ان نازک اور پیچیدہ مسائل کو ازسرنو نزاعی نہ بنا دے جو ۱۹۷۳ء کے دستور میں طے شدہ ہیں)۔

میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور اور بودی ہے‘ اس لیے کہ مسائل کا حل ان سے اعراض اور صرفِ نظر سے نہیں بلکہ مقابلے اور مواجہے (یعنی face کرنے) ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ پاکستان کا قیام محض ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ ہندوؤں ایسی منظم‘ بیدار قوم اور وقت کی حکمران طاقت (لیبر گورنمنٹ) کی متفقہ خواہشات کے علی الرغم اس لیے قائم ہوا کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کے انتقامی طرزِ عمل کے اندیشے کا منفی محرک موجود تھا‘ دوسری طرف احیائے اسلام کا مثبت جذبہ تھا جسے قائداعظم مرحوم کے مسلسل اعلانات نے ایک نہایت قوی اُمید کی صورت دے دی تھی‘ اور تیسری طرف ارادۂ الٰہی اور مشیتِ ایزدی بھی شاملِ حال تھی جو اصل فیصلہ کُن عامل ہے۔ یہ تینوں عوامل اب بھی پوری قوت وشدت کے ساتھ موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے‘ mobilise کیا جائے۔ یہ کام ان شاء اللہ اس مجوزہ مجلس شوریٰ اور اس کے لیے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعہ ہو جائے گا۔ چونکہ یہ انتخابات نہ تشکیل حکومت کے لیے ہوں گے اور نہ ہی جماعتی بنیاد پر‘ لہٰذا اس میں سیاسی حلقوں اور جماعتوں کی صف بندی خالصتاً اس اساس پر ہوگی کہ کون محبِ دین‘ محبِ وطن ہے اور کون لادینیت‘ الحاد‘ مادہ پرستی‘ اباحیت اور علاقائی ولسانی قومیتوں کا پرستار! مجھے یقین ہے کہ اگر تقسیم اس واضح اساس پر ہو تو ان شاء اللہ فیصلہ کن فتح محبِ اسلام اور محبِ پاکستان قوتوں ہی کو حاصل ہوگی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اکثر مبصرین اور تجزیہ نگار حضرات نے کہا تھا کہ وہاں اگر لوگوں کے سامنے اصل مسئلہ یہ رکھا جاتا کہ: پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اُس سے علیحدہ ہونا؟ تو عوام کی غالب اکثریت لامحالہ متحدہ پاکستان کے حق میں رائے دیتی! مجھے اس تجزیہ سے کامل اتفاق ہے۔ میری تجویز پر عمل درآمد کے نتیجے میں

ان شاء اللہ العزیز تحریکِ پاکستان کے ازسرنو احیاء کا وہ مقصد باحسن وجوہ حاصل ہو جائے گا جس کے لیے آپ ہر سال یوم پاکستان‘ یومِ اقبال اور عید میلاد النبیؐ منانے میں کروڑوں روپے صَرف کرر ہے ہیں (جو معاف فرمایئے اکثر و بیشتر ضیاعِ محض ہے)۔

مَیں اپنی اس تجویز اور اس کی افادیت پر بحمد اللہ عقلی اور نظری اعتبار سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس کے ساتھ میرا ایک وجدانی احساس بھی ہے‘ جسے مَیں آپ پر ظاہر کر دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔ وہ یہ کہ سورۃ المائدۃ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ مصر کے طویل دورِ غلامی کے نتیجے میں ان میں سیرت و کردار کا جو زوال و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا وہ چالیس برس کی صحرانوردی کے بعد رفع ہو سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں بھی آزادی کے بعد بے یقینی اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بھٹکتے ہوئے چالیس برس کے لگ بھگ ہونے کو آئے ہیں‘ تو کیا عجب کہ اب اس بھٹکے ہوئے راہی کو منزل کا سراغ مل ہی جائے۔ مملکتِ خداداد پاکستان عالمی سطح پر احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے انقلاب آفرین عمل کے ضمن میں اپنے مثبت کردار کو ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہو ہی جائے! وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

بصورتِ دیگر مجھے شدید اندیشہ ہے کہ ہمارا ملک تدریجاً جس محاذ آرائی کی جانب بڑھ رہا ہے اس کے دھماکا خیز صورت اختیار کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ آپ نے تا حال امریکہ اور روس کے مابین جو نازک توازن برقرار رکھا تھا‘ اس میں آپ کے حالیہ دورۂ امریکہ کے بعد جو تبدیلی آئی ہے اس کی بنا پر روس اور بھارت دونوں ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس کا نتیجہ ملک و ملت کے حق میں کسی طرح بھی خوش آئند نہ ہوگا۔

فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

***

کرکٹ: ایک وضاحتی بیان

* متعدد روزناموں میں شائع ہوا۔

* ''میثاق'' مارچ ۱۹۸۳ء

ہمارے ملک میں سیاست پر پابندی کے باعث چونکہ گرما گرم خبریں نہیں ملتیں لہٰذا بعض اخبارات نے یہ مشغلہ اختیار کرلیا ہے کہ کچھ معاملات کو ان کی اصل اہمیت سے زیادہ اچھال کر اور ان کے ضمن میں اِدھر اُدھر سے مخالفانہ یا موافقانہ باتیں حاصل کر کے جو بسااوقات بالکل غلط اور سیاق و سباق سے جدا بلکہ ''طبع زاد'' بھی ہوتی ہیں' اپنے قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کرکٹ کے بارے میں میری رائے کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا ہے۔ چنانچہ کراچی کے بعض انگریزی اخبارات نے اس مسئلے کو سب سے بڑی سرخی کا موضوع بنایا جبکہ اسلام آباد کے ایک روزنامے نے تو میری طرف ایک ایسی بات منسوب کی جس کا میری زبان سے ادا ہونا تو در کنار کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی گزر نہیں ہوا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس پر ایک ادارتی نوٹ بھی لکھ مارا۔ بنابریں اس ضمن میں اپنے خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں اور قومی اخبارات سے اپیل کرتا ہوں کہ میرے اس بیان کو حتی الامکان مِن وعَن شائع کر دیں۔

(۱) جہاں تک کرکٹ کے کھلاڑیوں کا تعلق ہے' مجھے ہرگز ان سے نہ کوئی پرخاش ہے نہ بغض بلکہ ان میں سے جنہوں نے محنت' مشقت اور ریاضت سے اس میں مہارت حاصل کی ہے' پوری قوم کی طرح میرے دل میں بھی ع ''کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی!'' کے مصداق ان کی قدر ہے۔

(۲) خود کرکٹ کے کھیل کے بارے میں بھی مَیں نے کبھی کوئی اعتراض دین و مذہب کے نقطۂ نگاہ سے نہیں کیا۔ اس اعتبار سے یہ بھی دوسرے کھیلوں کے مانند ایک کھیل ہے کہ اگر ان سے مناسب تفریح یا جسمانی ورزش کے مقاصد حاصل ہوں تو ہرگز

کوئی قابل اعتراض بات نہیں، لیکن اگر ان کے باعث دینی فرائض سے غفلت ہو جائے تو سخت قابل مذمت ہے۔ یہ معاملہ سب کھیلوں کا ہے، صرف کرکٹ کا نہیں!

(۳) قومی اور ملکی نقطہ نظر بالخصوص قومی معاشیات کے اعتبار سے میرے نزدیک کرکٹ کے کھیل میں متعدد پہلو محل نظر ہیں، اس لیے کہ اس میں وقت اور پیسے کا صَرف بلکہ ضیاع بہت ہے اور اس کے مقابلے میں فوائد کا پہلو بہت کم۔ چنانچہ اس کا میچ پانچ پانچ روز تک جاری رہتا ہے جس کے دوران لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی توجہ اسی جانب مرکوز رہتی ہے۔ پھر اس میں حرکت بھی بہت سُست رہتی ہے اور فاسٹ ایکشن بس کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اکثر و بیشتر میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کھیل کے یہ نقائص اتنے اظہر من الشمس ہیں کہ ان کے بارے میں دلائل دینے کی قطعاً حاجت نہیں ہے۔

(۴) بنابریں میری خواہش اول تو یہ ہے کہ اس معاملے پر کرکٹ کے شائقین اور کھیلنے والوں سمیت سب حلقے سنجیدگی سے غور کریں اور اس کھیل کو قومی مصلحتوں کے پیش نظر ملک بدر ہی کر دیں۔ بصورتِ دیگر اگر یہ انتہائی قدم گوارا نہ ہو تو بھی کم از کم یہ اقدامات ضرور کیے جائیں:

(i) جمعہ کے روز یہ کھیل کسی صورت میں نہ کھیلا جائے۔ (واضح رہے کہ اس کھیل کی اصل جنم بھومی یعنی انگلستان میں اتوار کو یہ کھیل نہیں کھیلا جاتا)

(ii) اس کھیل کی تشہیر قومی ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ بند کر دی جائے۔ شائقین اسے میدان میں جا کر دیکھیں اور وہاں بھرپور رونق ہو لیکن اس کھیل کے باعث ملک وقوم کے پورے ماحول پر تعطل کی سی کیفیت نہ ہو۔

(iii) محدود اوورز کے کھیل ان ممالک میں جہاں یہ کھیل زیادہ مقبول ہے، کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ اگر پاکستان میں اس کھیل کو جاری رکھنا ہی ہے تو ایک روزہ کرکٹ تک ہی اسے محدود کیوں نہ رکھا جائے۔ اس سے وقت اور سرمائے کی کافی بچت ہو سکے گی اور کھیل لازماً ہار جیت پر ختم ہوگا جو لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

***

سندھ کی صورتِ حال اور اصلاحِ احوال

* خطابِ جمعہ (۲۶ اگست ۱۹۸۳ء)
* ''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۳ء

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

سورۃ الانفال میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

گزشتہ جمعہ مَیں یہاں موجود نہیں تھا بلکہ بلتستان کے ایک اہم شہر سکردو میں تھا۔ ۱۲/اگست کے جمعہ میں مَیں نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ آئندہ جمعہ میں مَیں حاضر نہ ہوسکوں گا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سکردو کے لیے پی آئی اے کی پرواز بالکل غیر یقینی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ دو دو ہفتہ فضائی سروس کا سلسلہ معطل رہتا ہے۔ اس لیے کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مَیں جا بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس لیے مَیں نے اس کا پیشگی اعلان نہیں کیا تھا۔

بلتستان کے حالات

بلتستان بہت دُور دراز ایک وادی ہے، جو کہ کشمیر کے شمال مشرق تک چلی گئی ہے اور لداخ کے ساتھ تک ملی ہوئی ہے۔ اس کے بہت ہی مخصوص حالات ہیں۔ خاص طور پر سنی شیعہ اختلاف والا معاملہ بہت ہی شدت پر ہے۔ یہاں پر شیعہ حضرات غالب اکثریت میں ہیں۔ اہل سنت بہت کم ہیں' شاید آبادی کا دس بارہ فیصد ہوں۔ البتہ وہاں ایک درمیانی فرقہ ہے جو ایک صوفی بزرگ حضرت نور بخشؒ کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر نور بخشی کہلاتا ہے۔ یہ سنی اور شیعہ حضرات کے بین بین ہے۔ وہاں کے کچھ مخصوص حالات ہیں جن کا ذکر علی الاعلان مناسب نہیں۔

میں جب پچھلے سال وہاں جا رہا تھا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک عجیب کش مکش ہے۔ شیعہ حضرات کی جانب سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ مجھے وہاں داخل نہ ہونے دیں گے' ایئر پورٹ ہی سے واپس جانے پر مجبور کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے حالات پیدا فرمائے کہ میرا وہاں کا دورہ بہت کامیاب رہا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شیعہ سنی اختلاف میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ وہاں کے ایک بہت بڑے شیعہ عالم نے میری تقریر کی بہت تعریف بھی کی تھی۔ یہ معاملہ خپلو میں ہوا تھا' جو بلتستان کا قدیمی اور مرکزی شہر ہے۔ یہ تہذیب و ثقافت کا بھی مرکز ہے' اگرچہ انتظامی اعتبار سے اب سکردو کی اہمیت زیادہ ہے۔

اس دفعہ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے سکردو میں دس تقریریں کیں۔ ان میں درسِ قرآن' خطاباتِ عام اور خطباتِ جمعہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک استقبالیہ بھی ہوا۔ اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور شیعہ حضرات نے کہا کہ اگر ایسا ہے جیسا کہ

آپ نے بیان کیا ہے تو ہمیں کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ اب وہاں کی فضا الحمدللہ بہت اچھی ہو گئی ہے۔ وہاں میرے قیام کی آخری رات کو ایک ہوٹل میں استقبالیہ تھا۔ اس میں شہر کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران اور معروف شخصیتوں کے علاوہ اہل تشیع کے چوٹی کے رہنما بھی موجود تھے۔ یہ اجتماع بڑے خوش گوار ماحول میں ہوا۔ مجھے اب شدّت سے احساس ہے کہ اگر ان مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور سیاسی معاملات سے بالاتر ہو کر بات کی جائے تو اس ساری فرقہ واریت میں جس کا افسانہ کچھ زیادہ ہی گھڑ لیا گیا ہے' خاصی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ ان معاملات میں جلتی پر تیل کا کام سیاسی اغراض و مقاصد کرتے ہیں۔ جب سیاسی مفاد کے حصول کے لیے مذہب کو استعمال کیا جاتا ہے تو مذہبی اور فروعی اختلافات کو ہوا ملتی ہے۔ اصل میں یہ سب مذاہب ہیں' دین تو ایک ہی ہے۔ حضرت آدمؑ سے حضرت محمد ﷺ تک دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ ہاں البتہ شریعت بدلتی رہی ہے لیکن دین موسوی' دین عیسوی' دین نوح اور دین محمدی ﷺ میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں جتنے بھی اختلافات ہیں' وہ فقہی اور جزوی نوعیت کے ہیں۔ اگر وحدتِ دینی کا تصور ہو تو ان اختلافات کی اہمیت خود بخود کم ہو جائے گی اور یہ پس منظر میں چلے جائیں گے۔ مگر جب پیش نظر اپنی بھیڑوں کو جمع کرنا ہو' اپنی تعداد بڑھانی ہو اور آئندہ الیکشن کے لیے ووٹوں کا اہتمام کرنا ہو تو پھر ان اختلافات کو خوب اچھالا اور تضادات کو نمایاں کیا جائے گا۔

الحمدللہ! میرے ان دو دَوروں سے وہاں کے حالات میں بہتری کی صورت پیدا ہوئی ہے اور ایک خوش گوار ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کیفیت کو برقرار رکھے' اور مزید بہتری کے آثار پیدا فرمائے!

ملکی حالات

پچھلے دو ہفتے کے دوران میں دو نہایت اہم واقعات تو ملکی سطح پر رونما ہوئے ہیں اور ایک چھوٹا سا معاملہ اس مسجد اور میری ذات سے متعلق ہونے کی بنا پر قابل ذکر بن گیا ہے' اگرچہ اپنی جگہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

صدرِ مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے ۱۲ اگست ہی کو جمعہ کی نماز کے بعد وفاقی کونسل میں ایک مفصل تقریر کی اور اس میں ایک سیاسی ڈھانچا یا مستقبل کا دستوری خاکہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۴ یا ۱۵ اگست سے ایم آر ڈی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ وہ اگرچہ ملک گیر سطح پر ہوئی لیکن اس کا معاملہ تین صوبوں میں تو پُرامن تحریک کا رہا اور صرف گرفتاریاں پیش کی گئیں' البتہ صوبہ سندھ میں صورتِ حال نہایت تشویش ناک اور ہم سب کے لیے ایک بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔

گزشتہ دس بارہ دنوں کے دوران میں جو صورتِ حال سندھ میں رونما ہوئی تھی' اب اس میں کچھ کمی واقع ہو چکی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی سندھ میں جو کچھ ہوا وہ اچھے اچھے صحافیوں' نامہ نگاروں اور تجزیہ نگاروں کی توقعات کے بالکل برعکس ہوا ہے۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار ''دی مسلم'' نے جو تجزیہ کیا ہے' میرے نزدیک وہ سب سے بہتر ہے۔

سندھ کے حالات حکومت اور تجزیہ نگاروں کے لیے تو خلافِ توقع ہو سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک ایسا بالکل نہیں ہے۔ مَیں نے اس سے پہلے کئی دفعہ ان کی نشان دہی کی ہے۔ آٹھ ماہ قبل مَیں نے جو خط صدر ضیاء الحق صاحب کو لکھا تھا' اس میں خاص طور پر ان کی توجہ سندھ کے ان حالات کی طرف مبذول کروائی گئی تھی۔ اس میں میرے لیے خوشی کا کوئی پہلو نہیں ہے کہ میری پیشین گوئی درست اور تجزیہ صحیح ثابت ہوا۔ میرے لیے یہ صورتِ حال حد درجہ تشویش ناک اور الم ناک ہے۔ مَیں اس کی بنا پر شدید صدمے کی سی کیفیت سے دوچار ہوں۔ البتہ ایک خیال ضرور آتا ہے جس کا قرآن مجید میں بعض رسولوں کے قول میں ذکر ہوا ہے' کہ اپنی قوموں کو جس عذاب کی خبر دیتے تھے جب وہ عذاب واقع ہوا تو انہوں نے حسرت کے ساتھ کہا: ہم تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کرتے رہے مگر تم اپنے خیر خواہوں اور بہی خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (الاعراف) یعنی تمہیں ناصحین سے محبت نہیں۔ تم جانتے ہی نہیں کہ کون تمہارا

خیر خواہ ہے اور کون بدخواہ۔

دوسری حقیقت بالکل عیاں ہے کہ سندھ میں جو کچھ ہوا وہ ایم آر ڈی کی عمومی تحریک کا مظہر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر اس تحریک کو سامنے رکھا جائے تو سندھ کا معاملہ بھی لگ بھگ وہی ہونا چاہیے تھا جو بقیہ تین صوبوں میں سامنے آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں اس تحریک کے پیچھے ایم آر ڈی کے علاوہ تین طبقات اور ہیں جنہوں نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور بحالی جمہوریت کی تحریک کو تخریب کاری کا رنگ دے دیا ہے۔ ان میں اولاً کمیونسٹ عناصر ہیں جو عرصے سے منتظر تھے کہ انہیں کوئی موقع ملے کہ وہ اس ملک کے اساسی نظریات پر ضربِ کاری لگا سکیں۔ چونکہ ان لوگوں کے بین الاقوامی تعلقات ہیں اور انہیں اس بات کی پوری ٹریننگ دی جاتی ہے کہ کس ملک میں کس نہج اور کس جہت سے کام کرنا چاہیے' لہٰذا ان کو جونہی موقع ملا انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

دوسرا عنصر سندھی قومیت پرستی کا ہے۔ اس کے اسباب وعوامل پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع تو نہیں ہے لیکن سندھی نیشنل ازم یا سندھو دیش کی تحریک اب بہت گہری ہو چکی ہے۔ سندھ کے قدیمی باشندے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ دونوں اس سے بری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔ اس کو سطحی بات سمجھنا بہت بڑا مغالطہ اور خود فریبی کا معاملہ ہوگا۔

تیسرا عامل ہمارا پڑوسی ملک بھارت ہے جس نے ہمارے وجود کو ذہناً وقلباً قطعاً قبول نہیں کیا۔ وہ ہمارے اساسی نظریہ کا دشمن ہے۔ ہم نے ان کے نظریہ کی تردید کر کے اس ملک کی بنیاد رکھی تھی۔ بھارت ماتا جو اُن کے لیے بڑی مقدس ہستی ہے' ہم نے اپنے نظریے کی بنا پر اس کے حصے بخرے کیے جس کی وجہ سے وہ ہمارے سخت دشمن ہیں۔ ان کے ایجنٹ ہمارے درمیان یقیناً موجود ہیں اور وہ صرف ہندوؤں میں نہیں ہیں' نام نہاد مسلمانوں میں بھی موجود ہیں۔ یوں تو ہر صوبہ میں کچھ نہ کچھ تعداد میں ہندو موجود ہیں مگر بلوچستان اور سندھ میں یہ دوسرے دو صوبوں کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ خاص طور پر صوبہ سندھ میں بین الاقوامی سرحد کے ساتھ ساتھ ان کے مضبوط مراکز ہیں۔

پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں کے متعلق کون سا مسلمان نہیں جانتا کہ ان کی

دلی کیفیات کیا ہوں گی! پاکستان کو قبول کرنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ نظریۂ پاکستان ان کے مذہب' ان کے عقیدے اور ان کی فکر سے بعید ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔

یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ ان تینوں عناصر نے مل کر یہ گڑبڑ پھیلائی ہے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں اس کا تذکرہ ہی نہیں ہوا' مفصل بحث ہو چکی ہے۔ ان کے وزیر خارجہ کی طرف سے ان واقعات پر بڑے محتاط انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے' جو اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ان کی سوچ کس رُخ پر آگے بڑھ رہی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اگر کوئی یہ کہے کہ حالات تشویش ناک نہیں بلکہ محض افسوس ناک ہیں تو وہ یا تو خود شدید مغالطہ میں مبتلا ہے یا عوام کو جان بوجھ کر دھوکا میں رکھنا چاہتا ہے۔

فی الوقت یہ ہرگز مشکل نہیں ہے کہ موجودہ ایجی ٹیشن اور تخریب کاری کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ یہ ایک ملک کے اپنے صوبے کا معاملہ ہے۔ جب فوج کسی علاقے کے امن و امان کی ذمہ داری سنبھالتی ہے تو پھر کسی کے بس میں نہیں ہوتا کہ زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ کر سکے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے۔ آج کے ایک اخبار میں اداریہ بھی لکھا گیا ہے' جس کا عنوان ہے ''پہلے راؤنڈ کی فتح کے بعد'' یعنی اس اخبار کے مدیر کے نزدیک پہلے راؤنڈ میں حکومت کو فتح حاصل ہو چکی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی فوج نے پہلے راؤنڈ میں حالات پر مکمل طور پر قابو پا لیا تھا۔ سندھ کا معاملہ تو وہاں کے مقابلے میں نسبتاً بہت آسان ہے' اس لیے کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے زمینی طور پر ملحق نہ تھا۔ سندھ کا قطعہ ہم سے ملا ہوا ہے' اس لیے یہاں کسی بھی صورتِ حال سے نہایت آسانی کے ساتھ نبٹا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے حالات تو ہر ملک میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ ہر ملک کے بعض علاقے ترقی یافتہ ہوتے ہیں' بعض پس ماندہ ہوتے ہیں جنہیں ترقی یافتہ علاقوں سے شکایت رہتی ہی ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔ خود ہندوستان میں آئے دن یہ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی جنوبی ہندوستان میں بڑا طوفان اٹھتا ہے' کبھی شمال مشرقی کونے میں فسادات ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں بھارتی صوبہ پنجاب میں ایک طوفان اٹھا ہے۔

لہٰذا ان واقعات کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

ان دونوں باتوں کے علی الرغم مَیں اس بات کو دہرا رہا ہوں کہ ہمارے مخصوص حالات کے پیشِ نظر یہ واقعات بہت خطرناک ہیں۔ کسی درجے میں ان کی اہمیت کو کم کرنا یا اس صورت حال سے صحیح معنی میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہ کرنا ملکی بقا اور سالمیت کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مَیں آپ کی توجہ دو اہم اور اساسی امور کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

اوّل یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ اس کی نظریاتی جڑوں پر اگر کوئی وار ہو اور وہ کاری بھی ہو تو یہ نہایت مہلک ثابت ہو گا۔ ہندوستان کوئی نظریاتی ملک نہیں بلکہ خالص جغرافیائی ریاست ہے۔ وہاں نظریہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارا معاملہ ہندوستان سے بہت مختلف ہے۔ کوئی واقعہ خواہ وہ حجم کے اعتبار سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اگر ہمارے نظریئے پر ضرب لگاتا ہو تو نتائج کے اعتبار سے یہ انتہائی خطرناک ہو گا۔ حالات کی ستم ظریقی دیکھئے کہ برصغیر پاک و ہند کے جس صوبے میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور پلی بڑھی، جہاں طویل ترین عرصے تک اُس کی وزارت قائم رہی اور جو گویا نظریۂ پاکستان کا سب سے بڑا علم بردار تھا، سب سے پہلے اسی صوبے نے اس نظریہ سے دست برداری اختیار کی اور ہم سے علیحدہ ہوا۔ اس سے قطع نظر کہ اس میں کس کی غلطی کتنی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ سب سے پہلے مسلم بنگال ہی نے نظریۂ پاکستان کو ترک کیا۔ اگر وہ ہم سے صرف الگ ہوتا اور مشرقی پاکستان کے نام کو برقرار رکھتا تو بات مختلف ہوتی۔ ہمارے خلاف ان کو اگر کچھ شکایات تھیں اور وہ ہم سے شاکی تھے کہ ہم نے ان کے حقوق غصب کر لیے ہیں تو ایسا معاملہ تو بعض دفعہ دو حقیقی بھائیوں کے درمیان بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے تعلقات ختم نہیں ہو جاتے۔ علیحدگی ہو جاتی ہے، الگ گھر بنا لیتے ہیں لیکن وہ اپنے برادرانہ رشتے کو ختم نہیں کرتے۔ مشرقی پاکستان والوں نے اگر صرف علیحدگی اختیار کی ہوتی تو مَیں ہرگز یہ نہ کہتا کہ انہوں نے نظریۂ پاکستان سے دست برداری اختیار کی۔ اس کے برعکس انہوں نے پاکستان کا نام تج دیا اور اپنی نئی شناخت لسانی یا وطنی قومیت کی بنیاد پر رکھی، یعنی ''بنگلہ

دیش''۔ اسم علم بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بحمد اللہ' ہمارا ملک، وہ ہے جس کے نام میں جزولاینفک کے طور پر اسلام موجود ہے۔ یہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے۔ اسی طرح موریطانیہ کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے نام کے اندر اسلام کو داخل کیا ہے۔ ان دو کے علاوہ پوری دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس نے اپنے نام میں اسلام کو شامل کیا ہوا ہے۔ نام کی اہمیت کا اندازہ اس مثال سے لگا لیجیے کہ اگر دو افراد مل کر ایک نام سے کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں تو جب ان کے علیحدہ ہونے کی نوبت آتی ہے تو جھگڑتے ہیں کہ اس نام کو کون استعمال کرے گا۔ اس قضیہ کو پھر اس طرح چکایا جاتا ہے کہ اس نام کی قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کے بھائی ہم سے اس بات پر جھگڑتے کہ اس نام پر ہمارا زیادہ حق ہے تو ہمیں خوشی ہوتی کہ انہوں نے اس نظریہ کے ساتھ قلبی اور ذہنی لگاؤ کا ثبوت دیا۔ مگر یہاں اس کے بالکل برعکس ہوا کہ انہوں نے اس کو دمڑی کے برابر بھی نہیں سمجھا اور نہایت نفرت کے ساتھ اٹھا کر دُور پھینک دیا۔

حالات کا مزید جبر یہ ہے کہ اس بچے کھچے پاکستان جس کو حقیقت میں ''مغربی پاکستان'' کہنا چاہیے' میں سندھ وہ واحد صوبہ ہے جس میں مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی۔ یہ صوبہ موجودہ پاکستان میں مسلم لیگ کا گڑھ تھا۔ اس کے ساتھ اس کو یہ امتیازی فخر بھی حاصل ہے کہ یہ بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی جائے پیدائش ہے۔ آج اسی صوبہ میں اس مملکت کی نظریات کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی جارہی ہے۔ یہ میرے نزدیک انتہائی خوف ناک معاملہ ہے۔ اس پر یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ یہ مٹھی بھر لوگوں کی کارگزاری ہے' شترمرغ کے روایتی انداز سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ پچاس پچاس ہزار افراد باہر نکل آئے' یہ مٹھی بھر لوگ نہیں ہو سکتے۔ یہ بات اب پوری طرح سامنے آچکی ہے کہ سندھی زمیندار اور وڈیرے خود اس تحریک کی سرپرستی ہی نہیں بلکہ باضابطہ سربراہی کر رہے ہیں۔ ممتاز بھٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر سندھی نوجوان کے دل پر ''سندھو دیش'' کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں' یکسر غلط نہیں ہے۔

دوم' ہندوستان کے مقابلے میں ہمارے جغرافیائی حالات بہت مختلف ہیں۔ ان کی

وجہ یہ ہے کہ ہمارے چاروں کے چاروں صوبے ''سرحدی'' ہیں۔ دو صوبے مشرقی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور دو مغربی سرحد سے ملحق ہیں۔ ہندوستان کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں اگر بیک وقت دو چار صوبوں میں جھگڑے اور مظاہرے چل رہے ہوں تو بھی کوئی تشویش کی بات نہیں کیونکہ وہ ایک بہت بڑا ملک ہے اور اس کے صوبوں (ریاستوں) کی تعداد بیس سے بھی متجاوز ہے۔ پھر یہ کہ اس کے اکثر صوبوں کی سرحدیں دشمن ملک سے نہیں ملتیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ دو صوبوں کے ساتھ افغانستان ہے' جہاں پر اصلاً روس کی حکومت ہے اور دو صوبوں کی سرحدیں ہندوستان سے ملحق ہیں جو ہمارا پیدائشی دشمن ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے یہاں کا ایک معمولی واقعہ بھی نہایت اہمیت اور دُور رس نتائج کا حامل بن جاتا ہے۔

یہ دو اسباب ہیں جن کی بنا پر ہم اپنے ملک کے حالات و واقعات کی تشویش ناکی کے حجم اور طول و عرض کو عام پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔ جو کچھ ان دنوں ہمارے صوبہ سندھ میں ہوا ہے' اُس سے کئی گنا زیادہ سنگین واقعات اگر بھارت کے کسی صوبے میں رونما ہوتے تو بھی وہ اتنے تشویش ناک نہ ہوتے جتنے کہ یہ واقعات ہمارے لیے ہیں۔

جب صورتِ حال کی سنگینی واضح ہوگئی تو اب آیئے مسئلہ کے حل کی طرف! اس سلسلے میں دو اعتبارات سے غور کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ اس صورتِ حال کا اساسی سبب کیا ہے اور اس کا مستقل حل کیا ہے! دوسرے یہ کہ وہ ہنگامی اسباب کیا ہیں جنہوں نے صورتِ حال کو فوری طور پر اس درجہ تشویش ناک بنا دیا ہے اور ان کے تدارک کے لیے فوری اقدامات کون سے ضروری ہیں!

ہماری مشکلات کے اصل سبب اور ان کے مستقل حل پر مَیں نے متعدد بار اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس وقت مَیں اس کا لبِ لباب عرض کروں تو وہ بھی دو سطحوں میں ہوگا۔ ایک یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا لیکن اس کے قیام کے بعد نہ صرف یہ کہ اُس نظریہ کی طرف عملی پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس مخالف نظریات کو فروغ حاصل ہوا۔ نجی اور سرکاری دونوں سطحوں پر ان کی پشت پناہی ہوئی۔

اس کا جو منطقی نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا' یعنی پہلے یہ دولخت ہوا اور چونکہ اس کے بعد بھی صورتِ حال میں کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آئی' لہٰذا وہی عمل مزید گمبھیر شکل اختیار کر رہا ہے اور بچے بچائے پاکستان میں بھی شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اگر کوئی ملک وطنی قومیت پر قائم ہو تو وطن پرستی کا جذبہ ہی اس کو سہارا دے گا جبکہ اگر کوئی ملک لسانی قومیت کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو تو وہ لسانی قومیت ہی اس کو سہارا دے گی۔ پاکستان کے لیے ایسا کوئی سہارا موجود نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ایک نظریہ پر ہے۔ چونکہ اس کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی' لہٰذا منطقی نتائج پیدا ہو کر رہے۔ آج سے بارہ سال پہلے اس کے اساسی نظریے کی تردید سابقہ مشرقی پاکستان میں ہو چکی ہے۔ اس وقت بھارتی لیڈروں نے علی الاعلان کہا کہ نظریۂ پاکستان ختم ہو چکا ہے اور ہم نے ایک ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے۔ اِس وقت جو صورتِ حال سندھ میں پیش آئی ہے وہ بھی اسی عمل کا ارتقا ہے یا اُسی حادثۂ مشرقی پاکستان کی صدائے بازگشت!

اگر آپ ذرا گہرائی میں اُتر کر دیکھیں تو ہمارا معاملہ براہِ راست اللہ کے ساتھ ہے۔ ہم نے اس ملک کا مطالبہ اس نعرے کے ساتھ کیا تھا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔'' گویا ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ: اے اللہ! اگر تو ہم کو یہ ملک عطا فرما دے تو ہم اس میں تیرا قانون نافذ کریں گے' اور تیرے دینِ حق کا بول بالا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے کہ جب کوئی قوم ایسا وعدہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور موقع عنایت فرماتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿فَنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴿١٤﴾﴾ (یونس) اس طرح ان پر اللہ کی حجت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پھر اگر وہ وعدہ خلافی کرتے ہیں تو اس کی نقد سزا اسی دنیا میں دی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ توبہ میں ذکر ہے کہ کچھ لوگوں نے اللہ سے دعا کی کہ ہم کو دولت عطا فرما۔ اگر تو نے ہمیں دولت دی تو ہم تیری راہ میں خوب خرچ کریں گے۔ صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرما دی اور اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور بخل کرنے لگے۔

اس پر سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا:

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾

''اللہ تعالیٰ نے اس کی پاداش میں ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا جو اس دن تک ان کے دلوں میں برقرار رہے گا جب وہ اللہ سے ملاقات کریں گے۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے اس وعدہ کی خلاف ورزی کی جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا!''

بالکل یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ۳۶ سال گزر گئے اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا' بلکہ اب تو حال یہ ہے کہ منزل کا نشان بھی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام سے مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے یہاں ایک ایسی حکومت آئی تھی جس نے سوشلزم کو بدنام کیا اور اس کے بعد کے عرصے میں ہم نے اسلام کے نام کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم نے اللہ سے کچھ وعدے کیے تھے' پھر ان کی خلاف ورزی کی۔ یہ کسی فردِ واحد کا معاملہ نہیں بلکہ پوری قوم اپنے تمام طبقات سمیت اس جرم میں شریک ہے۔ مختلف افراد' گروہوں اور اداروں نے اس میں سے اپنے اپنے حصے کا گناہ کمایا ہے۔ اس جرم کی سزا کے طور پر ہم پر جو پہلا کوڑا آج سے بارہ برس قبل پڑا تھا' وہ اتنا شدید تھا کہ ہمارے ایک لاکھ کڑیل جوان قیدی بنے۔ اتنی بڑی شکست اور وہ بھی ہندوؤں کے ہاتھوں' جن پر ہم نے ایک ہزار سال حکومت کی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کی گردن کٹی۔ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا سینہ چھلنی ہوا۔ میرے نزدیک اُس عذابِ خداوندی کا یہ سب سے زیادہ تلخ پہلو ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ عذابِ خداوندی کبھی اوپر سے آتا ہے' کبھی قدموں تلے سے اور ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ تم کو گروہوں میں تقسیم کر دے اور آپس میں لڑا دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھائے۔ ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط﴾ (الانعام:۶۵) یہ تیسری صورت پہلے دونوں عذابوں کے مقابلے میں شدید تر ہے' جو بنگلہ دیش میں پیش آ چکی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تا حال سندھ میں نئے اور

پرانے سندھیوں کے درمیان فساد کی صورت پیدا نہیں ہوئی بلکہ معاملہ قدیم سندھیوں اور حکومت وقت کے مابین ہی ہے۔ اس کے لیے بہت احتیاط اور ہوش مندی کی ضرورت ہے کہ کہیں غلطی سے بھی کوئی ایسا اقدام نہ ہو جائے جس سے قدیم اور جدید سندھیوں یعنی سندھیوں اور مہاجروں یا سندھیوں اور پنجابی آباد کاروں کے مابین تصادم کی صورت پیدا ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر اس کے بہت تلخ نتائج برآمد ہوں گے۔

اگر ہم نے اپنی روش نہ بدلی اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہ کیا تو یاد رکھیے قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (بنی اسرائیل: ۸) یعنی تمہارا رب اب بھی تم پر رحم کرنے کے لیے آمادہ ہے" لیکن اگر تم نے پھر وہی کیا جو اس سے پہلے کر چکے ہو تو پھر ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی ہم پہلے بھی سزا دے چکے ہیں اور دوبارہ پھر دیں گے" کیونکہ ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر) اللہ کا قانون نہیں بدلے گا۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تم اپنی روش بدل لو۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۘ﴾ (الرعد: ۱۱)

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

اگر تم اپنی حالت بدل لو گے تو پھر ہم بھی اپنے معاملے کو بدل لیں گے اور ہماری رحمت تمہیں اپنے سائے میں لے لے گی!

اس موقع پر بے اختیار میرا ذہن اس واقعے کی جانب منتقل ہو گیا ہے جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھٹو صاحب ماسکو گئے تھے۔ وہاں وزیراعظم کوسیجن نے استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ جو کچھ ہم نے مشرقی پاکستان میں کیا' اس پر ہمیں کوئی ندامت نہیں ہے اور اگر دوبارہ وہی حالات پیدا ہو گئے تو ہم پھر وہی کریں گے جو مشرقی پاکستان میں کر چکے ہیں۔ گویا کہ اہل پاکستان کے لیے معاملہ بیک وقت آسمانی بھی ہے اور زمینی بھی۔ اللہ کے ساتھ بھی ہے اور انسانوں کے ساتھ بھی۔ ایک جانب ہم عذاب

خداوندی کے ازلی و ابدی قانون کی زد میں ہیں جبکہ دوسری جانب ایک سپر پاور کی واضح اور صریح دھمکیوں کی زد میں ہیں جس کی سرحدیں اب ہم سے براہِ راست ملحق ہو چکی ہیں۔

ہمارے اس اساسی مسئلے کا پائیدار حل یا بالفاظِ دیگر عذابِ خداوندی کو ٹالنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اپنی سابقہ روش پر حقیقی پشیمانی کے ساتھ اللہ کی جناب میں رجوع اور صدقِ دل سے توبہ، تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ عہد۔ یہ کام افراد اپنی جگہ کریں اور پورا ملک من حیث القوم کرے۔ تب ہی اُمید کی جا سکتی ہے کہ رحمتِ خداوندی ہماری جانب متوجہ ہو اور ہمیں ازسرِ نو قومی یک جہتی اور ملکی استحکام کی نعمتیں میسر آ جائیں۔ یہ تشخیص و تجویز میں نے پاکستان کے طول و عرض میں اپنے دَوروں کے دوران تقریروں اور خطاباتِ عام میں بارہا پیش کی ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لیے مَیں نے پہلے مرکزی انجمن خدام القرآن اور بعد ازاں تنظیم اسلامی قائم کی۔ تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت ''تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد'' ہے۔ ہمارا اصل اور بنیادی پیغام یہی ہے کہ اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی ازسرِ نو تجدید کرو، اور اپنی سابقہ کوتاہیوں پر صدقِ دل سے معافی مانگو۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے اور ہمارے شخصی، قومی اور ملکی حالات صحیح نہج اختیار کر لیں۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

فوری اقدام

اس وقت ہم جس ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہیں، اس کی سنگینی کو ختم کرنے کے لیے فوری اقدامات کے ضمن میں بھی ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اسی غرض سے اس اجتماع میں میرے اس خط کی مطبوعہ نقول تقسیم کی گئی ہیں جو آٹھ ماہ قبل (۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کو) صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو ارسال کیا گیا تھا۔ مَیں یہ تجویز اس لیے ہرگز پیش نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے کوئی سیاسی قدم اٹھانا ہے۔ اس خط کو پیش کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ اجتماعِ جمعہ ہی میرے رابطہ عوام کا واحد ذریعہ ہے جہاں بحمد اللہ ہر قسم

کے لوگ آتے ہیں۔ سیاسی ذہن رکھنے والے بھی اور خالص مذہبی مزاج کے حامل بھی۔ حکومت کے حامی اور مؤید بھی' اور مخالفانہ ذہن رکھنے والے بھی۔ کچھ ایسے حضرات بھی جن کی رسائی ایوانِ حکومت تک ہے۔ اسی لیے مَیں اس مجمع میں یہ تجاویز پیش کر رہا ہوں تاکہ اگر آپ ان کو صحیح سمجھیں تو پھر امکانی حد تک انہیں پھیلائیں۔

اس خط کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ مَیں مروجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں ہوں لیکن میرے نزدیک کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہوسکتا۔ بظاہر اس میں ایک تضاد محسوس ہوتا ہے لیکن اس کا سیدھا حل یہ ہے کہ انتخابی سیاست جس کا مقصد حصولِ اقتدار ہوتا ہے' اس کے حوالے سے تو چونکہ مَیں اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کے ذریعے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دی جاسکتی لہٰذا اس کو تو مَیں نے اپنے لیے ممنوعِ محض (out of bounds) قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی سے میری علیحدگی بھی اسی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اب مَیں نے جو جماعت قائم کی ہے' اس نے بھی یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اس انتخابی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لے گی۔ البتہ ملک کے مسائل پر غور کرنا' ملکی حالات کا مطالعہ کرنا' مشاہدہ کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے کرنا اور ان پر اپنی رائے دینا ہر ایک شہری کا فرض ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی سے کوتاہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے وفاقی کونسل سے استعفیٰ دیتے وقت صدر صاحب سے یہی کہا تھا کہ چونکہ مَیں مروّجہ معنی میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور مجلس شوریٰ کو آپ نے سیاسی عمل کا نقطۂ آغاز قرار دے دیا ہے' لہٰذا اب مَیں اس کا رکن نہیں رہ سکتا۔ البتہ عوام اور حکام دونوں کے غلط کاموں پر تنقید اور اپنی صوابدید کے مطابق ان کی رہنمائی اور خیر خواہانہ مشورہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ از روئے فرمانِ نبوی ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' یعنی ''دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی و وفاداری کا ہے۔'' جب پوچھا گیا ''لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟'' یعنی ''حضورؐ! کس کے ساتھ؟'' تو ارشاد ہوا: ''لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ'' یعنی ''اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اخلاص و

وفاداری اور مسلمانوں کے اولوالامر اور عوام دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی!'' جب بھی ضرورت ہوئی' مَیں نے پورے اخلاص وخلوص کے ساتھ رائے دی ہے اور ہر ممکن ذریعے سے اپنا مشورہ بلند ترین سطح تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ حقیقی خیر خواہوں اور بہی خواہوں کی بات پر توجہ نہیں دی جاتی۔ بنحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (الاعراف) خاص طور پر وہ لوگ جو اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو گئے ہوں انہیں عموماً ناصحین اچھے نہیں لگتے بلکہ چاپلوسی کرنے والے پسند آتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ صاحبِ اقتدار لوگوں کا قرب حاصل کرتے ہیں جن کو خوشامد کے فن میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آج کل کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔

اس خط کے دوسرے حصے میں مَیں نے لکھا ہے کہ اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے معاملے میں مَیں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں۔ آپ نے اس سلسلے میں جتنے اقدامات کیے ہیں' وہ سب نیم دلانہ ہیں اور چونکہ اصل وقت گزرنے کے بعد کیے گئے ہیں' لٰہذا مخالفانہ ردّعمل ان کی راہ کی رکاوٹ بن گیا۔

تحریک نظامِ مصطفیٰؐ نے لوگوں میں جو جوش وخروش پیدا کر دیا تھا اگر اس کے فوراً بعد بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھایا جاتا تو کسی کو اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ مَیں نے اگست ۱۹۸۰ء میں منعقدہ علماء کنونشن میں صدرِ مملکت کو مخاطب کرتے ہوئے بھی یہ بات کہی تھی کہ آپ نے بھی وہی غلطی کی ہے جو پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی پہلی ٹیم نے کی تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت بھی عوام میں ایسا جذبہ موجود تھا کہ بڑے سے بڑا قدم اٹھایا جا سکتا تھا اور کسی کو چوں کرنے کی جرأت نہیں تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا' جذبہ سرد ہوتا چلا گیا اور فتنے کھڑے ہوتے چلے گئے۔ بالخصوص فروعی وفقہی اختلافات نفاذِ اسلام کی راہ کا سب سے بڑا پتھر بن گئے۔ اب آپ نے جو چند اقدامات کیے ہیں' اوّلاً تو ان میں ترجیحات درست نہیں ہیں۔ دوسرے' توازن موجود نہیں ہے۔ یہ معاملہ کسی طرح درست نہیں ہے کہ ایک طرف آپ زنا کی حد جاری کریں اور دوسری

طرف ستر وحجاب کے احکام نافذ نہ کریں۔ میرے نزدیک یہ دین پر بھی ظلم ہے اور لوگوں پر بھی۔ دین ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے مابین نہ تجزیہ درست ہے نہ تفریق۔ فرمانِ خداوندی ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ص﴾ (البقرۃ:۲۰۸) کے مطابق آپ کو کُل کا کُل دین قبول کرنا ہوگا۔ اگر آپ اس کے حصے کریں گے تو یہ بات ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج﴾ (البقرۃ:۸۵) کے مصداق بالکل غلط اور عند اللہ اور عند الناس قطعاً ناقابلِ قبول ہوگی۔

اسی طرح آپ نے شرعی عدالت تو قائم کی لیکن اس کے ہاتھ باندھ دیئے کہ وہ عائلی قوانین کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتی۔ گویا وہ کوئی نہایت مقدس دستاویز (sacred document) ہے۔ آپ اپنے ہی منتخب شدہ علماء اور جج حضرات کو یہ حق نہیں دے رہے کہ وہ یہ غور کریں کہ ان قوانین کی کوئی شق خلافِ شریعت تو نہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک مزید تضاد سامنے آیا ہے۔ معاشرے میں خواتین کے مقام اور مرتبے کے تعین کے بارے میں حکومت کی رہنمائی کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا ہے جس میں ۱۳ تو ایسی بیگمات ہیں جن کے نظریات و رجحانات سے سب بخوبی واقف ہیں جبکہ مرد صرف تین شامل کیے گئے ہیں جن میں سے ایک خالد اسحٰق ہیں' دوسرے پروفیسر کرار حسین اور تیسرے جناب زیڈ اے ہاشمی۔ گویا یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ خواتین کے معاملے میں علماء سرے سے کوئی رہنمائی دے ہی نہیں سکتے یا پھر یہ کہ ان کی رہنمائی ناقابلِ قبول ہے۔ مَیں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ آپ میری بات مانیں اور میرے نظریات پر ہی عمل پیرا ہوں۔ کیا آپ کو مولانا محمد مالک کاندھلوی' مفتی محمد حسین نعیمی' پیر سید کرم شاہ' مولانا تقی عثمانی وغیرہم پر بھی کوئی اعتماد نہیں کہ وہ ازروئے اسلام معاشرے میں خواتین کے کردار کے ضمن میں کوئی رہنمائی فراہم کر سکیں؟ الغرض یہ ہیں وہ تضادات جن کے باعث موجودہ حکومت کا نفاذِ اسلام کا پورا عمل غیر مؤثر ہی نہیں ہوا بلکہ اُلٹے نتائج برپا کر رہا ہے' یعنی یہ کہ عوامی سطح پر اسلام بدنام ہو رہا ہے۔

اب اس خط کے تیسرے حصے پہ نظر ڈالیں اور ان الفاظ کو غور سے پڑھیں:

''تاہم پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے ضمن میں ایک مشورہ مَیں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور اصلاً اسی کے لیے یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں' چونکہ مجھے اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور حالات کے تجزیے اور جائزے سے شدید اندیشہ لاحق ہے کہ مستقبل کا مؤرّخ کہیں یہ نہ کہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی جو عظیم ترین مملکت وجود میں آئی تھی اُسے اوّلاً تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کے مزید ٹکڑے ہونے (Balkanisation) کا حادثہ رونما ہوا ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ' دین دار اور پرہیز گار شخص کے ہاتھوں! معاذ اللہ!! ثم معاذ اللہ!!''

مَیں نے ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو علیحدگی میں بھی صدر صاحب سے یہی بات کہی تھی کہ آپ نے ملک میں سیاسی عمل کو جس طرح بالکل معطل کر کے رکھ دیا ہے' یہ خوف ناک نتائج پیدا کرے گا۔ آپ کے ذہن میں مستقبل کے لیے جو بھی نقشہ اور خاکہ ہے' اس کو عوام کے سامنے لائیں اور اس پر ریفرنڈم کروالیں یا ۱۹۷۳ء ہی کے دستور کے تحت غیر جماعتی بنیاد پر الیکشن کرا کے سول حکومت کو بحال کر دیں۔ بہر صورت تعطل محض ایک تخریبی ذہن پیدا کرنے والا عمل ہے' بالکل ایسے جیسے پانی کا بہاؤ اگر روک دیا جائے تو وہ کسی نہ کسی طرف ضرور مار کرے گا۔ پھر یہی بات مَیں نے وفاقی کونسل میں کہی تھی کہ سیاسی عمل کے زیادہ دیر تک رُکے رہنے سے لوگوں کا ذہن تخریبی رُخ پر کام کرنے لگے گا۔

اب ذرا میرے خط کے صفحہ ۷، ۸ کو غور سے پڑھیے:

''اس ضمن میں اغلباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے خلاف کوئی عوامی تحریک نہ تا حال چل سکی ہے نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں مَیں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اس صورتِ حال سے دھوکا نہ کھایئے' اس لیے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبِ وطن بالخصوص دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن ایک تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی حالات میں کوئی تبدیلی کسی بھی وقت رُونما ہو سکتی ہے' اور دوسرے کسی ملک کے بقا و استحکام کے

لیے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کا اطمینان ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بالخصوص اندرون صوبہ سندھ جو لاوا پک رہا ہے' مجھے یقین ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہوگا۔ تاہم' میں اس امکان کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کرسکتا کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار کے گرد ایسے لوگوں کا حصار قائم ہو جاتا ہے جو اسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔ واللہ اعلم!

میرے اندازے میں سندھ میں ''سندھو دیش'' کے لیے میدان پوری طرح اُسی طور سے ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں ''بنگلہ دیش'' کے لیے ہوا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کرسکی جبکہ سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک اس عامل (factor) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔

ہمارے سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت اس امر کو دی تھی کہ (ایوب خان مرحوم کے) مارشل لاء کے نفاذ نے وہاں کے لوگوں میں سیاسی محرومی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ یوں علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں سب سے بڑی دلیل یہ آگئی تھی کہ فوج چونکہ ساری مغربی پاکستان کی ہے لہٰذا فوج کی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پاکستان' مشرقی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے۔ آج بعینہٖ یہی دلیل سندھ کے علیحدگی پسند لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ فوج کا اکثر و بیشتر حصہ پنجاب سے ہے اور کچھ تھوڑا سا سرحد سے' لہٰذا مارشل لاء کے پردے میں اصلاً پنجاب ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ ہر گزرنے والا دن اس دلیل کو قوی سے قوی تر کر رہا ہے!

بنا بریں مَیں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس تعطل کو جلد از جلد رفع کرنے کی جانب واضح پیش قدمی فرمایئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے اور پھر ملک وملت کے کسی بھی بہی خواہ کے کیے کچھ نہ ہو سکے!''

اس تمہید کے بعد خط کے صفحات ۹، ۱۰ میں وہ تجویز درج ہے جو مَیں نے سیاسی تعطل

کو ختم کرنے کے لیے پیش کی تھی۔ یہ تجویز آٹھ ماہ قبل پیش کی گئی تھی۔ اگر اس پر اُسی وقت عمل شروع ہو جاتا تو آج صورتِ حال یقیناً مختلف ہوتی اور عوامی سیاست کی گاڑی صحت مند خطوط پر آگے بڑھ رہی ہوتی۔ افسوس کہ اس پر نہ تو اربابِ حکومت نے غور کیا نہ امامانِ سیاست نے ہی اسے درخورِ اعتنا جانا۔ نتیجۃً ملکی سیاست میں محاذ آرائی کا رنگ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا جس نے میرے تجزیے کے عین مطابق سندھ میں دھما کا خیز صورت اختیار کر لی۔

گزشتہ ماہ تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت میں ہم نے ملکی صورتحال پر غور کر کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب اس تجویز پر عمل کا وقت گزر گیا ہے۔ چنانچہ اب ہم اسے پیش نہیں کریں گے بلکہ ہمارا موقف بھی وہی ہو گا جو ملک کے کم و بیش تمام سیاسی گروہوں کا ہے۔ یعنی یہ کہ ۱۹۷۳ء کا دستور فوراً بحال کیا جائے اور انتقالِ اقتدار کے لیے انتخابات کرا دیے جائیں۔ البتہ ہم اپنی ترجیحات کے پیشِ نظر اس سلسلے میں کسی تحریک میں عملی حصہ نہیں لیں گے۔ اب جو سندھ کی موجودہ صورتِ حال سامنے آئی جس کی تیزی و تندی خود میرے اندازوں سے بہت زیادہ ہے' تو ہم نے ازسرِ نو غور کیا اور لاہور میں موجود ارکانِ مجلس مشاورت سے مشورے کے بعد مَیں نے طے کیا کہ اس تجویز کو دوبارہ وسیع پیمانے پر سامنے لایا جائے۔ موجودہ حالات میں یہی واحد ممکن ''درمیانی راہ'' ہے۔ حکومت خواہ کوئی بھی ہو' اقتدار سے بآسانی دست بردار نہیں ہوا کرتی جبکہ کسی فوجی حکومت سے اقتدار واپس حاصل کرنا تو بالعموم شیر کے منہ سے شکار لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ کسی عوامی ایجی ٹیشن کے آغاز کے بعد تو یہ دست برداری مزید مشکل ہو جاتی ہے' اس لیے کہ اسے اعترافِ شکست پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمارے موجودہ فوجی حکمران ۱۹۷۳ء کے آئین کو من وعن بحال کر کے فوری انتقالِ اقتدار کے لیے الیکشن کرانے کے مطالبے کو مان لیں تو یہ ان کا ایک حد درجہ غیر معمولی ایثار اور ہر اعتبار سے تاریخی کارنامہ ہو گا۔

اگر بوجوہ وہ ایسا نہ کر سکیں تو کیا کیا جائے؟ کیا محاذ آرائی کی موجودہ صورت کو منطقی نتائج تک پہنچنے دیا جائے؟ یا کوئی اور صورت موجود ہے؟ مجھے اس وقت وہ عبرت آموز

قصہ یاد آ رہا ہے کہ دو عورتیں ایک بچے کی دعویدار تھیں اور کوئی بھی اپنے دعویٰ سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ کوئی دوسرے شواہد بھی موجود نہ تھے۔ ایسے میں قاضی صاحب نے فیصلہ دیا کہ بچے کے دو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دے دیا جائے۔ اس پر اصل ماں دست بردار ہو گئی اور اس نے کہہ دیا کہ بچہ دوسری عورت کو دے دیا جائے۔ یوں اصل ماں کی پہچان ہو گئی۔ آج ہمارا ملک کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ کاش کہ کوئی ایک فریق اس ملک کی ''اصل ماں'' کا کردار ادا کر سکے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شدید اندیشہ ہے کہ جیسے ۱۹۷۱ء میں ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اب فوراً نہیں تو کچھ عرصے کے بعد ملک کے مزید ٹکڑے ہو کر رہیں گے۔ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ!! لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ کچھ لوگ بیچ میں آئیں اور فریقین کو کسی درمیانی راہ پر متفق کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مَیں نے جتنا غور کیا ہے اپنی اس آٹھ ماہ قبل کی پیش کردہ تجویز کے سوا کوئی اور درمیانی راہ سامنے نہیں آئی لہٰذا اُسی کو دوبارہ پیش کر رہا ہوں۔

فیصلہ صرف عوام کا

اس تجویز کا اصل الاصول اور منبع و مدار یہ ہے کہ سب اس بات کو مان لیں کہ ملک کے آئندہ نظام کے فیصلے کا حق یہاں کے عوام کو حاصل ہے کسی فردِ واحد کو نہیں۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ میں اس ملک کے آئندہ نظام کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ یہ حق اس ملک کے رہنے والوں کو مجموعی طور پر حاصل ہے۔ ختم نبوت کے عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے بعد کوئی شخص ذاتی حیثیت میں مامور من اللہ نہیں ہے کہ اس کا حکم واجب الاطاعت بن جائے۔ رسالت کا باب ختم ہو چکا۔ اب تو ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کا دور ہے۔ اس کا تقاضا اس طرح ہرگز پورا نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی پسند کے کچھ لوگ اپنے گرد جمع کر لیں اور ان سے ڈیسک بجوا کر اپنے کسی منصوبے یا ڈھانچے کی تائید و تحسین حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں کہ پوری قوم کی طرف سے حمایت ہو گئی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ صدر صاحب کے پیش کردہ خاکے سے ملک میں دستوری مسائل از سرِ نو اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ گویا انہوں نے آئینی حوالے سے Pandora's Box

خود کھول دیا ہے۔ حتیٰ کہ پارلیمانی اور صدارتی نظام کا معاملہ بھی زیر بحث آ گیا ہے۔ اگر چہ میں خود صدارتی نظام کے حق میں ہوں کہ یہ اسلامی نظامِ حکومت سے زیادہ قریب ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بارے میں فیصلے کا اختیار کس کو حاصل ہے! ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ عوام کی کثرتِ رائے سے ہوگا نہ کہ کسی کی شخصی رائے سے۔ آپ اگر پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ اس ملک کے لیے کسی ایک نظام کو بہتر سمجھتے ہیں تو اس کا واحد ممکن اور صحیح راستہ یہ ہے کہ عوام کو اس کا قائل کیجیے۔ آخری فیصلے کا اختیار بہر حال ان ہی کو حاصل ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک الیکشن تین ماہ کے اندر اندر ایک مجلس شوریٰ منتخب کرنے کے لیے ہو جو ان دستوری مسائل کے ضمن میں فیصلہ کرے۔ یہ الیکشن بالکل انہی خطوط پر ہوں جن پر کہ ۱۹۷۷ء کا الیکشن ہوا تھا جس میں تمام سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا تھا سوائے اس ایک فرق کے کہ یہ انتخاب غیر جماعتی بنیاد پر ہوں۔ اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ یہ الیکشن تشکیل حکومت کے لیے ہوگا ہی نہیں بلکہ صرف ان دستوری مسائل کو حل کرنے کے لیے ہوگا جو حکومت اور سیاسی جماعتوں کے مابین بنائے نزاع بنے ہوئے ہیں۔ ہماری فوج، جنرل صاحبان اور خود صدر صاحب بھی اسی قوم کے اجزاء ہیں۔ دوسرے طبقات و افراد کی طرح انہیں بھی قوم کی بھلائی کے لیے اپنے خیالات رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن ان کی یہ رائے بھی صرف مشورے کی حد تک ہو سکتی ہے۔ اپنا مشورہ وہ قوم کے سر زبردستی تھوپ نہیں سکتے۔ فیصلہ وہی ہوگا جو عوام کی اکثریت کرے گی۔

جب میں میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا تو جمعیت طلبہ کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے جریدے پندرہ روزہ "عزم" کی ادارت کے فرائض میرے ذمے تھے۔ اس میں دستور سے متعلق مختلف آراء شائع کی جاتی تھیں جن کا مستقل عنوان میں نے اس شعر کو بنا رکھا تھا۔

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں، اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہو گا؟ دستورِ بہاراں کیا ہو گا!

یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے اور اب ۱۹۸۳ء ہے۔ گویا پورے تیس اکتیس سال کا عرصہ بیت گیا لیکن ہم ہیں کہ ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ اب ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو کھلا اختیار دے دیں کہ وہ یہ طے کریں کہ انہیں کون سا نظام چاہیے۔ شاید آپ گمان کریں کہ اس میں بہت بڑا خطرہ مضمر ہے کہ کہیں لادینیت کے علمبردار یا علاقائیت پرست افراد کی اکثریت منتخب نہ ہو جائے۔ اگر بالفرض والمحال ایسا ہے تو آپ کو کیا حق ہے کہ ان پر ان کی مرضی کے خلاف کوئی نظام مسلط کریں؟ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) میرے نزدیک ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس ملک میں محبِّ دین اور محبِّ وطن افراد کی یقیناً اکثریت ہے اور اگر انہیں آزادانہ ماحول اور مناسب فضا میں موقع دیا جائے تو وہ لازماً پاکستان اور اسلام کے حق میں رائے دیں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب مسئلہ سیاسی یا معاشی حقوق کا چھڑ جاتا ہے اور لادینیت کی علم بردار، علاقائیت پرست اور علیحدگی پسند قوتیں سیاسی یا معاشی حقوق کی دہائی دیتی ہوئی سامنے آتی ہیں تو محبِّ دین اور محبِّ وطن عناصر اس دلیل کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں اس شور و غوغا میں کہ ''یہ ہمارے حقوق کا مسئلہ ہے'' اور ''ہمارے حقوق پر ڈاکا ڈالا گیا ہے'' خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جس نے مشرقی پاکستان میں بھی متحدہ پاکستان کے حامی عناصر کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ آج حقوق کا یہی نعرہ سندھ میں لگ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی اسلام اور پاکستان کے چاہنے والے اکثریت میں ہیں لیکن وہ لوگ اسی دلیل کی وجہ سے غیر مؤثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اصولاً یہ دلیل بڑی قوی ہے۔ آپ جب تک ان کو اس کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گے، حالات صحیح نہیں ہو سکتے۔ آج کل تو بعض حضرات کنفیڈریشن کی بات کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ بات آگے بڑھی تو شاید وہ اس کی بات بھی نہ کریں۔ آج ہم غور کریں تو قلب کی گہرائیوں سے کیسی شدید حسرت آمیز تمنا برآمد ہوگی کہ کاش ۷۱-۱۹۷۰ء میں مغربی اور مشرقی پاکستان کا کنفیڈریشن بن گیا ہوتا تو وہ موجودہ صورتِ حال سے کتنا بہتر ہوتا! اب ہم سندھ میں پھر اسی قسم کی صورتِ حال سے دو چار

ہیں۔ اگر ہم نے ماضی کے تجربے سے فائدہ نہ اُٹھایا تو یہ سخت ناعاقبت اندیشی ہوگی۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اس ملک کے عوام کو ایک بھرپور موقع دیں کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ یہ طے کرسکیں کہ اس ملک کی منزل اسلام ہے یا کچھ اور۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سوال واضح اور دوٹوک طور پر لوگوں کے سامنے آئے تو مختلف طبقوں اور گروہوں کی polarisation موجودہ تقسیم سے بالکل مختلف ہوگی۔ یعنی ایک طرف وہ لوگ ہوں گے جو اس ملک کی منزل اسلام ہی کو قرار دیتے ہیں اور اسی نصب العین کے پیش نظر پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جو کسی دوسرے نظام یا ''اِزم'' کے علم بردار ہیں اور اسی کی جانب پیش قدمی کے لیے علاقائیت پرستی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دے رہے ہیں۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا جائے تو جو لوگ اسلام اور پاکستان دونوں پر پختہ یقین رکھنے والے ہیں، اُن پر لازم ہوگا کہ وہ تحریک پاکستان کے سے جوش و خروش کے ساتھ میدان میں آئیں اور اس ملک کے قبلے کو درست کریں۔ ضروری ہے کہ یہ صرف طالع آزما لیڈروں کا کھیل بن کے نہ رہ جائے بلکہ اس میں اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والا ہر شخص بھرپور حصہ لے۔ اگر اس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کیا گیا، قوت کے ساتھ لوگوں کو کچلا گیا اور طاقت کی دلیل کے بل پر بات منوائی گئی تو یہ زخم بہت گہرے ہوں گے، جس کے لازمی نتائج کے طور پر اسلام اور پاکستان کے حامی عناصر بے بس ہوتے چلے جائیں گے۔ مَیں حیران ہوں کہ سندھ میں ایم آر ڈی کا ایک اہم اور فعال عنصر جمعیت علمائے اسلام سے وابستہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک اہم شخصیت مولانا عبدالکریم بیر شریف والے ہیں جن کے تقویٰ اور تدین کی قسم کھائی جاسکتی ہے، لیکن وہ سندھ میں اس تحریک کے اہم ترین رہنما ہیں۔ ایسے لوگ اس تحریک میں کیوں شامل ہیں؟ صرف اسی دلیل کی وجہ سے کہ ہمارے حقوق دبائے جارہے ہیں، جن کے حصول کے لیے ہمیں لڑنا پڑے گا۔ وہ چاہیں تو دلیل کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حدیث نبویؐ ''من قتل دون ماله فهوشهيد'' کے مطابق جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا

جائے وہ شہید ہے تو پھر یہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں مارے جائیں وہ بھی شہید ہیں۔ عوام میں ان لوگوں کا جو اثر و رسوخ ہے اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے!

مَیں نے اپنے خط میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس ملک کے آئندہ نظام کا فیصلہ کرنا صاحبِ صدر یا ان کے رفقائے کار کا کام نہیں ہے۔ آخر یہ اختیار ان کو کس نے دیا ہے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی اجازت سپریم کورٹ نے دی ہے تو اوّل تو یہ اجازت بہت سی شرائط اور حدود و قیود کے ساتھ دی گئی تھی۔ پھر آپ نے تو سپریم کورٹ پر عبوری دستوری حکم نامہ (P.C.O) نافذ کر دیا جس کی وجہ سے ہماری عدلیہ قابل ترین اور نہایت تجربہ کار جج صاحبان کی خدمات سے محروم ہو گئی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگوں کے حقوق اور اختیارات ان کو لوٹا دیجیے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ یہ بات انسان کے لیے بڑے اطمینان کا باعث بنتی ہے کہ میرے حقوق میرے ہاتھ میں ہیں اور مَیں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اس سے بہت سے منفی جذبات اور زخمی احساسات میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور انسان نارمل انداز میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے قاتل کی جان مقتول کے ورثاء کے ہاتھ میں دے دی ہے کہ تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو جان کے بدلے جان لے لو، چاہو تو اُسے ویسے ہی معاف کر دو اور چاہو تو خون بہا لے کر اس کی جان بخشی کر دو۔ اس احساس سے کہ قاتل کی جان ہمارے ہاتھ اور اختیار میں ہے، ان کے دلوں میں سلگنے والی انتقام کی آگ کسی حد تک ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور یوں بہت سی تلخی از خود رفع ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک پاکستان کا قیام عالمی سطح پر اسلام کے احیاء اور غلبہ کی خدائی تدابیر کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے اور اس کردار کا حق ادا کرنا تمام مسلمانانِ پاکستان کی ذِمہ داری ہے۔ یہ ملک پوری اُمتِ مسلمہ میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ آج ہم ان ساری چیزوں کو بھول گئے ہیں۔ مَیں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ میرے اس خط کو پڑھیے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پوچھیے اور اگر سمجھ میں آ جائے تو پھر اس کو عام کیجیے۔ خاص طور پر مسلم

لیگی ذہن رکھنے والے حضرات اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تحریک پاکستان کے جذبے کے احیاء کے لیے ایک بار پھر کمربستہ ہو جائیں۔ شاید کہ اس طریقے سے ملک کے تحفظ کی کوئی صورت بن جائے اور جو فوری خطرہ سروں پر منڈلا رہا ہے' وہ رفع ہو جائے۔ قوم کو اپنی منزل کا دوبارہ سراغ مل جائے اور ملک کا قافلہ ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کے انداز میں منزل کی جانب رواں ہو جائے۔

یہاں میں اپنے ایک وجدانی احساس کا ذکر بھی کر ہی دوں' جس کا تذکرہ صدر صاحب کے نام خط کے اختتام پر کیا گیا تھا۔ یعنی:

> ''قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ مصر کے طویل دورِ غلامی کے نتیجے میں ان میں سیرت و کردار کا جو زوال و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا' وہ چالیس برس کی صحرا نوردی کے بعد رفع ہو سکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں بھی آزادی کے بعد بے یقینی اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بھٹکتے ہوئے چالیس برس کے لگ بھگ ہونے کو آئے ہیں تو کیا عجب کہ اب اس بھٹکے ہوئے راہی کو منزل کا سراغ مل ہی جائے! یوں مملکتِ خداداد پاکستان عالمی سطح پر احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے انقلاب آفریں عمل کے ضمن میں اپنے مثبت کردار کو ادا کرنے کے لیے کمربستہ اور سرگرمِ عمل ہو ہی جائے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ''

پاکستان میں ابھی کافی لوگ ایسے موجود ہیں جنہوں نے پاکستان کی تحریک میں اپنا پسینہ بہایا تھا بلکہ ابھی ایسے بھی موجود ہیں جنہوں نے قیامِ پاکستان کے لیے زخم کھائے اور اپنے خون کا ہدیہ پیش کیا۔ ایسے بھی ہیں جن کے پورے پورے خاندان شہید ہو گئے تھے۔ میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے آئیں اور دوبارہ قوم کی رہنمائی کریں۔ تحریکِ پاکستان کے اصل جذبے کو ازسرِ نو تازہ کرنے کے لیے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی اور مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کی تنظیمیں' یہ سب مل کر پاکستان و اسلام کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اس دوران خاص طور پر اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی پارٹی کی دشمنی کو اپنا اصل ہدف نہ بنائیں۔ منفی سیاست کا

معاملہ بہت خطرناک ہوگا۔مثبت بات پیش کیجیے۔خاص طور پر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بات کو آگے لائیے جبکہ تشکیل حکومت کے مسئلے کو فی الحال پس منظر میں لے جایئے۔اس وقت اصل چیز اس ملک کی منزل کا تعین ہے۔

مجھے امید واثق ہے کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ پھر ''بھٹکے ہوئے راہی'' کو اپنی اصل کا نشان مل جائے گا اور گویا ''تحریک پاکستان'' کا از سرِ نو احیاء ہو جائے گا۔بصورتِ دیگر اگر جبر اور تصادم کی سیاست کی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ ہم طاقت سے ہر مخالفت کو کچل سکتے ہیں' تو جانے والے تو چلے جائیں گے لیکن اصل نقصان اس ارضِ پاکستان اور اس مقصد کو پہنچے گا جس کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔

مَیں نے یہ ساری گزارشات آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ہمیں نہ تو کوئی نعرہ لگانا ہے' نہ جلوس نکالنا ہے نہ کہیں جا کر ہنگامہ برپا کرنا ہے۔یہ خط آپ کے ہاتھ میں ہے۔اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے اور جس کا جہاں جہاں اثر ورسوخ ہو اس کو پہنچایئے۔اس میں پیش کیے جانے والے حل پر گفتگو بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے محاسن کیا ہیں۔اس کے نتائج کیا ہیں! مَیں نے ایک مخلص محبِ وطن پاکستانی اور دین کے ایک ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے بعد صورتِ حال کا حل آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ یہ خط ۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ اس وقت بھی یہ اچانک اور فوری طور پر تحریر میں نہیں آ گیا تھا بلکہ میرے تقریباً سال بھر کے غور وخوض کا حاصل تھا!

اقول قولی ھذاواستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

***

''عرب نیوز'' کو صدر مملکت کے انٹرویو پر

وضاحتی بیان

* تصریحات وتوضیحات
* ''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۳ء

انٹرویو کا متعلقہ حصہ

Q: There are statements by some people, which are attributed to the government. for example, the statements of Dr. Israr Ahmad.

A: Now you see, Dr. Israr is a controversial figure. I happened to know Dr. Israr 15 years ago and I know him as a Quranic scholar, not Islamic. He used to describe the Tafseer of the Quran on Friday mornings. I also went sometimes in Lahore, Karachi sometimes. That is how I knew Dr. Israr. When we started this Islamization process, we were looking for such individuals. So, we picked Dr. Israr. He came on television. He never spoke anything other than the Tafseer of the Quran and in very clear terms. Unobjectionable, non-controversial issues. The same Dr. Israr, when he comes out of television stands up in Lahore and asks me to stop cricket. The same Dr. Israr goes up in a meeting in Karachi and says "ban the women's organizations." So, he is a controversial figure and one you should not take seriously. I only respect Dr. Israr for his knowledge of the Quran, and

that is all. But even there we came to know a little later his controversial sayings and that is why he is a man who is controversial and we can't bring him.

Q: *I think his demand for stopping cricket must have created more alarm than many of his other demands.*

A: *And you know, it happened face to face. It is not that he sent me a message. I was in Lahore on a Friday, I went to a mosque close by where Dr. Israr was present. So, we said Juma prayers together, and after the prayers, when we were having dua, Dr. Israr stood up, there were 400 or 500 people, and he said: "Mr. President! Can I have your permission to say something?" I thought, he is probably going to talk what is Islam and I said, " Yes, Dr. Israr." So, he stood up and said, "My dear countrymen, my dear brothers-in-Islam, in your presence, I am going to request the President of Pakistan for one favor, for one thing good that we can do in this country." I was very excited. I said, "What?" And he said, "Mr. President, may I request you to please stop cricket in Pakistan, because for five days during the match, people forget everything, including Namaz. Ban cricket." I listened to him and I walked out.*

وضاحتی بیان

میں بلتستان کے دعوتی دورے سے واپس لاہور آیا تو میرے علم میں وہ باتیں آئیں جو جناب صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے جریدہ ''عرب نیوز'' کو انٹرویو دیتے ہوئے میرے بارے میں ارشاد فرمائیں۔ ان میں سے بعض باتیں ذاتی نوعیت کی ہیں جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن ایک معاملہ خالص واقعاتی نوعیت کا ہے جس کی تصحیح ضروری ہے۔

جہاں تک صدر صاحب کے اس قول کا تعلق ہے کہ میں عالم دین نہیں ہوں تو وہ بالکل درست ہے' بلکہ انہوں نے جو مجھے ''قرآنی سکالر'' قرار دیا ہے تو فی الواقع میں اس

خطاب کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ میں تو زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور دین کا حقیر خادم ہوں۔ بہر حال مطالبِ قرآنی کی تفہیم و اشاعت کے ضمن میں صدر صاحب نے جو تحسین آمیز کلمات میرے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں میں ان پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

البتہ کرکٹ کے بارے میں میری ایک بالمشافہہ درخواست کا ذکر اس انٹرویو میں جس انداز میں آیا ہے وہ یکسر خلافِ واقعہ اور حد درجہ مغالطہ آمیز ہے۔ یہ واقعہ مسجد دارالسلام، باغ جناح میں پیش آیا تھا جہاں میں عرصہ دراز سے خطابت و امامت جمعہ کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ چنانچہ وہاں نہ میری موجودگی اتفاقی تھی نہ صدر صاحب کی آمد اچانک ہوئی تھی۔ صدر صاحب وہاں پورے سرکاری اہتمام اور سکیورٹی وغیرہ کے انتظامات کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ پھر جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ بھی نماز کے خاتمے اور دعا کے بعد اچانک کھڑے ہو کر اور ان سے اجازت طلب کر کے نہیں کیا تھا بلکہ ''الدین النصیحه'' کے فرمانِ نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے نمازِ جمعہ سے قبل خطاب میں خالصۃً خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ان کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک بات کرکٹ کے کھیل کے بارے میں تھی کہ اس کے باعث قوم کا بہت سا وقت اور پیسہ ضائع ہوتا ہے اور ہم اس عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے، لہٰذا اسے ملک بدر کر دیا جائے۔ دوسری بات خواتین کی ہاکی ٹیم کے بارے میں تھی۔ مزید برآں کچھ باتیں عائلی قوانین اور ستر و حجاب کے احکام کی تنفیذ کے بارے میں تھیں۔

الحمد للہ، صدر صاحب نے میری پوری تقریر نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنی تھی اور ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا کہ وہ میری بات سن کر مسجد سے باہر نکل گئے ہوں۔ میری تقریر کے بعد انہوں نے میری امامت میں نماز جمعہ ادا کی، اس کے بعد مجھ سے معانقہ کیا، خیریت دریافت کی، میری باتوں پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا، پھر پورے وقار کے ساتھ اور نہایت خوش گوار ماحول میں مسجد سے رخصت ہوئے۔

یہ تاثر بھی قطعاً خلافِ واقعہ ہے کہ کرکٹ کے بارے میں اس اظہارِ خیال یا

مطالبے سے میں یکدم متنازعہ شخصیت بن گیا تھا اور اسی وجہ سے صدر صاحب نے مجھ سے دُوری اختیار کر لی تھی۔ اصل واقعات یہ ہیں کہ مسجد دارالسلام کا یہ واقعہ ۲۸ نومبر ۱۹۸۰ء کو پیش آیا تھا اور اس کے بعد ہی صدر صاحب کی خصوصی ہدایات پر پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن نے ''الہدیٰ'' کا پروگرام طے کیا جو اپریل ۱۹۸۱ء سے جون ۱۹۸۲ء تک پورے پندرہ ماہ جاری رہا۔ خود صدر صاحب نے بنفسِ نفیس مجھے ''ستارۂ امتیاز'' عنایت فرمایا۔ ایک ذریعے سے مجھے مرکزی وزارت میں شمولیت کی دعوت دی اور اس سے میرے انکار پر بالآخر مجھے وفاقی کونسل عرف مجلس شوریٰ کے لیے نامزد کیا۔

''رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند'' کے مصداق اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر کسی شخص کو کسی خدمت کا موقع دینے یا نہ دینے کا اختیار حکمرانوں کو حاصل ہوتا ہے جس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ البتہ اس ضمن میں خلافِ واقعہ باتوں کا صدرِ مملکت ایسی اہم شخصیت کی جانب منسوب ہونا یقیناً بہت معیوب ہے' اسی لیے میں نے یہ پوری وضاحت قوم کے سامنے پیش کر دی ہے۔

رہا کسی کا ''متنازعہ شخصیت بن جانا'' تو میں حیران ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو بالکل غیر متنازعہ ہو سوائے اس کے جس کا سرے سے کوئی اصول ہی نہ ہو' یا اس منافق کے کہ جس کے نفاق کا پردہ ابھی چاک نہ ہوا ہو۔ اس سلسلہ میں صدر صاحب اگر ذرا خود اپنے بارے میں غور فرمالیں کہ وہ کتنی متنازعہ یا غیر متنازعہ شخصیت ہیں تو میرے خیال میں کم از کم اس ضمن میں کوئی ابہام باقی نہ رہے گا۔

خاکسار

اسرار احمد

۲۵ اگست ۱۹۸۳ء

***

دورۂ حیدر آباد (دکن)

+

قادیانیوں سے متعلق آرڈیننس

* خطابِ جمعہ (۲۷ اپریل ۱۹۸۴ء)
* ''میثاق'' جون ۱۹۸۴ء

ادعیۂ مسنونہ کے بعد:

حیدر آباد (دکن) کے دعوتی دورے کے باعث دو ہفتوں کی غیر حاضری کے بعد آج ملاقات ہوئی ہے۔ اس دوران متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں کہ جن کے بارے میں مختصر اظہارِ خیال مناسب ہے۔ ہندوستان کی سرزمین سے ہمارا تعلق یہ ہے کہ ہم میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو وہاں سے نکالے یا نکلے ہوئے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند تاریخی، جغرافیائی اور عمرانی اعتبار سے ایک وحدت تھا۔ وہ اس لیے تقسیم ہوا کہ مسلمانوں کی قومیت کسی زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک آفاقی ملت اور عالمی اُمت کے افراد ہیں۔ ہمارے تحت الشعور میں یہ بات رچی بسی ہے۔ پھر شعوری طور پر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ آزاد بھارت میں غیر مسلموں کی عظیم اکثریت مسلمانوں کی اقلیت کے دینی و قومی تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایک علیحدہ آزاد و خود مختار علاقہ جس میں ان کی اکثریت ہے، ملنا چاہیے تاکہ وہ اس ملک پر اللہ کا دین قائم کریں۔ چنانچہ تحریک پاکستان چلی اور اللہ کے فضل و کرم سے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام سے ایک آزاد و خود مختار سلطنت کا وجود عمل میں آ گیا۔ یہ سلطنت دو حصوں میں منقسم تھی، جن کے مابین ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ تھا۔ مشرقی پاکستان ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط پالیسیوں کی وجہ سے

بنگلہ دیش ہو گیا اور اب مغربی پاکستان ہی ''پاکستان'' کے نام سے دنیا کے نقشہ پر موجود ہے۔ پاکستان کو قائم ہوئے سینتیسواں سال چل رہا ہے۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمان نقل مکانی کر کے پاکستان نہیں آسکے اور قریباً نصف تعداد' یعنی پانچ کروڑ کے لگ بھگ' وہیں رہ گئی۔ یہاں متعدد خاندان ایسے ہیں جن کے اعزہ و اقارب تاحال ہندوستان میں مقیم ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم ہندوستان کے مسلمان شہریوں سے اپنے ذہن کو خالی کر لیں۔ یہاں کے مسلمانوں کو وہاں کے مسلمانوں کے حالات سے قدرتی طور پر دلچسپی ہے۔

دوسرا معاملہ اس نہایت ہی اچھی خبر سے متعلق ہے جو بہت عرصہ کے بعد پڑھنے میں آئی ہے۔ قادیانیوں کے متعلق خواہ وہ ربوہ سے وابستہ ہوں خواہ لاہوری مکتبِ فکر سے' صدر صاحب کے جاری کردہ آرڈیننس پر بھی مَیں آج کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دورے کے تاثرات و مشاہدات

ہندوستانی قوم پرستی کی عدم موجودگی

ہندوستان میں مسلمانوں کا اور اسلام کا مستقبل بہت مخدوش ہو جاتا اگر وہاں اللہ کے فضل و کرم سے چند خاص حالات پیدا نہ ہو جاتے۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے اُس درجہ کی تشویش ناک اور مخدوش صورتِ حال فی الوقت موجود نہیں ہے کہ جس درجے کا پہلے اندیشہ تھا۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں بھی تاحال کوئی ایک مرکزی نیشنل ازم develop نہیں ہو سکا۔ ہندوستانی قوم پرستی کا جذبہ اگر مضبوط ہو گیا ہوتا تو وہاں مسلمانوں کے حالات یقیناً ناگفتہ بہ ہو جاتے۔ وہاں بھی صورتِ حال کم و بیش وہی ہے جس کا ہمیں بھی کبھی کبھی تجربہ ہوتا رہتا ہے' یعنی علاقائیت پرستی یا صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کے مطالبات۔ وہاں یہ جذبات ہمارے یہاں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ شدید ہیں۔ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے مابین ایک مستقل رسہ کشی ہے کیونکہ تہذیب کا بڑا فرق ہے۔ زبانوں کا بڑا فرق ہے۔ شمالی ہند کا

رہنے والا ہو یا جنوبی ہند کا، اگرچہ دونوں ہی ہندو کہلاتے ہیں لیکن ان کے یہاں نہایت درجے فرق و تفاوت ہے۔ شمالی ہند میں رام چندر جی ہندوؤں کے ہیرو بلکہ ایک طرح سے اوتار ہیں، معبود ہیں جبکہ راون کو باغی، فسادی، چور، ڈاکو اور شر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں ہر سال اس کا پتلا ''رام لیلا'' کے تہوار پر جلایا جاتا ہے۔ جنوبی ہند میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کے ہندوؤں کا ہیرو ''راون'' ہے۔ وہ اس کی ایک طرح سے پوجا کرتے ہیں جبکہ رام چندر جی کو لٹیرا، غاصب، ظالم اور جنوبی ہند کی آزادی سلب کرنے والا حملہ آور سمجھتے ہیں۔ بعض شہروں میں رام چندر جی کا پتلا جلایا بھی جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی سندھ میں کچھ کج فہم اور perverted ذہن کے لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو لٹیرا اور ڈاکو کہا جبکہ راجہ داہر کو محبِ وطن قرار دیا۔ یہ اس نوع کی چیزیں ہیں کہ جب علاقائیت پرستی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ اس طریقے سے ظہور کرتا ہے۔

دوسرا معاملہ آسام اور اس علاقے سے متعلق ہے جو ہندوستان کا شمال مشرقی کونا ہے۔ یہ ہندوستان سے تقریباً کٹا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا کوریڈور ہے جو بنگلہ دیش کی شمالی سرحد کے ساتھ اس علاقے کو ہندوستان سے ملاتا ہے۔ یہاں چار پانچ صوبے ایک علیحدہ سے علاقہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ دھرم کے لحاظ سے اگرچہ سب ہندو ہیں لیکن پھر بھی ان کی تہذیب اور زبان ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ ان میں بہت فرق ہے۔ اس کے باعث ان کی آپس میں چشمک چلتی رہتی ہے اور مرکزی حکومت سے بھی ان کے روابط ناخوشگوار ہیں اور ان میں رخنہ پڑتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہماری سرحد سے متصل بھارتی پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اور سکھوں کے ایک موثر گروہ کی مرکزی حکومت سے جو کشمکش چل رہی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ روزانہ اخبارات میں خبریں آتی رہتی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوستان کی لیڈر شپ کی توجہات ان گھمبیر مسائل کی طرف مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو سانس لینے کا موقع مل گیا ہے اور ان کے لیے یہ صورت حال نتیجہ کے اعتبار سے مفید ہے۔

تیسری بات جس کا ہندوستان جا کر صحیح اندازہ ہوتا ہے یہ ہے کہ وہاں خود ہندوؤں میں تاحال ذاتیں اور چھوت چھات اسی طرح موجود ہے جیسی آزادی سے پہلے تھیں۔ ہریجنوں کے ہندو دھرم کو چھوڑنے کے بھی متعدد واقعات ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مذہب کا کوئی احیاء نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندومت میں اتنی جان‘ اتنا دم خم‘ اتنا وزن نہیں ہے کہ دنیا میں جدید علوم اور sciences کی ترقی کی بدولت جو نقطہ نظر پیدا ہوا ہے‘ اس کا مقابلہ کر سکے۔ لہٰذا ہندو دیو مالا کے احیاء کی کوئی شکل پیدا ہونا مشکل ترین مسئلہ نظر آتا ہے۔ ہندو قوم پرستی تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن ہندو مذہب کا احیاء میرے نزدیک قریباً خارج از بحث ہے۔ آزادی کے بعد اگر ہندو قوم کا اپنے مذہب سے زیادہ لگاؤ پیدا ہوتا‘ اسے زندہ کرنے کے لیے زیادہ سرگرمی ہوتی تو یہ صورت حال وہاں پیدا نہ ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں کو ایک سہارا ملا ہے۔ ہم اسے indirect relief کہیں گے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا عزم اور حوصلہ

حیدر آباد‘ دکن جنوبی ہندوستان کا سرا ہے۔ استخلاصِ وطن تک یہ ہندوستان کی بڑی عظیم ریاست تھی جو مسلمان تمدن کا بہت بڑا گہوارہ رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور اس سے متعلقہ اداروں نے اردو زبان کو بڑی تقویت پہنچائی۔ تقسیم سے قبل تمام علوم حتیٰ کہ ہر نوع کی سائنس‘ انجینئرنگ اور میڈیکل کی تعلیم وہاں اردو میں ہو رہی تھی اور انتہائی زرِ کثیر خرچ کر کے ہر شعبے کے لیے نصاب اردو میں مدون و مرتب کر لیے گئے تھے۔ پھر یہ کہ میر عثمان علی خان میں علم دوستی اور علماء کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ ان کے دور میں ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمان اصحابِ علم و فضل اور ماہرین فن موجود تھے‘ ان میں سے اکثر کو کونے کونے سے کھینچ کر حیدر آباد بلانا اور مختلف اداروں میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے لگانا ان کا قابل ستائش کارنامہ ہے۔ اس طرح حیدر آباد دکن میں اتنا بڑا علمی سرمایہ جمع ہوا کہ اس کے گہرے اثرات تاحال وہاں کی فضا میں موجود ہیں۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے دوران اور پھر متصلاً بعد ریاست حیدر آباد پر

جو کچھ بیتی تھی‘ اس کے ایک وقتی ردعمل کے طور پر وہاں کے مسلمان مایوسی کی کیفیت سے دوچار ہوئے تھے۔ اتنی بڑی ریاست کا مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن جانا بڑا عظیم سانحہ تھا۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوؤں میں سرکشی پیدا ہوئی اور انتقامی جذبات مشتعل ہوئے تو اس دور میں بڑے ہی سخت اور کٹھن حالات سے حیدر آباد کے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا لیکن بحمد اللہ اب وہاں بہت حد تک سکون کی کیفیت ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی کھٹ پٹ ہو جاتی ہے‘ فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے ہیں لیکن اب وہاں کا مسلمان ذہناً اس کے لیے بالکل تیار ہے کہ اگر ایسی صورتحال سے نمٹنا پڑ جائے تو اسے اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی۔ کم وبیش پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی کیفیت یہی ہے کہ وہ اس نوع کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہناً اور عملاً تیار ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کے اس عزم اور حوصلے کے لیے میں ایک مثال دے رہا ہوں کہ جیسے بعض امراض میں ڈاکٹر مریض سے کہتا ہے کہ اب تمہیں اسی مرض کے ساتھ زندہ رہنا ہے‘ you have to live with it۔ اگر کسی کو ذیابیطس ہو گئی ہو تو یہ جڑ سے جانے والی بیماری نہیں ہے۔ ایسے مریض کو اپنی عادات‘ مرغوبات اور خوراک کو اس بیماری کے ساتھ adjust کرنا ہو گا۔ اپنے معمولات میں کچھ ردوبدل کر کے اسے اسی مرض کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس بات کو ذہناً قبول کر لیا ہے کہ ہمیں اسی صورت حال کے ساتھ یہیں زندہ رہنا ہے۔ لہٰذا جب کبھی کوئی مڈبھیڑ‘ فساد‘ خون ریزی ہوتی ہے تو مسلمان اس صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

ویسے بحیثیتِ مجموعی جنوبی ہند میں یہ صورت حال نہیں ہے‘ یعنی تامل ناڈو‘ کرناٹک اور کیرالہ وغیرہ میں جو خالص جنوبی ہند کے صوبے ہیں۔ یہ نام بھی بہت سے لوگوں کے لیے نئے ہوں گے‘ اس لیے کہ اب ہندوستان میں گنتی کے صوبے اپنے سابقہ ناموں کے ساتھ باقی رہ گئے ہیں۔ وہاں نئے نئے صوبے وجود میں آئے ہیں۔ پھر حکومت ہند نے صوبوں کی نئی حد بندی خالص لسانی (linguistic) بنیاد پر کی ہے۔ ہر صوبے کی اپنی ایک زبان ہے۔ وہاں کے تمام اندرونی معاملات اسی زبان میں طے ہوتے ہیں۔ مرکز

سے ان کا رابطہ انگریزی کے ذریعے ہوگا۔ ہندی زبان کی بالادستی کو جنوبی ہند نے کسی طرح تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ ہندی پورے ہندوستان کی سرکاری زبان نہیں ہے۔

جہاں تک جنوبی ہند کے تین بڑے بڑے صوبوں کا تعلق ہے تو وہاں مسلمان بڑے امن اور سکون سے ہیں۔ ان صوبوں کی حد تک فرقہ وارانہ فسادات کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ شمالی ہند میں فسادات ہوتے رہتے ہیں' اور وہاں بھی مسلمانوں نے طے کرلیا ہے کہ ہمیں اسی صورت حال کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنی ہے۔ شمالی ہند میں میرے پہلے سفر کے موقع پر کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ۱۹۷۱ء تک تو ہماری ذہنی کیفیت یہ تھی کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا محافظ پاکستان ہے۔ جب پاکستان دولخت ہوگیا تو اس کی مجموعی طاقت نصف ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی گنا گھٹ گئی۔ پھر ہمارا رعب اور بھرم ختم ہوا۔ ہمارا وقار اور ہماری عزت بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم نے سوچا کہ پاکستان اپنی ہی حفاظت کرلے' یہی کافی ہے۔ باقی یہاں خود ہمیں اپنی حفاظت کرنی ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اب اگر کوئی نازک مرحلہ درپیش ہوگا تو مار کر مریں گے' بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے۔ الحمدللہ وہ اپنے اس عزم اور ارادے میں پختہ ہیں اور ان میں اَب مرعوبیت اور شکست خوردگی کے آثار نہیں ہیں۔ یہاں پاکستان میں ہمارا گمان ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسلمان بڑی پریشانیوں سے دوچار ہوگا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

دینی اعتبار سے وہاں کا مسلمان ہمارے مقابلہ میں بہت بہتر حالت میں ہے۔ ہمیں دولت کی ریل پیل' فراوانی اور آسائشوں نے دین سے بہت دور کردیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ آسائشیں اور دولت کی فراوانی دینی اعتبار سے مفید ہونے کے بجائے ہمارے حق میں نقصان دہ ہوئی ہیں۔ وہاں چونکہ ہر وقت مقابلے کی کیفیت رہتی ہے' لہٰذا اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کا احساس اور جذبہ زیادہ ہے۔ وہ اپنے دین کی بقا کے لیے ہم سے زیادہ فعال اور active ہیں۔ اس وقت بھی ہندوؤں کی طرف سے کوششیں ہو رہی ہیں' خاص طور پر راجھستان میں کہ بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو شدھی کرلیا جائے۔ اسی

لیے وہاں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو محض نام کے مسلمان ہیں' جیسے میوقوم تھی کہ ماضی میں کسی بزرگ سے متاثر ہو کر اس کے ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن نہ ان کی تعلیم ہوئی' نہ تربیت ہوئی تو نام بھی ملے جلے سے رہے۔ ان میں مسلمانیت بھی تھی اور ہندوئیت بھی۔ رہن سہن خالص ہندوانہ۔ مسلمان اس طرف سے غافل نہیں ہیں' بیدار ہیں اور اس کی روک تھام کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ صورت حال بھی ہے کہ جنوبی ہند میں ہندو مسلمان ہو رہے ہیں۔ وہاں گاؤں کے گاؤں ایک ساتھ مسلمان ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی اصل ڈاور قوم کے لوگ اسلام کی طرف راغب اور مائل ہو رہے ہیں۔ وہاں مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا انداز جارحانہ اور مؤثر ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے تبلیغی کوششیں ہندوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔

فقہی مکاتب فکر میں رواداری اور تعاون

جس طرح ہمارے یہاں علیحدہ علیحدہ فقہی مکاتبِ فکر ہیں' اسی طرح وہاں بھی ہیں۔ پاکستان میں حنفی ہیں' اہل حدیث ہیں اور شیعہ ہیں جبکہ ہندوستان میں شافعی مسلک کے لوگ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ مہاراشٹر اور کیرالہ ہندوستان کے مغربی ساحل کے دو ایسے صوبے ہیں جہاں شافعی المسلک مسلمانوں کی اکثریت ہے' کیونکہ یہاں اسلام عرب تاجروں کی تبلیغ سے پھیلا تھا جو زیادہ تر شافعی المسلک تھے۔ بمبئی کی جامع مسجد جو سب سے بڑی مسجد ہے' وہ شافعی مسلک کی ہے۔ وہاں کے خطیب وامام شافعی ہیں۔ اسی طریقہ سے جس طرح مختلف جماعتیں دین کے لیے یہاں کام کر رہی ہیں' وہاں بھی موجود ہیں۔ جمعیت علماء ہند وہاں بھی ہے' جو بڑی قوی اور مؤثر ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے صاحبزادے مولانا اسعد میاں اس کے سربراہ ہیں۔ پھر جماعت اسلامی یہاں ہے تو وہاں بھی ہے۔ تبلیغی جماعت یہاں ہے تو اس کا اصل مرکز ہے ہی ہندوستان میں۔ چنانچہ جو تحریکیں اور جماعتیں ہمارے یہاں سرگرم عمل ہیں' وہاں بھی برسرکار ہیں۔ اس ضمن میں اچھی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں مختلف مکتب ہائے فکر میں اور تحریکوں میں جو تلخی اور بُعد ہے' وہ وہاں نہیں ہے۔ وہاں بحیثیت مجموعی رواداری بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر باہمی

تعاون کی فضا موجود ہے۔ میں جنوبی ہندوستان میں جہاں بھی گیا' میں نے یہی بات دیکھی۔ دہلی اور علی گڑھ میں بھی یہی خوش گوار کیفیت نظر آئی۔

اس باہمی اشتراک کی دو وجوہات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ وہاں ایک مشترک دشمن سے مقابلہ ہے اور ہر وقت ہے لہٰذا مسلمانوں کے اندر اختلاف کی خلیج بڑھنے نہیں پاتی۔ ان کو اندازہ ہے کہ یہاں ہم کن حالات سے دوچار ہیں اور ہمیں کس طرح اپنا تحفظ کرنا ہے۔ یہ طرزِ عمل اس لحاظ سے نہایت مفید ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے اور اختلافی مسائل پر مناظرہ ومجادلہ سے حتی الامکان اپنا دامن بچاتے ہیں۔ وہاں اکثر دیوبندی اور اہل حدیث حضرات بریلوی مکتب فکر کی مساجد میں ان کے امام کی اقتداء میں نمازیں ادا کر لیتے ہیں۔ یہی روش اکثر بریلوی حضرات کی بھی ہے۔ یہ رواداری باہمی اشتراک وتعاون میں بے حد ممد ہے۔

ثانیاً یہ کہ وہاں دینی جماعتوں کو سیاست کے میدان میں کوئی خاص توقع نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہاں پاکستان میں انتخابی سیاست نے زیادہ خرابی پیدا کی ہے۔ جماعت اسلامی کو انتخاب میں جانا ہے لہٰذا اسے بھی ووٹ چاہئیں۔ نورانی میاں کی جمعیت کو بھی ووٹ چاہئیں اور مفتی محمود مرحوم کی جمعیت کو بھی ووٹ چاہئیں۔ ان سب کے پاس اپیل تو ایک ہی ہے۔ ووٹ اسلام ہی کے نام پر مانگے جائیں گے' لہٰذا جب تک وہ اپنے اپنے اسلام کو ممیز نہ کریں اور اس کا ایک جداگانہ تصور اور تشخص قائم نہ کریں تو اپنے لیے علیحدہ ووٹ کیسے حاصل کریں گے! یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے یہاں فقہی وکلامی اختلافات نے فرقہ واریت کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اسے جنگل کی آگ کی طرح بڑھا دیا ہے۔ انتخابات میں حصہ لینے کی خاطر یہی اختلافات دینی اعتبار سے ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جمہوریت کے قیام کے لیے اتحاد ہو جائے گا چاہے اس اتحاد میں سوشلسٹ اور علاقائی قومیت کے نظریات رکھنے والی پارٹیاں بھی شامل ہوں' لیکن دین کے لیے آپس میں تعاون واشتراک نہیں ہوگا' اِلا ماشاء اللہ۔ ہندوستان میں یہ چیز نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ

سیاسی اعتبار سے محب دین حلقوں کے لیے کوئی چانس نہیں ہے۔ ویسے لبرل قسم کے مسلمان کانگریس (آئی) میں بھی ہیں۔ دوسری کانگریس اور جنتا پارٹی میں بھی ہیں۔ مسلم لیگ کا سیاسی پلیٹ فارم بھی موجود ہے۔ کچھ مسلمان ان کے ذریعے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں منتخب بھی ہوجاتے ہیں' لیکن من حیث المجموع کسی مسلمان جماعت کا اقتدار میں آنا خارج از امکان و بحث ہے۔ یہ بات بھی اس خیر کے لیے ممد ہوگئی ہے کہ دینی جماعتوں میں اپنا اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے کا جذبہ زیادہ نہیں ہے' کافی حد تک دبا ہوا ہے۔

یہ جماعتیں اپنے اپنے طریقے پر کام کر رہی ہیں۔ تبلیغی جماعت اپنے طور پر کام کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی کا اپنا ایک انداز ہے۔ علماء کے دوسرے حلقے اپنے اپنے طریقوں پر دین کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ان میں اشتراک و تعاون بھی ہے۔ چشمک نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان جماعتوں کے علاوہ وہاں بہت سے نئے ادارے مقامی طور پر بھی قائم ہو گئے ہیں جو اپنی جگہ علمی و تحقیقی انداز سے دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں بحیثیت مجموعی ان سب کے مابین تعاون کی فضا ہے۔ وہ ماحول یہاں دیکھنے میں نہیں آئے گا۔ حیدر آباد دکن میں خاص طور پر میں نے دیکھا کہ وہاں بحمد اللہ یہ فضا بہت نمایاں ہے۔ باہم بڑا تعاون ہے' رواداری ہے۔ مختلف جماعتوں اور اداروں کا اپنا علیحدہ طریق کار بھی ہے لیکن صاف محسوس و مشہود ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ اس تعاون و اشتراک کی بڑی برکات ہیں جو وہاں ظاہر ہو رہی ہیں۔

قرآن مجید کے تراجم

ایک اور خاص بات یہ سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کا کام بڑی تیزی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کریڈٹ وہاں کی جماعت اسلامی کو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت سرکاری طور پر تسلیم شدہ (officially recognized) سترہ زبانیں ہیں۔ ان میں سے الحمدللہ' ثم الحمدللہ بارہ زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ جب کسی مقامی زبان کے ترجمہ قرآن مجید کے تعارف کے لیے تقاریب منعقد ہوئیں تو ان میں ہندوؤں خاص طور

پر ان کے نوجوانوں نے بھی شرکت کی۔ ایسی ہی ایک تقریب میں کچھ ہندو نوجوانوں نے منتظمین میں سے ایک مسلمان کا گریبان پکڑ لیا اور کہا: ''ظالمو! تم نے ہزار برس تک اس کتاب کو کہاں چھپائے رکھا؟ آج تم اسے introduce کرا رہے ہو! ایک ہزار برس سے تم یہاں ہو۔ کتاب الٰہی تمہارے پاس تھی، تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اس میں کیا لکھا ہے!'' (یہ روایت بالمعنی ومفہوم ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمارا قومی وملی جرم ہے جس کی سزا ہم نے بھگتی ہے۔ جب ہندوستان کا ہندو چپے چپے پر مسلمان تہذیب کے آثار اور مسلمانوں کے تمدن کی باقیات الصالحات، بڑی عظیم مساجد، عالی شان عمارات دیکھتا ہے تو اس کے دل میں انتقامی آگ بھڑکتی ہے کہ ہماری سرزمین پر باہر سے آنے والوں کی تہذیب وتمدن کا سکہ چلتا رہا اور ہم سینکڑوں سال ان کے غلام رہے۔

حیدر آباد شہر کا یہ حال ہے کہ اگرچہ وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں لیکن تناسب کے لحاظ سے وہ شہر کی موثر اقلیت ہے۔ تیس لاکھ کے شہر میں ان کی آبادی ۴۵ فیصد بن جاتی ہے۔ البتہ حیدر آباد شہر کے دو حصے ہیں: ایک قدیم حیدر آباد اور ایک جدید حیدر آباد۔ قدیم شہر میں مسلمان تقریباً ۸۰ فیصد آباد ہیں جبکہ جدید میں یہ تعداد بہت کم ہے۔ حیدر آباد شہر پر مسلمان تہذیب کی چھاپ فیصلہ کن ہے۔ ہر جگہ شاندار مساجد دیکھنے میں آئیں گی، کوئی چھوٹا سا مندر کہیں نظر آجائے تو آجائے۔ حال ہی میں ایک پہاڑی پر ''برلا'' کے نام سے ایک نیا مندر تعمیر ہوا ہے جو بلندی پر ہونے کی وجہ سے دور سے نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں کم از کم حیدر آباد شہر میں کوئی بڑا مندر نظر نہیں آیا۔ اس کے برعکس مسجدیں ایک سے ایک شاندار اور فن تعمیر کا شاہکار ہیں۔ مکہ مسجد جو شہر کے وسط میں ہے، ہماری شاہی مسجد جیسی ہے، البتہ اتنی بڑی نہیں ہے۔ شہر کے بالکل وسط میں ہونے کے باعث اس کی کمانڈنگ حیثیت ہے۔ پھر ہر محلہ میں بڑی بڑی مساجد ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد، دکن اسلامی تہذیب وتمدن کا کتنا عظیم گہوارہ رہا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر دل پر ایک حسرت کا تاثر تو قائم ہوتا ہے کہ آخر یہ ہمارے ہاتھ سے کیوں چھن گئیں! ہندوستان میں یہ بپتا مسلمانوں پر کیوں آئی؟ پھر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے عیش

کیے ہیں' عمارتیں بنائی ہیں' باغات لگوائے ہیں اور مقبرے بنانے میں تو باقاعدہ دوڑ میں حصہ لیا ہے لیکن بحیثیت مسلمان دعوت و تبلیغ' شہادت علی الناس کے جو دینی فرائض عائد ہوتے تھے' ان کو ادا نہیں کیا۔ قرآن حکیم کا توحید پر مبنی انقلابی فکر دوسروں تک کیا پہنچاتے' خود مسلمان اس سے ناواقف رہے اور اب تک ناواقف ہیں الا ماشاء اللہ!

ڈاکٹر اقبال کا ایک مصرع ہے کہ ؏ مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے۔ چنانچہ ہندوستان کا مسلمان اسلام کے لیے اب زیادہ بیدار' فعال اور چوکس ہے۔ اب وہاں مناسب نہج سے دعوت و تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ مستقبل کے حالات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس خیال کو خارج از بحث نہیں کہا جا سکتا کہ شاید اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہندوستان میں ہو اور اللہ تعالیٰ اپنا فضل اس طور سے فرما دے کہ:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ہم یہاں عیش و آرام اور اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر میں پڑے رہیں۔ ہمارے سیاسی زعماء اپنے اختلافات سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔ ہمارے علماء کرام اپنے علم و فضل سے لوگوں کی اصلاح اور ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کرنے کے بجائے فقہی اور گروہی تحفظات کے چکر میں پڑے رہیں اور انتخابی سیاست ہی میں الجھے رہیں جبکہ ہندوستان کا مسلمان تمام تر مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود کام کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور وہاں اسلام کا کام بہتر شکل میں ابھر کر ہمارے سامنے آ جائے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

عمومی دینی حالت

دہلی' علی گڑھ اور خاص طور پر حیدر آباد دکن میں دینی لحاظ سے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہاں تا حال پردہ موجود ہے۔ ہمارے یہاں سے تو پردہ قریباً ختم ہو چکا ہے۔ کراچی اور لاہور جیسے شہروں میں آپ کو برقعے شاذ ہی کہیں نظر آئیں گے۔ مسلمانوں کی تقریبات' شادی بیاہ کے معاملات میں کہیں سینکڑوں میں کوئی ایک خاتون برقع والی ہو'

ورنہ برقع ہمارے یہاں معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں اس لحاظ سے حالت بہت بہتر ہے۔ وہاں مسلمانوں کی معاشرت وتہذیب کا جونقشہ تقسیم سے پہلے تھا وہ کافی حد تک برقرار ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہاں کی مسلمان عورت بیدار نہیں ہے یا جدید تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہے۔ حیدر آباد میں میرے درس اور تقریر میں بہت بڑی تعداد میں خواتین نے بھی شرکت کی۔ روزانہ دوسوا دو گھنٹے کی ایک تقریر عشاء کے بعد ہوتی تھی۔ تین دن تو مرکزی مقام کے لحاظ سے مکہ مسجد میں ہوئی ہیں۔ باقی دنوں میں مختلف جگہوں پر بڑی مساجد میں جلسے ہوئے ہیں۔ آخری جلسہ جو ۱۹ اپریل کی شب کو مکہ مسجد میں ہوا ہے تو اس کی حاضری کے بارے میں منتظمین کا اندازہ ہے کہ دس ہزار کے قریب صرف مرد شریک تھے۔ مکہ مسجد کا صحن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ درمیان میں خاندانِ آصفیہ کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ صحن کا دو تہائی حصہ مسجد کے دالان سے متصل ہے اور ایک تہائی مقبروں کے بعد ہے جہاں خواتین کی نشست کا انتظام تھا۔ بائیں صحن کے ساتھ بڑی گیلری بھی ہے۔ منتظمین نے بتایا کہ اتنی ہی تعداد میں وہاں خواتین بھی شریک تھیں۔ میں نے قریباً دو گھنٹے ''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر تقریر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ مجال ہے کہ دورانِ تقریر ایک آدمی بھی اس مجمع سے اٹھا ہو۔ پھر یہ کہ ہندو پریس نے میرے دروس اور تقریروں کے بارے میں تفصیلی رپورٹس اخبارات میں شائع کیں۔ اپنے تاثرات بیان کیے۔ میری دعوت کے بارے میں مضامین لکھے اور اسے سراہا۔ ایک ہندو leading advocate مکہ مسجد میں میری دوسری تقریر میں شریک ہوا اور ایک بڑا سا پھولوں کا ہار لے کر آیا اور میرے گلے میں ڈالا۔ وہ ایک سپاس نامہ بھی پڑھنا چاہتا تھا' لیکن اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لہٰذا وہاں ہندوؤں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو face value پر بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حیدر آباد میں رابندر ناتھ ٹیگور کے نام سے ایک بہت بڑا آڈیٹوریم بنا ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ میرے جانے سے ایک دینی اجتماع ہوا' ورنہ وہاں ثقافتی طائفے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔ اس میں کثیر تعداد میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں میں نے ہندوستان کے

چند شہروں کے اپنے حالیہ دورے کے متعلق آپ کے گوش گزار کر دی ہیں۔

آپ دعا کریں کہ وہاں کے مسلمان جن حالات میں بھی ہیں انہیں اللہ استقامت دے۔ دُنیوی اعتبار سے ان کے لیے ترقی کے اتنے مواقع نہیں ہیں جو ہمارے لیے یہاں کھل گئے۔ دنیوی ترقی کے جو دروازے ہمارے لیے کھل گئے ہیں، ہم نے ان کو اپنے لیے مضر بنالیا ہے۔ جس کے پاس دو پیسے آ گئے، خوشحالی اور آسودگی آ گئی اس کی تہذیب و معاشرت کے انداز بدل گئے۔ شعائر دینی سے بُعد بڑھ گیا، الا ماشاء اللہ۔ تنگی ترشی کے ساتھ برقع بھی تھا، پردہ بھی تھا، دین سے کسی نہ کسی درجے میں شغف بھی تھا۔ ذرا سی کشادگی حاصل ہو گئی تو بہت سی چیزوں کو جو ہمارے دین اور تہذیب کے شعار میں شامل رہی ہیں، اٹھا کر پھینک دیا گیا ہے۔ بہر حال میرا assessment یہ ہے کہ دینی اعتبار سے ہندوستان کا average مسلمان پاکستان کے average مسلمان سے بہت بہتر حالت میں ہے۔ مزید یہ کہ وہاں اسلام کا مستقبل کسی درجہ میں بھی قطعاً مخدوش نہیں ہے۔

قادیانیوں سے متعلق آرڈیننس

دیر آید درست آید

دوسری بات مجھے اس تاریخی فیصلہ کے متعلق عرض کرنی ہے جس کا ایک آرڈیننس کے ذریعہ تعزیراتِ پاکستان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ دراصل ایک نیچرل اور منطقی قدم ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے متعلق جو شق شامل کی گئی تھی، اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ایسا قدم فوراً ہی اٹھا لیا جاتا لیکن سابقہ حکومت میں اس طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ موجودہ حکومت کو بھی یہ فیصلہ کرنے میں بہت وقت لگا ہے۔ سات سال گزر گئے تب یہ قدم اٹھایا گیا ہے لیکن بہر حال اسے دیر آید درست آید کہہ لیں یا better late than never۔ یہ بہت مستحسن قدم ہے۔ کافی عرصے سے واقعتاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قادیانیوں کا رویہ پھر شدید جارحانہ ہو گیا ہے اور بڑے شدّومد کے ساتھ ان کی تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہاں آتے وقت ایک صاحب نے ان کا ایک

کتابچہ مجھے دیا، جس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اخبارات کے ساتھ وہ بڑے پیمانے پر تقسیم ہوا ہے۔ ان کی جرأتیں بڑھتی چلی جارہی تھیں، جن کی وجہ سے افواہوں کی شکل میں عوام میں یہ بدگمانی بھی پھیل گئی تھی کہ صدر ضیاء الحق صاحب قادیانی ہیں۔ بڑے بڑے جرنیلوں کے متعلق کہا گیا کہ وہ قادیانی ہیں۔ مَیں نے کبھی اس قسم کی باتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ ایسی باتیں اڑادی جاتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ تاثر قادیانیوں ہی کی طرف سے دیا گیا ہو۔ الحمد للہ جو فیصلہ ہوا ہے، بہت عمدہ ہوا ہے، مستحسن ہوا ہے۔ اس نے تمام بدگمانیوں کو ختم کر دیا ہے اور توقع یہی ہے کہ اب اس پر پوری طرح عمل درآمد بھی ہوگا۔ اس صحیح اقدام اور فیصلہ پر مَیں صدر ضیاء الحق صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔

تکفیر کی وجوہات

مَیں یہ عرض کروں گا کہ یہ سارا معاملہ ہمارے لیے خوشی کا موجب نہیں ہے۔ قادیانی بہرحال ہمارے ہی جسد کا ایک ٹکڑا تھے۔ ان کو بہت ہی مجبوری اور خود ان کی اپنی ضلالت، سرکشی و بے باکی کی وجہ سے کاٹا گیا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی پوری تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ ''تکفیر'' پر کبھی خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ کسی شخص یا گروہ کا تعلق اُمت سے منقطع کر دیا جائے۔ ہمارے یہاں تو امام غزالی ؒ کی ایک بات بہت معروف ہے کہ اگر کسی شخص میں تین پہلو کفر کے نظر آئیں لیکن ایک پہلو اسلام کا نظر آئے تب بھی اسلام والے پہلو کو سامنے رکھیے اور تکفیر کی طرف مت جایئے۔ ویسے خود قادیانیوں نے اور ان کے زیر اثر بعض لوگوں نے جن میں ہمارے ایک چیف جسٹس صاحب بھی تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں، یہ بہانہ بنایا کہ مسلمان تو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہی رہتے ہیں۔ بریلویوں نے دیوبندیوں اور اہلِ حدیث کو کافر کہا جبکہ انہوں نے بریلویوں کو کافر کہا۔ حنفی اہلِ حدیث کو کافر کہتے ہیں اور اہلِ حدیث حنفیوں کو۔ یہ شاذ باتیں ہوتی ہیں کہ کوئی شخص جوشِ خطابت میں آکر یا تعصب سے مغلوب ہو کر ایسی بات کہہ دے۔ مسلمانوں نے بحیثیت اُمت ان باتوں کو کبھی seriously نہیں لیا ہے۔ مناظرانہ انداز اور مخالفانہ جوش میں عام قسم کے واعظین ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں اور عوام کا ایک گروہ بھی اس سے کسی درجہ میں متاثر ہو

جاتا ہے' لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ امت نے باقاعدہ قانونی اور عدالتی انداز میں کسی فردِ واحد کی نہیں بلکہ ایک پورے گروہ کی تکفیر کر کے اس کا تعلق اُمت سے منقطع کر دیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے دوسرے گروہ موجود ہیں کہ اگر ان کے اعتقادات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کو کسی طور پر بھی مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا' لیکن چونکہ تکفیر سے مسلمانوں کو دلچسپی نہیں اس لیے عموماً ایسے گروہوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جارحیت اختیار نہیں کی اور اپنے گروہ کے معتقدات کی تبلیغ سے گریز کیا ہے۔ میں برملا کہتا ہوں کہ اگر اسماعیلی فرقے کے اعتقادات کا جائزہ لیا جائے تو کسی طرح بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہو گا کہ انہیں مسلمان شمار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ چونکہ وہ علیحدہ سا ایک طبقہ ہیں جس نے ایک کمیونٹی کی صورت اختیار کر لی ہے' وہ اپنے اعتقادات کی تبلیغ نہیں کرتے' دوسروں پر تنقید نہیں کرتے' ان میں جارحیت نہیں ہے' وہ سوشل کاموں میں مگن ہیں' لہٰذا مسلمانوں نے ان کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔

قادیانیوں کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ پہلی اور اہم ترین بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سوا سب مسلمانوں کو کافر ٹھہرایا۔ پہلے انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر کی ہے۔ انہوں نے قرار دیا کہ جو غلام احمد کو نبی نہیں مانتا وہ کافر ہے۔ یہ بالکل منطقی نتیجہ ہے دعویٰ نبوت کا! نبوت تو اس دنیا میں اللہ کی عدالت ہوتی ہے۔ یہ شے قاطع ہے۔ یہ علیحدہ کر دیتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ یہودیوں اور ہمارے مابین فرق کیا ہے؟ اللہ کے دو نبی ایسے ہیں جن کو وہ نہیں مانتے' باقی سب کو تو مانتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ دو نبیوں کے انکار کی وجہ سے من دیگرم تو دیگری۔ ہم اور ہو گئے' وہ اور ہو گئے۔ اسی طرح عیسائیوں کا معاملہ ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے' حضرت مسیح کو مانتے ہیں۔ وہ غلو کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں' انکار تو نہیں کرتے۔ انکار صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے ہیں۔ لہٰذا یقیناً ہمارے نزدیک وہ کافر اور ہم حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے باوجود ان کے نزدیک کافر۔ معلوم ہوا کہ نبوت کا دعویٰ یقیناً تقسیم کر دینے والا اور علیحدہ کر دینے والا ہے۔ لہٰذا اپنے سوا تمام دنیا کے مسلمانوں کی تکفیر کے

process کا آغاز انہوں نے کیا۔ ہم نے بہت عرصہ صبر کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو جو غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتے' ایسی ایسی گالیاں دی ہیں اور مسلمان عورتوں کے متعلق ایسی رکیک اور بے ہودہ زبان استعمال کی ہے کہ مَیں نہیں چاہتا کہ ان کو سنا کر اپنی زبان کو ناپاک کروں۔

سب جانتے ہیں کہ قائداعظم نے سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو کس طرح اٹھایا' اُبھارا اور کتنے بڑے مقام تک پہنچایا۔ ذاتی طور پر وہ کتنے بڑے محسن تھے ظفر اللہ خاں کے لیکن اس شخص نے جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ یا تو وہ اُس وقت وہاں موجود نہ ہوتا' کہیں باہر چلا جاتا لیکن قائداعظم کے جنازے کی نماز تک موجود رہا لیکن اس میں شرکت نہیں کی۔ اخبار والوں کے استفسار پر اس نے برملا یہ کہا: ''آپ چاہیں تو ایک کافر حکومت کا مجھے مسلمان وزیر سمجھ لیں اور چاہیں تو ایک مسلمان حکومت کا کافر وزیر سمجھ لیں۔'' چنانچہ یہ کام شروع انہوں نے کیا۔ مسلمان کے ساتھ تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' والا معاملہ ہوا ہے۔ ایک تو انہوں نے نبوت کی بنیاد پر اپنی علیحدہ ایک امت بنالی جو بہت منظم اور مضبوط ہوگئی۔ اس لیے کہ نبوت کی بنیاد پر جو گروہ اٹھے گا' اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کس کی ہوگی! کوئی جماعت اتنی مضبوط نہیں ہوسکتی جتنی نبی کی جماعت ہوتی ہے۔ کسی دوسری جماعت کے سربراہ سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ کیا نبی سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے؟ نبی سے اختلاف کرتے ہیں تو ایمان کے لالے پڑتے ہیں۔

دوسری طرف مرزا غلام احمد نے انگریزی حکومت کی چاپلوسی' کاسہ گدائی اور اپنی جماعت کی وفاداریوں کی یقین دہانی کرا کے اس کی سرپرستی حاصل کرلی۔ انگریز کا اصول ہی یہ تھا کہ divide and rule۔ اسے مسلمانوں کے اندر افتراق پیدا کرنے اور ان کی اجتماعی قوت کو منتشر کرنے کے لیے ایک مہرہ مل گیا جسے انہوں نے اپنی بساطِ سیاست پر خوب استعمال کیا اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

پھر یہ کہ قادیانیوں کی جسارت اتنی بڑھی کہ انہوں نے دینی اصطلاحات کے ساتھ دھڑلے سے وہ اصطلاحات بھی استعمال کیں جو نبیؐ' ان کے اہل بیت اور حواریین کے

ساتھ مختص تھیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کے نام سے موسوم کیا۔ اذان کا طریقہ وہی رکھا جو مسلمانوں میں رائج ہے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کا راستہ نکالا۔ عام لوگوں کو ان چیزوں کی خبر نہیں ہے۔ رفع اور نزولِ مسیح کے متعلق انہیں صحیح دینی معلومات نہیں ہیں۔ اتمام واکمال نبوت کے مسائل سے ان کو صحیح واقفیت نہیں ہے۔ قادیانیوں نے یہ چند مسائل پکڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں میں نفوذ کر رہے تھے۔ اندر ہی اندر وہ ہمارے جسدِ ملی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے' اس لیے مجبوراً مسلمان اٹھ کھڑا ہوا اور ۱۹۵۳ء میں ایک عظیم تحریک ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے چلی۔

تحریک تحفظ ختم نبوت

وہ دور ہماری تاریخ کے بدنما داغوں میں سے ایک داغ ہے۔ یہی ہمارا شہر لاہور اس وقت بدترین مارشل لاء کی گرفت میں تھا اور یہاں خوں ریزی ہوئی تھی۔ ہمارے ایک جرنیل صاحب نے مسجد وزیر خاں کو اس طرح فتح کیا تھا جیسے ایک بیرونی حملہ آور کسی شہر کو فتح کرتا ہے۔ یہ سانحہ ہم میں سے اکثر کو یاد ہوگا۔ ہماری تاریخ کا یہ ایک تاریک اور افسوس ناک باب ہے۔ بہر حال اس وقت کی قربانی رائیگاں نہیں گئی اگرچہ اس کے بعد بیس برس بیت گئے۔

بحمد اللہ ۱۹۷۴ء میں جو تحریک اٹھی تھی' وہ خالص غیر سیاسی تھی۔ اس کے سربراہ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک جید اور مشہور و معروف عالم دین تھے۔ یہی چیز اس تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ پھر یہ کام اس شخص کے دورِ اقتدار میں ہوا جس کا اس وقت نام لینا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بھٹو میں جو کچھ خرابیاں تھیں' وہ تھیں لیکن اس نے جو چند اچھے کام کیے تھے ان کا کریڈٹ بہر حال اسے دیا جانا چاہیے۔ ایک کام اس نے یہ کیا کہ اس ملک کو ایک متفقہ دستور دیا۔ اس معاملہ میں اس نے اپنے اندر کافی لچک پیدا کی۔ دوسری سیاسی پارٹیوں کے نقطۂ نظر کو دستور میں accommodate کیا۔ پھر یہ کہ دستور پر سب جماعتوں کے دستخط لے لیے کہ یہ ہمیں منظور ہے۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تھا' اگرچہ بعد میں اس نے خود یہ کریڈٹ ضائع کر دیا کہ ترمیم در ترمیم کے ذریعہ

سے اسے موم کی ناک بنا دیا۔ دستور کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی دستاویز ہوتی ہے کہ جس میں آسانی سے تبدیلی نہیں کی جا سکتی، تا کہ اس کا تسلسل قومی زندگی میں برقرار رہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو دوسرا کام ہوا تھا وہ اتنے صحیح نہج پر ہوا تھا کہ دنیا کا کوئی شخص اس پر انگلی نہیں رکھ سکا حالانکہ برطانیہ ہو، امریکہ ہو اور دوسری بڑی طاقتیں ہوں وہ سب ان کی پشت پناہ ہیں۔ تمام ان کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہیں۔ دنیا کا عام طور پر سیکولر ذہن ہے۔ یہ ذہن مذہب کی بنیاد پر تفریق قبول نہیں کرتا لیکن یہاں ایسا ہوا اور عہد جدید کے ذہن کے خلاف ہم نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ قادیانیوں کی برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا جو معاملہ رہا ہے اس کا کوئی بدلہ وہ چکانا چاہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی خاص ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں لیکن جس پروسس کے تحت یہ کام ہوا تھا اس پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ ملک کے منتخب اور با اختیار ادارے یعنی نیشنل اسمبلی نے اس کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی نے پہلے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس نے قادیانیوں کو بھرپور موقع دیا کہ آؤ اور اپنی صفائی پیش کرو۔ تمہارے لٹریچر سے جو اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بے شمار دعوے کیے تھے اور اس کا آخری دعویٰ نبوت کا دعویٰ تھا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو اپنی صفائی پیش کرو۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے جا کر اپنی صفائی بھی پیش کی۔ چنانچہ بالکل عدالتی عمل کے مطابق اور اس کے نہج پر تمام findings کی گئیں۔ پھر فیصلہ نہ کسی فرد واحد کا ہوا اور نہ ہی اس کمیٹی نے کیا بلکہ اس نے اپنے نتائج اور سفارشات مرتب کر کے ملک کے با اختیار ادارے میں پیش کیں اور یہ اس کا فیصلہ تھا۔

آرڈیننس کی ضرورت

یہ ایک بہت اچھا کام تھا جو اُس وقت ہو گیا۔ اس کے بعد اس فیصلہ کے مقتضیات پر عمل درآمد کا مرحلہ تھا، لیکن اس پر کچھ بھی کام نہیں ہوا۔ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے، اور دھڑلے سے کہتے رہے۔ ان کی عبادت گاہ مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ ایک

عام مسلمان دھوکا کھا جائے گا اور وہاں نماز ادا کرنے داخل ہو جائے گا۔ وہاں اس کو کوئی ایسی dose پلائی جائے گی' ایسی تبلیغ کر دی جائے گی یا دنیوی ترقی کا سبز باغ دکھایا جائے گا کہ وہ بہک جائے۔ اس بات پر سپریم کورٹ میں مقدمہ بھی چلتا رہا ہے کہ قادیانیوں کو روکا جائے کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہ کہیں۔ اب تو اس سے بھی آگے کی بات طے کر دی گئی ہے کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد کی شکل دینے کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ وہ کسی اور طرز کی عمارت بنانا چاہیں تو بنائیں۔ لاہور میں گڑھی شاہو میں ان کی ایک مسجد ہے۔ اس کی وضع اور ساخت بالکل مسجد کے مطابق ہے لیکن وہ اسے مسجد نہیں کہتے۔ اس کا نام انہوں نے ''دارالذکر'' رکھا ہوا ہے۔ وہ جو چاہیں نام اختیار کر لیں لیکن اس کی شکل مسجد کی نہ رکھیں اور اسلامی اصطلاحات قطعی استعمال نہ کریں۔ بہر حال ایک minority کی حیثیت سے ان کو تمام حقوق حاصل ہیں اور حاصل رہیں گے' جیسے ہمارے یہاں عیسائی اور دوسری مذہبی اقلیتوں کو حقوق دیے گئے ہیں۔

وہ اسلام کی چادر اور اس کے لبادے میں خود کو چھپا کر مسلم معاشرے میں جو زہر گھول رہے تھے اور انہوں نے جارحیت کا جو انداز اختیار کیا ہوا تھا' اس کا راستہ صدر صاحب کے جاری کردہ آرڈیننس کے ذریعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ رک جائے گا۔ میں اس اقدام پر صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں اور ان علماء کرام کی خدمت میں بھی ہدیۃً تبریک و تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں محنتیں کی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل سے تحفظ ختم نبوت کی مجلس عمل کافی فعال و متحرک ہو گئی ہے۔ ملک کے بہت سے ممتاز شہروں میں نہایت کامیاب ختم نبوت کانفرنسیں منعقد ہوئیں جبکہ اسلام آباد' راولپنڈی میں آج ہونے والی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ حرکت اسی کی برکت ہے جو ظاہر ہوئی ہے۔ اس کا کریڈٹ بھی حکومت کو دینا چاہیے کہ صورت حال بگڑنے دینے کے بجائے اس نے اس کا بروقت اندازہ کر لیا اور صحیح قدم اٹھا کر ان مطالبات کو جو علماء کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے' بڑی حد تک تسلیم کر لیا۔ میں پھر ایک بار ان علماء کرام اور تنظیموں کو مبارک باد دیتا ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں محنتیں کیں اور اس میں حصہ لیا

ہے۔ہم ان کے احسان مند ہیں۔ان سب کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔حکومت بالخصوص صدر مملکت کا بھی ہم شکریہ ادا کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ اس آرڈیننس کے تمام مقتضیات پر صحیح طور پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے گا۔یہ اندیشہ بہر حال موجود ہے کہ بیوروکریسی پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ اس کے نفاذ میں ڈھیل دے' اسے ignore کرے اور یہ آرڈیننس صرف تعزیرات ہی میں درج ہو کر رہ جائے۔اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو کیا عجب ہے کہ مواد پھر اندر ہی اندر پکے اور دوبارہ دھماکے کی صورت اختیار کر لے۔ اس قسم کا کوئی دھماکا بھی اس وقت پاکستان کے لیے انتہائی مہلک ہوگا' اور نہیں کہا جا سکتا کہ کون کس وقت اس دھماکے سے فائدہ اٹھا لے۔لہٰذا ہر نوع کی دھماکا خیز situation سے بچ کر رہنے ہی میں پاکستان کی عافیت ہے۔

***

اسلام آ رہا ہے! کیا واقعی؟

* خطابِ جمعہ، مسجد دارالسلام، لاہور (۱۷ اگست ۱۹۸۴ء)
* ''میثاق'' اکتوبر ۱۹۸۴ء

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، خُصُوْصًا عَلٰی اَفْضَلِهِمْ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدِ الْاَمِیْنِ وَعَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ
فَقَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فِیْ سُوْرَةِ الْحَجِّ :

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ صدق اللّٰه العظیم ۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ:
بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا، وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (متفق علیه)

وطنِ عزیز میں انتالیس دن کے بعد جو واپسی ہوئی تو حسنِ اتفاق سے اگلا ہی دن ''یومِ استقلال'' یا جدید اصطلاح میں ''عیدِ استقلال'' تھا۔ جب لاہور کی سڑکوں پر کچھ آنا

جانا ہوا تو بعض بالکل نئی چیزیں مشاہدے میں آئیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوران میں اقامتِ صلوٰۃ کا ایک نظام بھی موجودہ حکومت کی طرف سے بڑے زور شور، بڑے اہتمام، بڑی تشہیر اور بڑے دعاوی کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔ اس سے یقیناً عوام میں بھی ایک خوش گوار ردِّعمل ہے۔ مَیں نے آغاز میں سورۃ الحج کی آیات ۳۹، ۴۰ اور ۴۱ تلاوت کی ہیں، ان میں سے آیت ۴۱ کا اس وقت بہت چرچا ہے۔ یہ آیت کریمہ لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہے اور زبانوں پر بھی۔ پھر مضامین میں، بیانات میں، اور ٹی وی پر اس کا کافی تذکرہ ہو رہا ہے۔ حالیہ مشاہدات اور حاصل شدہ معلومات کے ضمن میں بعض باتیں ایسی ہیں جو دین کے اس فہم و شعور کے نتیجے میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمایا ہے، میرے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ اگر میں اس وقت ان باتوں کو بیان نہ کروں تو وہ کتمانِ حق ہوگا۔ لہٰذا مَیں اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں کہ ان کو بلاخوفِ لومتِ لائم آپ کے سامنے رکھ دوں۔

عیدین: قومی یا مذہبی؟

ہمارے یہاں عیدِ استقلال کو جس شان و شوکت، کرّوفر اور اسراف و تبذیر کے ساتھ منایا جا رہا ہے یہ دینی اعتبار سے کسی بھی دلیل سے معروفات کی فہرست میں یقیناً نہیں آتا بلکہ اس کا شمار منکرات میں ہوتا ہے۔ اوّل تو اس کے لیے لفظ ''عید'' کا استعمال ہی انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ ہمارے دین میں صرف دو ہی عیدیں ہیں جو ہمیں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے عنایت ہوئی ہیں۔ ایک عید الفطر ہے اور دوسری عید الاضحیٰ ہے۔ ان کے علاوہ کسی بھی تیسرے یا چوتھے دن کے لیے لفظ عید کا استعمال دینی اعتبار سے یقیناً محلِ نظر ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ہمیں قادیانیوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ اسلامی شعائر کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جب کہ ان کو یہ حق قطعی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر جدید قسم کی قومی تقریبات آپ منانا بھی چاہیں تو ان کو دینی اصطلاحات کا جامہ پہنانا یقیناً اُسی قبیل کی ایک شے ہے۔

اس میں جو اسراف و تبذیر کا معاملہ ہو رہا ہے، کروڑہا روپیہ جس طرح صَرف ہو رہا ہے، مَیں اُسے بھی دینی لحاظ سے صحیح نہیں سمجھتا۔ تحریکِ پاکستان کے فلسفے اور اُس کے

مقاصد کو لوگوں کے ذہن میں اُتارنا اور اس کا شعور اُجاگر کرنا یقیناً ایک بہت بڑی قومی ضرورت ہے۔ پوری قوم بالخصوص ہماری نوجوان نسل کو اس بات کا علم اور شعور حاصل ہونا چاہیے اور اس کا بار بار اعادہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا! اس کی منزل کیا تھی! وہ منزل تا حال آئی ہے یا نہیں! ہم سینتیس برس کے بعد بھی اس منزل تک پہنچ پائے ہیں، یا تا ہنوز تلاشِ منزل میں سرگرداں ہیں! یہ مسائل اپنی جگہ غور طلب بھی ہیں اور جواب طلب بھی۔ اس ملک کے قیام کے جو مقاصد تھے' تحریک پاکستان کے جو عوامل تھے' اس کا جو پس منظر تھا' اس میں جن شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیا' ان سے پوری قوم کو بالعموم اور نوجوان نسل کو بالخصوص واقف کرانا ایک مستحسن کام ہے' جس کی بڑی ضرورت بھی ہے۔ البتہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کے لیے طریقہ کون سا اختیار کیا جائے!

مثبت طریق تو یہ ہوگا کہ ہم اس منزل کی طرف صحیح خطوط پر پیش قدمی اور پیش رفت کریں جس تک پہنچنے کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا۔ یہی چیز دراصل مستحکم اساس بنتی ہے۔ اگر ہمیں یہ دن قومی تاریخ کے اعتبار سے منانا ہی ہو تو آن بان' شان شوکت' آرائش وزیبائش اور جلوسوں کے بجائے ملک بھر میں جلسے ہوں اور ان میں تقاریر ہوں' مقالے پڑھے جائیں۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوں۔ ٹیلیویژن اور ریڈیو پر تحریکِ پاکستان کے پس منظر اور پاکستان کے قیام کے مقصد کو مؤثر طریقوں سے اُجاگر کیا جائے۔ ثالثاً ہمارے نصابِ تعلیم میں مسلم انڈیا اور خاص طور پر تحریکِ پاکستان کی مستند تاریخ کو مستقلاً شامل کیا جائے۔ یہ وہ طریقے ہیں جو مفید بھی ہیں اور مستحسن بھی۔ ان کی ہر اعتبار سے شدید ضرورت ہے۔ چند سالوں سے یومِ استقلال کو جس انداز سے ایک جشن اور تہوار کی صورت میں منایا جا رہا ہے وہ صحیح و مؤثر طریق کار نہیں ہے۔ اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ قوم کے لیے یہ کھیل تماشوں اور تفریح کا ایک دن بن کر رہ گیا ہے۔ موجودہ طریق دینی اعتبار سے بدعات اور اسراف و تبذیر کے ذیل میں آتا ہے جبکہ قومی اعتبار سے بھی یہ مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے۔ ایک طرف ہر سال کروڑوں روپے آرائش وزیبائش' محراب سازی' جلوسوں اور اسی نوعیت کے کاموں کی نذر ہوتے

ہیں' جو میرے نزدیک قومی سرمایہ کا ضیاع ہے۔ دوسری طرف قوم اسے ایک قومی تہوار کی طرح محض تفریحاً منانے کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔

پھر ایک حد درجہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ اس یوم استقلال کو چند سالوں سے ''عید'' کی خالص دینی اصطلاح سے موسوم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے دین نے عید کا جو تصور دیا ہے اس میں جو وقار ہے' دین داری اور خدا پرستی کا جو مظاہرہ ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں نظر نہیں آتا۔ ہماری دونوں عیدیں کیا ہیں! یہ کہ عید گاہ کی طرف تکبیرات پڑھتے ہوئے جاؤ' واپسی میں راستہ بدلو اور پھر یہی ترانہ تمہاری زبانوں پر جاری ہو۔ یہ تکبیرات بھی وہ ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی' اس کی توحید اور اس کی حمد کا عوامی سطح پر اعلان و اقرار ہے۔ ((اللّٰہ اکبر' اللّٰہ اکبر' لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر' اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد اور اللّٰہ اکبر' اللّٰہ اکبر کبیرًا' وَالحمد للّٰہ کثیرًا' وَسُبحان اللّٰہ بُکرۃً واصیلًا)) پھر ان عیدین کے لیے تاکید ہے کہ صبح غسل کر کے اچھا لباس پہنو' خوشبو لگاؤ' طلوع آفتاب کے بعد ایک جگہ جمع ہو' امام کی اقتدا میں دوگانہ شکرانے کی نماز باجماعت ادا کرو۔ امام بحیثیت نائب رسول کھڑا ہو' خطبہ دے جس میں شرکاء کے لیے تذکیر ہو' موعظہ ہو' نصیحت ہو۔ یہ ہے ہماری عیدین کا معاملہ جو ہمارے دین نے ہمیں تلقین فرمایا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہجرت کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں قدیم زمانے سے دو سالانہ جشنوں کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ ان میں لوگ طرح طرح کے کھیل تماشوں کا سامان کرتے اور لہو و لعب میں مشغول رہتے۔ دریافت فرمانے پر بتایا گیا کہ یہ ہمارے سالانہ تہوار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے ربّ نے مسلمانوں کے لیے دو سالانہ عیدیں عطا فرمائی ہیں' جو تمہارے تہواروں سے کہیں بہتر ہیں۔ ایک عید الفطر ہے جو روزوں کو پورا کرنے کا شکرانہ ہے' اور دوسری عید الاضحیٰ جس کا تعلق حج اور قربانی سے ہے۔ جس شان سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے' آپؐ کے اصحابؓ نے اور آپؐ کے خلفاء راشدینؓ نے ان عیدین کو منایا وہ درحقیقت ہمارے لیے قابلِ تقلید ہی نہیں واجب التقلید ہے۔

اس کے برعکس دوسری قومیں جس طریقے پر اپنے مذہبی جشنوں اور قومی تہواروں کو مناتی ہیں' ان میں خدا پرستی اور وقار ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا بلکہ یہ سرتا سر لہو ولعب کا مظہر ہوتے ہیں۔ ہر انصاف پسند آنکھ یہ دیکھ سکتی ہے کہ ہم نے جو نئی عیدیں منانے کا ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ دوسری قوموں کے جشنوں اور تہواروں سے بہت مماثل ہوتا جارہا ہے۔ دینی مزاج رکھنے والا ہر شخص ان نئی عیدوں کے متعلق خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ ہماری قوم ان کو منانے کا جو رنگ اور طور طریقے اختیار کرتی چلی جارہی ہے' آیا وہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے نقشِ قدم پر ہے یا اغیار کی تقلید ہے! قرآن مجید میں آلِ فرعون کے ایک تہوار کے لیے یوم الزینۃ کا لفظ آیا ہے جس کا سورۃ طٰہٰ میں ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون کے دربار میں تشریف لاکر توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے دعوت ردّ کردی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت کے ثبوت کے طور پر دو معجزے بھی پیش کیے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو عطا فرمائے تھے' یعنی عصا اور ید بیضاء۔ ان کو دیکھ کر فرعون کو اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہ سوجھی کہ ملک کے تمام نامی گرامی جادوگروں کو بلا کر ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرایا جائے تاکہ موجودہ صورتِ حال سے کسی طور گلو خلاصی ہو سکے۔ لہٰذا فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ کوئی دن مقرر کرو کہ جس روز ہمارے جادوگر تمہارا مقابلہ کرسکیں۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا:

﴿مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝٥٩﴾ (طٰہٰ) ''تمہارے ساتھ یَوْمُ الزِّیْنَۃِ طے ہوا' اور یہ کہ دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔'' یہ ان کا کوئی بناؤ سنگھار' اپنی زینت' آرائش وزیبائش کے اظہار اور اپنے رعب اور دبدبے کے مظاہرہ کا دن تھا جس کو وہ جشن کے طور پر مناتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے وہ دن مقرر فرمایا تاکہ مقابلہ علیٰ رؤس الاشہاد ہو۔ خلقِ خدا دیکھے کہ معاملہ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزات کی شان کیا ہے اور جادوگروں کے جادو کی حقیقت کیا ہے!

اپنے قومی جشن کے طور طریقے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم یَوْمُ الزِّیْنَۃِ کی طرز پر آگے بڑھ رہے ہیں نہ کہ ان عیدین کے طور پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھیں۔

یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ دو عیدیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے عطا فرمائی تھیں، وہ ان نئی عیدین کے مقابلے میں پس منظر میں جا رہی ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ قوم کی اکثریت کا لگاؤ اُن عیدوں سے برائے نام رہ گیا ہے، اصل تعلق ان نئی عیدوں سے ہے۔ اس بات سے وہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جہاں بھی کوئی بدعت آئے گی وہاں لامحالہ سُنّت پیچھے ہٹے گی۔ یہ قانون ہے کہ اگر آپ دینی و قومی اعتبار سے کوئی نئی رسم ایجاد کریں گے تو دین کا کوئی نہ کوئی حقیقی شعار یقیناً پس منظر میں چلا جائے گا۔ ہر بدعت، سُنّت کو fade away کرے گی۔ سُنّت کی اہمیت کم ہو جائے گی یا وہ بالکل ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بچائے کہ ہم سُنّت کو بالکل ہی ختم کر دیں! جس رُخ پر ہم بڑھ رہے ہیں، اس کا یہ نتیجہ تو بہرحال آیا ہے کہ وہ اصل عیدیں پس منظر میں چلی گئی ہیں اور جو دو نئی عیدیں ایجاد کی گئی ہیں وہ کافی نمایاں ہو گئی ہیں۔ ان کا جس طور پر حکومتی سطح پر انتظام ہوتا ہے اس سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری طور پر اصل عیدیں یہ دو ہیں یعنی عید میلاد النبیؐ اور عید استقلال۔

سڑکوں پر چند اکابر کی دیوہیکل تصاویر نظر آ رہی ہیں، گویا معروفات کا اضافہ ہے جو اس دور میں ہو رہا ہے۔ تصویر کشی، خاص طور پر جانداروں کی ہاتھ سے بنائی جانے والی تصاویر کے متعلق تمام علماءِ امت کا اتفاق ہے کہ یہ حرام مطلق ہیں۔ جدید ذہن کے علماء، خصوصاً علماءِ عرب کی اکثریت نے اختلاف اگر کیا ہے تو کیمرے سے اُتاری ہوئی تصاویر پر، جو عکس محفوظ کرنے کے ذیل میں آتی ہیں، ہاتھ سے نہیں بنتیں۔ نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہاتھ سے تصاویر اور مجسمے بنانے کا رواج تھا، جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ ان کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے شدید وعید ارشاد فرمائی (1) اور اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا

---

(1) عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ: ((ان اصحاب ھذہ الصور یعذبون یوم القیامة، یقال لھم: احیوا ما خلقتم، وقال: ان البیت الذی فیہ الصورة لا تدخلہ الملائکة)) (متفق علیہ)

"حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جاندار چیزوں کی) تصویریں بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔ ان کو حکم دیا جائے گا کہ بنائی گئی تصویر میں روح پھونک کر اسے زندہ کرو۔ نیز فرمایا: جس گھر میں تصویر ہو وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔"

ہے۔ مجسمہ سازی بھی طبعاً اسی وعید اور حرمت کے دائرے میں آتی ہے۔ البتہ جب کیمرا ایجاد ہوا تو ایک اختلاف ہو گیا۔ پاک و ہند کے علماء کی بڑی اکثریت اس کی قائل رہی ہے' اور اب بھی ہے' کہ کسی جاندار کی کیمرے سے بنائی ہوئی تصویر پر بھی اُسی حکم کا اطلاق ہوگا جو ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر پر ہوتا ہے۔ البتہ اکثر علمائے عرب کی یہ رائے سامنے آئی کہ کیمرے کی تصویر پر ہاتھ سے کسی جاندار کی بنائی جانے والی تصویر کی حرمت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

برصغیر پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے متعلق تو وثوق سے معلوم ہے کہ وہ یہی رائے رکھتے تھے۔ ان کے رسائل ''الہلال'' اور ''البلاغ'' باتصویر ہوتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی رائے بھی یہی تھی' لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ واللہ اعلم! بہرحال ہمارے یہاں بھی ایسے علماء رہے ہیں اور اب بھی موجود ہوں گے جن کی رائے علمائے عرب کے مطابق ہے کہ جانداروں کی ہاتھ سے بنائی جانے والی تصاویر اور مجسموں پر تو حرمت کے اسی حکم کا اطلاق ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے لیکن کیمرے کی تصاویر اس حکم کی زد میں نہیں آتیں۔ یہ مختلف شے ہے۔ ہمارے جو علماء کیمرے کی تصاویر کی حرمت کے قائل ہیں' انہوں نے بھی اس کی وہاں تک تو اجازت دی ہے جہاں کوئی حقیقی تمدنی ضرورت ہو۔ جیسے شناختی کارڈ کا معاملہ ہے' پاسپورٹ کا معاملہ ہے' مجرموں کی تصاویر کا معاملہ ہے' طبی ضروریات کا معاملہ ہے۔ الغرض جہاں بھی ناگزیر تمدنی ضرورت ہو تو اس کے استعمال کو بکراہت قبول کیا جا سکتا ہے۔

تصویر کشی اور اس کی حرمت و ممانعت میں جو اصل علّت اور حکمت ہے' وہ شخصیت پرستی کے سدِّ باب کی ہے۔ یہی تصویریں ہیں جو بعد میں معبود بنتی رہی ہیں اور ان کو پوجا گیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں جس پیمانے اور جس انداز سے یہ کام کیا جا رہا ہے اس میں اس علت و غایت کے ظہور کا شدید احتمال موجود ہے۔ یہ اُن شخصیتوں کی تصاویر ہیں جن کے متعلق ہمارا یہ تصور ہے' جسے مزید پختہ کیا جا رہا ہے' کہ وہ ہمارے محسن ہیں۔ ہماری

تاریخ کی عظیم ترین شخصیتیں ہیں۔ ہماری قومی تحریک کے عظیم عمائد ہیں۔ لہٰذا ان حضرات سے ہمارا ایک ربطِ قلبی ہونا چاہیے‘ ان سے محبت اور عقیدت ہونی چاہیے۔ یہی تو وہ اصل علت ہے کہ جب اس میں غلو ہوتا ہے تو ان بزرگوں کو معبود کے درجے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے شریعت میں تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے‘ لیکن ہمارے یہاں اسی میں غلو پیدا کرنے کی یہ تمام و کمال کوشش کی جا رہی ہے۔ اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دور میں دین کے تصورات میں جو اضافے ہو رہے ہیں‘ شاید ان ہی معروفات کی فہرست میں یہ چیز بھی شامل کر لی گئی ہے۔ ابھی تک معاملہ یہ تھا کہ نوٹوں پر قائداعظم کی تصویر چل رہی ہے۔ بڑے سرکاری دفاتر اور ایوانوں میں قائداعظم مرحوم کی خصوصاً اور علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی عموماً قد آور یا اوپر کے جسم کی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر مستقل طور پر آویزاں رہتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایوب خاں صاحب اور بھٹو صاحب کی تصاویر ان کے دورِ اقتدار میں لگائی جاتی رہی ہوں اور اب موجودہ صاحبِ اقتدار کی تصاویر آویزاں ہوں۔ بہرحال کچھ عرصہ پہلے تک یہ معاملہ زیادہ تر بڑے بڑے سرکاری دفتروں اور حکومت کے ایوانوں تک محدود تھا لیکن اب ان اکابر کی تصاویر کو جس انداز‘ شان اور آن بان کے ساتھ سڑکوں پر نصب کیا گیا ہے اس سے تو اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ معروفات کے بجائے دینی اعتبار سے منکرات کی طرف ارتقا کر رہا ہے۔ اس کی پیش قدمی قطعی مخالف سمت میں ہو رہی ہے۔

یہ کیمرے سے کھینچی گئی تصاویر نہیں ہیں بلکہ ہاتھوں سے بنائی ہوئی ہیں اور پورے عالم اسلام کے علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ آج کل سورۃ الحج کی اکتالیسویں آیت کا بڑا چرچا ہے‘ جس میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ﴾ اس حوالے سے آخری دو احکام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف یہ کہ نظر انداز اور پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں بلکہ ان کے برعکس کام ہو رہا ہے۔ معروفات کو دبایا جبکہ منکرات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

مارشل لاء اور ملکی سلامتی

حالاتِ حاضرہ کے متعلق چند دوسری باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں معروف معنوں میں ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ کبھی کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ اب بھی میرا declared فیصلہ ہے کہ آئندہ بھی کبھی کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری چند priorities ہیں۔ چند کاموں کو میرے نزدیک اوّلیت و اقدمیت حاصل ہے۔ میری ترجیحات میں مقدم ترین قرآن مجید کے اس فرمان کی تعمیل میں کہ ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹) صرف اور صرف اللہ کا دین اسلام ہے۔ باقی ساری چیزیں اور سارے کام اس کے تابع ہیں۔ مَیں نے دین کی خدمت کے لیے جس طریق کار کو قرآن وسُنّت سے اخذ کیا ہے' اُسی پر عمل پیرا ہوں۔ اسی کام میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ لگا چکا اور جو باقی ہے' وہ اِسی میں لگا رہا ہوں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ مجھے اسی کام میں اپنی توانائیوں کو لگانے کی مزید توفیق عطا فرمائے اور مَیں اسی حالت میں آخرت کے لیے رختِ سفر باندھوں!

میری یہ رائے ہے کہ مارشل لاء کا اتنا طویل عرصے تک تسلسل ہمارے ملک کی سالمیت اور اس کی یکجہتی' اتحاد' سلامتی کے لیے نہایت مضر اور خطرناک ہے۔ اس سے دنیا کو یہ پیغام جائے گا کہ ہماری قوم واقعتاً سیاسی اعتبار سے تاحال نابالغ ہے اور اس میں سیاسی شعور موجود نہیں۔ اس قوم میں جمہوریت کی نہ قدر ہے اور نہ اس کے چلانے کی صلاحیت۔ ہماری سیاسی جماعتوں نے بھی اسی خیال کو تقویت دینے کے لیے کئی بار اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اسی کے نتیجے میں فوج کو بار بار یہ موقع ملا ہے کہ وہ اس میدان میں قدم رکھے اور اقتدار کی باگ ڈور سنبھالے۔ آخر ہندوستان میں فوج کو آج تک اس کی جرأت کیوں نہیں ہوئی! آخر کچھ سبب تو ہے! دونوں ملک بیک وقت آزاد وخود مختار ممالک کی فہرست میں شامل ہوئے تھے لیکن ہم نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح ایک نابالغ یتیم کو سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جو مارشل لاء نوے دن کے

وعدے پر لگایا گیا تھا' اب ۶ جولائی ۱۹۸۴ء کو اس کا آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے۔ ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ مارشل لاء خود ہٹ جائے۔ اگر اسے ہٹانے کے لیے کوئی تحریک چلی تو اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ ایک خرابی ختم ہو گی تو اس کی جگہ کوئی دوسری خرابی آ جائے گی۔ اس لیے موجودہ مارشل لاء کو جلد از جلد صحیح خطوط پر سیاسی عمل جاری کرانا چاہیے۔

جو جماعت مَیں نے قائم کی ہے' اس کا طے شدہ فیصلہ ہے کہ انتخاب کی طرف ہمیں کبھی نہیں جانا۔ زیادہ سے زیادہ ہم انتخاب میں ووٹ دے سکتے ہیں' وہ بھی دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ جس کو ووٹ دیا جائے وہ ہمارے علم کی حد تک پابند شریعت ہو' اس لیے کہ جو شخص اللہ کے قانون کا پابند نہیں اس سے ہم کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس ملک کے لیے کوئی بھلا کام کرے گا۔ جو اللہ کا وفادار نہ ہو' وہ اس ملک کا کیسے وفادار ہو گا! ہم نے ایک اضافی شرط یہ بھی لگائی ہے کہ وہ شخص کسی ایسی پارٹی سے بھی تعلق نہ رکھتا ہو جس کے منشور میں کوئی بات خلافِ شریعت ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص خود تو پابندِ شریعت ہوتا ہے لیکن اپنی سادہ لوحی کے باعث یا کسی اور سبب سے کسی ایسی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے جس کے منشور میں کوئی نہ کوئی شق اسلام کے خلاف ہوتی ہے۔ جہاں یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو ہم اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنا ووٹ استعمال کریں گے۔ اگر یہ شرطیں پوری نہیں ہوتیں تو ہم کم سے کم یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کسی بھی ایسے شخص کے حق میں رائے دی جائے اور اسے ملک کے معاملات میں دخیل ہونے کا حق دار سمجھا جائے درآں حالیکہ وہ خود اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا پابند نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہم غیر سیاسی لوگ ہیں' مَیں خود ذاتی طور پر اور وہ تنظیم بھی جو مَیں نے قائم کی ہے۔ ہمارا تو ایک ہی طریقِ کار ہے' جو میرے نزدیک سُنّت اور سیرتِ رسول ﷺ سے ماخوذ ہے۔ اُسی پر عمل پیرا ہو کر اور کاربند رہ کر ایک اسلامی انقلاب کے لیے جو بھی ابتدائی اور تمہیدی اقدامات ہیں' ان کے لیے مَیں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو کھپا دیا ہے اور کھپائے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہم لوگ اندھے بہرے نہیں ہیں کہ دیکھ اور سن نہ رہے ہوں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور اس کے بارے میں ہماری کوئی رائے نہ ہو۔ آج سے لگ بھگ پونے دو سال قبل ایک خط میں نے صدر مملکت کو لکھا تھا۔ ابتداءً وہ کھلا خط نہیں تھا لیکن عرصہ تک جب مجھے نہ اس کی رسید ملی اور نہ جواب ملا بلکہ میرے پاس ڈاک خانے کی رجسٹری کی جو جوابی رسید آئی وہ بھی بغیر دستخط کے تھی' تب میں نے اس خط کو مجبوراً پریس کے حوالہ کیا۔ اس سے قبل بھی میں صدر صاحب کو ایک خط لکھ چکا تھا' جس کا نہ جواب آیا نہ رسید۔ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے آدمی کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں جو کہ بہت سی باتیں ان تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس کا ایک ثبوت بھی مجھے مل گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ میں ۵ مئی ۱۹۸۳ء کو صدر صاحب سے ملاقات کے لیے پنجاب گورنر ہاؤس حاضر ہوا اور اُن سے اپنے پہلے خط کا ذکر کیا جو کئی مہینے قبل میں نے ان کو لکھا تھا۔ میں اس خط کی نقل بھی ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے صدر صاحب کو وہ خط دکھایا اور انہیں بتایا کہ مجھے تا حال اس کا کوئی جواب نہیں ملا تو صدر صاحب نے اس کو دیکھ کر اور پھر پڑھ کر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے تو یہ خط دکھایا نہیں گیا۔

زکوٰۃ آرڈیننس

زکوٰۃ کا جو نظام ہمارے ملک میں قائم کیا گیا ہے' اس کا بڑا دعویٰ بھی ہے' شہرہ بھی اور پروپیگنڈہ بھی لیکن اس میں ابتدا سے خامی تھی۔ اس کے بارے میں میں نے صدر صاحب سے ایک نجی ملاقات میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اس سلسلے میں ہمارے شیعہ بھائیوں نے جو agitation کیا ہے اور آپ سے ایک وعدہ حاصل کر لیا ہے' اس کے نتیجہ میں آپ کو اپنا قدم واپس لینا ہے تو خدا کے واسطے جزوی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر لیجیے گا۔ اپنا آرڈیننس واپس لے لیجیے' کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ اس سے پہلے بھی یہ ملک چل رہا تھا اور آئندہ بھی چلتا رہے گا۔ نماز عبادات میں شامل ہے۔ آپ اس کے لیے جبر نہیں کر سکتے البتہ تشویق و ترغیب دلا سکتے ہیں' ماحول کو ایسا سازگار بنا سکتے ہیں کہ لوگوں میں نماز کا شوق از خود ابھرے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی اگرچہ اسلامی نظام

معیشت کا ایک اہم ستون ہے لیکن وہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے۔ لہٰذا آپ اس کے معاملہ میں بھی صحیح اسلامی شعور پختہ ہونے تک اگر یہ فیصلہ کریں کہ فی الحال اس میں جبر نہیں کر سکتے تو پھر اس آرڈیننس کو واپس لے لیجیے' اس میں ترمیم نہ کیجیے۔ اس لیے کہ اگر آپ نے شیعہ حضرات کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو ناواقف اور کمزور ایمان والے سنیوں کو شیعہ بنانے کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ وہ بات ہے جو کہ بالفعل ہوئی اور اس کے نتائج لوگوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ خبریں مل رہی ہیں کہ ہماری دیہاتی آبادی میں کالے جھنڈے بڑی کثرت سے کھڑے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا زکوٰۃ کی اس جبری ادائیگی سے مستثنیٰ ہونے کے لیے اس اختلاف کے باعث فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کمزور عقیدے اور بے عملی کے شکار کتنے ہوں گے جو شیعہ بھائیوں کی ذرا سی کوشش سے یہ رنگ اختیار نہیں کر لیں گے۔ یہ وہ بہت بڑا اندیشہ تھا اور میں نے بروقت اللہ کا واسطہ دے کر صدر صاحب سے عرض کیا تھا کہ ایسا نہ کیجیے گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ وہی ہوا۔ پرنالہ وہیں گرا اور اس کے جو نتائج برآمد ہونے چاہییں تھے' وہ برآمد ہوئے جو پورے ملک کے سامنے ہیں۔

اس ضمن میں دوسرا اہم تر معاملہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نظام درحقیقت معاشرہ کے اندر معاشی اعتبار سے فرق و تفاوت کا علاج اور حل ہے۔ اب اگر دنیا کے سامنے صورتِ حال یہ آئے کہ پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام قائم و نافذ ہو بھی گیا' لیکن معاشرہ میں معاشی فرق و تفاوت جوں کا توں موجود ہے' تو غور کیجیے کہ لوگ نظامِ زکوٰۃ سے بددل اور مایوس ہوں گے یا نہیں! ان کے دل میں اسلام سے لگن اور محبت پیدا ہو گی یا اس کے برعکس معاملہ ہو گا! اس سے کوئی نیک نامی حاصل ہو گی یا بدنامی!

زکوٰۃ صرف اس رقم پر واجب کی گئی ہے جو بینکوں میں جمع ہے۔ سوال یہ ہے کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ کیوں عائد نہیں کی گئی جب کہ انکم ٹیکس کے گوشواروں سے ان پر زکوٰۃ کا حساب بھی آسان ہے؟ کیا کوئی فرقہ ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہو کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے؟ ہر فقہی مسلک کے نزدیک جس طرح نقد پر' اگر وہ نصاب کی حد میں آتا ہو' زکوٰۃ ہے

اُسی طرح مالِ تجارت پر بھی زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا ہر سال اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے اور وصول کی جانی چاہیے۔ البتہ بڑی بڑی فیکٹریوں کی جو عمارتیں ہیں' ان میں جو مشینیں ہیں' ان پر میری معلومات کی حد تک تمام مسالک کا اتفاق ہے کہ وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی یہ رائے نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان پر base کرتی ہے کہ کاریگر لوگوں کے اوزار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے بڑھئی ہے' لوہار ہے' یا کوئی اور کاریگر ہے تو ان کے اوزاروں پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ یہ بالکل عین انصاف ہے۔ لیکن کہاں کاریگروں کے ہتھیار اور کہاں لاکھوں روپے کی مشینری! لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے لیے محلِ نظر ہوگا کہ ملوں اور فیکٹریوں کی کروڑوں روپے کی مشینوں کو کاریگر کے اوزاروں پر قیاس کیا جائے گا! یہ معاملہ اجتہادی ہوگا۔ اس پر علماء کا کوئی مستند بورڈ ہی کوئی حتمی فیصلہ کرسکتا ہے۔ میری تاحال رائے یہ ہے کہ اس میں ہمارے علماء کو دین کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کوئی راہ نکالنی ہوگی۔ لاکھوں کروڑوں روپے کی مالیت کی مشینوں کو کاریگر کے اوزاروں پر قیاس کرنا کافی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ البتہ ملوں اور فیکٹریوں میں جو بھی خام مال اور تیار مال موجود ہے اس کے بارے میں کسی فقہی مکتب میں قطعی اختلاف نہیں ہے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جیسے نقد اثاثہ ہے اُسی طرح ہر نوع کا تجارتی مال بھی اثاثہ ہے۔ زیورات بھی اثاثہ ہیں۔ ان سب پر ایک سال کی مدّت گزرنے کے بعد زکوٰۃ عائد ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ہم نے انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کا معاملہ کیا ہے۔ کہنے کو نظامِ زکوٰۃ نافذ بھی ہو گیا لیکن معاشرے میں اونچ نیچ اور فرق و تفاوت جوں کا توں ہے۔ اس کی مناسب تعبیر یہ ہوگی کہ beggary کو ایک بہتر شکل دے دی گئی ہے۔ بھیک دینے اور خیرات بانٹنے کی جو شکل ہے' وہ منظم ہوگئی ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ زکوٰۃ کے ذریعے پہلے معاشرے میں کام کے اہل مستحقین افراد کو روزگار یا وسائل مہیا کیے جاتے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خود کفیل یونٹ بن سکتے۔

اسی طرح سود کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق بڑے دعوے سے کہا جا رہا ہے کہ جلد ہی پورا سودی نظام ختم ہو جائے گا۔ مَیں کوئی ماہر اقتصادیات نہیں ہوں۔ اس معاملہ میں مجھے

جن لوگوں کے دینی فہم پر بھروسا ہے اور جو ماہرین اقتصادیات بھی ہیں' ان کی رائے پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اس وقت پی ایل ایس کا جو اکاؤنٹ کھولا گیا ہے' اس کے متعلق جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے تو معلوم ہوا کہ وہی سود ہے۔ اس میں سرِ مو کوئی فرق نہیں ہے' صرف یہ ہوا ہے کہ لیبل بدل دیا گیا ہے۔ پھر پرائز بانڈز کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں ہر سال نئی attraction پیدا کی جاتی ہے۔ پرائز بانڈز میں نہ صرف سود involve ہے بلکہ اس میں جوئے کا عنصر بھی بکمال و تمام شامل ہے۔ مزید برآں حکومت کی انوسٹمنٹ certificates کی جو مختلف اسکیمیں چل رہی ہیں اور نئی نئی جاری ہوتی رہتی ہیں' ان کے متعلق تو ایک عام پڑھا لکھا شخص بھی بآسانی اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ صد فی صد سودی اسکیمیں ہیں۔

اسلامی نظام معیشت و اقتصادیات کے اعتبار سے دو ہی چیزیں اہم ترین ہیں۔ ایک سود کا خاتمہ' دوسرے تحصیل و تقسیم زکوٰۃ کا نظام۔ ان کے حوالے سے ہم نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ سود ختم ہوا اور نظامِ زکوٰۃ نافذ ہو گیا' لہٰذا اقتصادی و معاشیاتی شعبہ میں اسلام آ گیا! کہنے کو تو اسلام آ گیا لیکن عام لوگوں کی معاشی و اقتصادی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس تضاد کو دیکھئے کہ ایک طرف بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ اسلام آ گیا' اسلام آ گیا لیکن دوسری طرف منکرات کا فروغ ہو رہا ہے۔ رشوت بڑھتی جا رہی ہے' کرپشن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے' بے پردگی اور بے حیائی بھی روز افزوں ہے۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک جس طریقے سے ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے چلائی تھی' اسی سطح پر اس مارشل لاء کے دور میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں حکومت کی سرپرستی میں چل رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان تمام منکرات پر ''اسلام آ رہا ہے' اسلام آ رہا ہے'' کا لبادہ پڑا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر مساواتِ مرد و زن اور آزادیٔ نسواں کی تحریک ہمارے معاشرے میں پورے زور شور سے جاری ہے اور اس کی مدد کے لیے ملک کے قومی ذرائع ابلاغ بے دریغ استعمال ہو رہے ہیں۔

منکرات کا فروغ

اسلام آ رہا ہے اور ساتھ ہی یہ چیزیں بھی آ رہی ہیں۔ منکرات کے فروغ کا معاملہ صاف نظر آ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ثقافت اس ملک میں آج سے آٹھ دس سال پہلے تھی' کیا اسی ثقافت کی آج ترویج نہیں ہو رہی! موجودہ حکومت کیا اسی کی سرپرستی نہیں کر رہی ہے! مادام نور جہاں جو کبھی فوٹوؤں میں جنرل محمد یحییٰ خاں کی گود میں بیٹھی نظر آتی تھی تو کیا آج اس کا استقبال بڑے اکرام و اعزاز کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں ہو رہا! فرق و تفاوت کیا ہے! فرق صرف ایک شخص کا ہے کہ اُس کی گود میں کوئی ایکٹریس بیٹھی نظر نہیں آتی۔ الحمد للہ' یہ بھی بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو منکرات کی اس حد تک جانے سے محفوظ رکھے۔ دراصل سوال تو حکومتی رویے کا ہے۔ سوال اس پوری ثقافت کا ہے۔ اگر صدر مملکت کی طرف سے ایوانِ حکومت میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی بڑی شان اور آن بان کے ساتھ پذیرائی ہو رہی ہو اور دوسری طرف ترویج اسلام کے دعوے ہیں تو یہ صریح تضاد ہے۔ یہ قول بھی صدر صاحب سے منسوب تمام اہم اخبارات میں آیا ہے کہ ''دیکھ لیجیے مَیں کٹر نہیں ہوں' اسی لیے آپ کے درمیان موجود ہوں۔'' ایسے میں نہایت ہی اہم سوالیہ نشان ذہن میں اُبھرتا ہے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس کے نفاذ کے عزائم کا اظہار سات سال سے بھی زیادہ عرصے سے مسلسل کیا جا رہا ہے اور بڑے دعاوی کے ساتھ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے!

مَیں ہرگز یہ باتیں نہ کہتا اگر یہ چیزیں کسی اور دور میں ہو رہی ہوتیں۔ جہاں ہمارے معاشرے میں بے شمار خرابیاں چلی آ رہی ہیں' ان میں اس نوعیت کی خرابیاں بھی موجود ہیں لیکن ''اسلام آ رہا ہے'' کے دعووں کے ساتھ ان منکرات میں کمی کے بجائے فروغ ہونا نہایت دُکھ کی بات ہے۔ ان منکرات میں سے کسی کو ہدف بنا کر مورچابندی کرنا میرے پیش نظر نہیں ہے۔ میرا مستقل موقف تو یہ ہے کہ ہم قرآن وسنت سے ماخوذ طریق کار کے مطابق اسلامی انقلاب کے لیے میدان ہموار کرتے چلے جائیں۔ لیکن جب یہ سب کچھ ان ہاتھوں سے ہو رہا ہو جن کا اوڑھنا بچھونا اسلام ہو' جو اُٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لیتے ہوں'

جو اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم نے یہاں اسلام قائم کیا ہے' قائم کر رہے ہیں اور قائم کیے بغیر نہیں جائیں گے تو ایسی صورتِ حال میں معاملات شدید تشویش کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ پیش قدمی کس سمت میں ہو رہی ہے؟ اسلام کی طرف یا اس کی مخالف سمت میں! یہ راہرو پشت بمنزل ہے یا اس کا چہرہ منزل کی طرف ہے۔ یہ فیصلہ بہر حال کرنا پڑے گا اور بات صحیح صحیح کہنی پڑے گی اس لیے کہ ایسی صورتِ حال میں خاموش رہ جانا میرے نزدیک کتمانِ حق ہے' حق کا چھپالینا ہے۔

اسی لیے مَیں نے آج آغاز میں سورۃ الحج کی تین آیات کی تلاوت کے بعد ایک متفق علیہ حدیث کا بڑا حصہ بھی شامل کیا تھا۔ سند کے اعتبار سے متفق علیہ روایت سے اونچا حدیث کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس حدیث میں ان وعدوں کا ذکر ہے جو نبی اکرم ﷺ بیعت کے وقت صحابہ کرام ؓ سے لیا کرتے تھے۔ اس حدیث کے راوی ہیں حضرت عبادہ بن الصامت ؓ۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ بایعنا رسول اللہ ﷺ ''ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے'' عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ''اس بات پر کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔'' فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ ''خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو۔'' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ''خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو خواہ آمادہ نہ ہو اور ہمیں جبر کرنا پڑے''۔ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا ''اور اس بات پر کہ خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے'' وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''اور اس بات پر کہ ہم صاحب امر' اولوالامر سے جھگڑا نہیں کریں گے' چھینا جھپٹی نہیں کریں گے' ہم اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کریں گے''۔ یہ تمام مفاہیم حدیث کے اس درمیانی چھوٹے سے ٹکڑے میں شامل ہیں۔ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ ''اور اس بات پر (بیعت کی) کہ ہم حق کہتے رہیں گے جہاں اور جس حال میں بھی ہوں اور ہم اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف کھا کر یا بددل ہو کر صحیح و حق بات کہنے سے باز نہیں رہیں گے''۔ یہ بیعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ سے کی تھی۔ میری بات توجہ سے سنیے۔ درحقیقت یہ بیعت ہر مسلمان کی محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

ہے اگر وہ کسی درجہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دامن سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا ہے۔ یہ بیعت ہر مسلم و مؤمن کے دعوئ اسلام و ایمان کے مقتضیات و متضمنات میں آپ سے آپ شامل ہے' implied ہے۔ اگرچہ ہم اس شرف سے محروم ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دستِ مبارک میں اپنا ہاتھ دے کر اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کر کے بیعت کی ہوتی لیکن ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اصولاً ہماری یہ بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہے۔ یہ ساری باتیں اور یہ سارے کام ہمیں کرنے ہوں گے جو اس بیعت کے الفاظ میں بیان ہوئے۔ اگر نہیں کرتے تو پھر ہمارا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ قائم نہیں ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

یہی وفاداری کا معاملہ ہے جسے ''جوابِ شکوہ'' میں علامہ نے یوں بیان کیا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں!
یہ جہاں چیز ہے کیا! لوح و قلم تیرے ہیں

اصلاحِ احوال

مَیں نے یہ بات موجودہ حکومت کے سامنے کئی مرتبہ رکھی ہے۔ شوریٰ میں یہ بات کہی ہے۔ صدر مملکت جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے ذاتی طور پر ۵ مئی ۱۹۸۳ء کی ملاقات میں عرض کی ہے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ نے اس ملک میں شریعت کورٹ بنائی۔ اتنا بڑا تاریخی کام کیا کہ یہ کورٹ تمام قوانین کی جانچ پڑتال کر سکتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا ان کا کوئی جزو یا کل کا کل' کوئی قانون شریعت کے خلاف تو نہیں ہے۔ پھر آپ نے اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک کے چوٹی کے ماہرین شریعت کو وہاں لا کر بٹھایا ہے' کسی اور نے اُن کو آپ پر ٹھونسا نہیں ہے۔ آپ کی اپنی selection ہے۔ آپ کے اپنے پسندیدہ لوگ ہیں۔ ان کے علم پر' ان کے تقویٰ پر' ان کی امانت پر' ان کی دیانت پر آپ کو پورا اعتماد ہے تب ہی آپ نے انہیں اتنے اُونچے منصب پر بٹھایا ہے۔

لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ عائلی قوانین کے بارے میں ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ اس قانون کے بارے میں وہ غور نہیں کر سکتے۔ کوئی رِٹ ہو بھی تو وہ اُسے سن نہیں سکتے۔ ان عائلی قوانین کو کوئی چیلنج کرے تو وہاں اس کی سماعت ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن اور احادیث میں سب سے زیادہ تفصیلی احکام عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ ملک کا سیاسی ڈھانچا کیا ہو' اس کے بارے میں تفصیلی احکام نہیں ہیں۔ صرف directive principles دیے گئے ہیں۔ اسی طریقے سے معاشی ڈھانچا کیا ہو' اس کے لیے بھی چند چیزیں حرام کر کے ہمارے لیے گویا کہ وہ four corners معین کر دیے گئے ہیں کہ اُن سے باہر قدم نہیں رکھا جا سکتا۔

اسی میں حکمت تھی' چونکہ سیاسی اور اقتصادی اعتبارات سے ابھی زمانے میں مزید ترقی اور ارتقا ہونا تھا۔ اللہ کے علم میں تو تھا کہ ابھی صنعتی انقلاب بھی آنے والا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد اس دنیا میں بالکل نئے معاشی مسائل پیدا ہو کر رہیں گے۔ لہٰذا تفصیلی ڈھانچا اس وقت کے مجتہدین امت کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ جو چیزیں حرام مطلق ہیں' ان کی حدود مقرر کر دی گئیں' باقی اب تمہیں اختیار ہے کہ اس دائرے کے اندر اندر اپنے لیے حالات کی مناسبت سے کوئی نظام تجویز کر لو۔ اسی طریقہ سے سیاسی ارتقا کا عمل ابھی جاری تھا۔ قبائلی نظام سے آگے شہری ریاستیں' اس سے آگے مملکتیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تصور کہ ریاست علیحدہ ہے' حکومت علیحدہ ہے۔ اس وقت تک تو ان کے مابین کوئی differentiation موجود تھی ہی نہیں۔ ریاست اور حکومت ایک شے سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا سیاسی اعتبار سے بھی ہمیں کوئی تفصیلی ڈھانچا نہیں دیا گیا۔ گویا ہمارے ہاتھ کھلے چھوڑے گئے۔ البتہ اس کے بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتے جنہیں سورۃ الحجرات کے آغاز میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے' اور اللہ کی اطاعت بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو گی۔ قانون سازی کا اختیار محدود اور مقید ہے۔ وہ اِسی دائرے کے اندر اندر رہ کر کی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرما دیا ہے۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی نصوص اور واضح تصریحات سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ اس دفعہ کو جو ہر دستور میں بطور رہنما اصول (directive principle) شامل رہی ہے' نافذ العمل (operative clause) بنا دیجیے کہ

No Legislation can be done repugnant to the Quran and the Sunnah

تو ہماری ریاست ایک اسلامی ریاست ہو جائے گی۔ پھر کوئی شخص بادشاہ یا آمر مطلق بن کر تخت اقتدار پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسلامی ریاست میں لازماً اس اصول پر عمل پیرا ہونا ہو گا: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۡ﴾ رہا یہ سوال کہ شورائیت کا نظام کیا ہو' تو تمدن کے ارتقائی مراحل کے مطابق کتاب وسنت کے دائرے کے اندر رہ کر جو بھی بہتر اور مناسب نظام سمجھا جائے' اُسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں سیاسی واقتصادی معاملات کے متعلق اصل الاصول۔

جہاں تک عائلی و معاشرتی احکام اور قوانین کا تعلق ہے تو سورۃ البقرۃ کے پانچ چھ رکوع اسی موضوع پر چلتے چلے گئے ہیں۔ سورۃ النساء میں ان پر پھر بڑی تفصیلی بحثیں آئی ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں یہ موضوع تفصیلی طور پر زیر بحث آتا ہے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب کے بڑے حصے مسلمانوں کے خاندانی اور معاشرتی ومجلسی زندگی کے بارے میں ہیں۔ سورۃ الطلاق کا اکثر وبیشتر حصہ انہی موضوعات پر ہے۔ سورۃ التحریم کے بھی اکثر و بیشتر حصے میں ان ہی مسائل پر گفتگو ہے۔ مسلمانوں کے عائلی وخاندانی نظام کے بارے میں تو انگریزی حکومت نے بھی یہ جرأت نہیں کی تھی کہ وہ اس کے اندر کوئی مداخلت کرے۔ اس نے بھی ان مسائل کو مسلمانوں کی اپنی صوابدید پر چھوڑے رکھا تھا۔ ہم عمل کرتے تھے یا نہیں' یہ بات دوسری ہے۔ یہ پہلے مارشل لاء میں ہوا ہے جو ایوب خان کا دورِ حکومت تھا۔ دراصل پورا عائلی قانون منکرین حدیث وسنت کی سوچ کا مظہر ہے جس کو بالجبر نافذ کر دیا گیا۔ اس دور میں ہمارے تمام مسلمہ فقہی مسالک کے جید علماء کرام حتیٰ کہ اہل تشیع نے بھی اس قانون کی اکثر وبیشتر دفعات کو بالکلیہ خلافِ اسلام قرار دیا تھا۔ میں

نے صدر صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "آپ کا مارشل لاء اُس کو تحفظ دے رہا ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری رائے پر عمل کیجیے۔ سوال یہ ہے کہ آپ شریعت کورٹ میں معاملہ پیش ہونے دیں۔ وہاں علماء بھی اپنا موقف۔ اور اپنے دلائل پیش کریں۔ پرویز صاحب اور ان کے ہم نوا بھی اپنا موقف اور استدلال پیش کریں۔ دلیل اور جرح وتعدیل سے معاملہ طے ہو جائے گا۔ اس کی روشنی میں شریعت کورٹ طے کرے گی کہ عائلی قانون میں کوئی چیز خلافِ شریعت ہے یا نہیں۔ شریعت کورٹ میں آپ نے ان لوگوں کو بٹھایا ہوا ہے جو آپ کے معتمد علیہ ہیں۔ لہٰذا اس میں آخر آپ کو کیوں ہچکچاہٹ ہے! آپ اُسے کیوں تحفظ دے رہے ہیں!"

خلطِ مبحث

تضاد کا یہ عالم ہے کہ وہ میدان جس میں شریعت نے تفصیلی احکام دیے ہیں، اس پر تو قدغن ہے، اس پر تو شریعت کورٹ بھی غور نہیں کر سکتی جبکہ وہ معاملات جن کے بارے میں شریعت میں کوئی تفصیلی احکام نہیں ہیں، ان کے بارے میں لمبی چوڑی بحثیں چھیڑ دی گئی ہیں۔ جماعتی نظام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ جماعتی انتخاب ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟ غیر جماعتی انتخاب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق شریعت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملے گی نہ کتاب اللہ سے، نہ سنتِ رسولؐ سے۔ ان مسائل پر تو لمبے چوڑے فلسفے کثرت سے تراش دیے گئے ہیں۔ چند دانشور حضرات لنگر لنگوٹا کس کر میدان میں آ گئے ہیں۔ مجھے ان کی نیت پر کوئی شک نہیں ہے۔ ان کی ایک رائے ہے لیکن مَیں ان حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات تو ہمیں خلافتِ راشدہ میں نظر نہیں آئی کہ وہاں کوئی پارٹی ہو لیکن کیا خلافتِ راشدہ کی ایک اور چیز انہیں نظر نہیں آئی کہ وہاں مسلح افواج (standing army) کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ کیا وہاں فوجیں تھیں جس طرح کی فوجیں آج ہمارے یہاں موجود ہیں؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہو بہو سارا وہی نظام اس ملک میں آنا چاہیے تو پھر فوج کا بھی وہی نظام لائیے اس ترمیم کے ساتھ کہ ایئر فورس اور نیوی کا معاملہ اور سپلائی نیز مواصلات (کمیونیکیشن)

کے محکمے برقرار رکھیے۔ انفنٹری اور کیولری کا معاملہ یا اور جو چیزیں ہیں ان کو چھوڑ دیجیے۔ پیپلز آرمی بنائیے۔ وہاں تو ہر مسلمان اللہ کا سپاہی تھا۔ ہر مسلمان مجاہد تھا۔ جب ضرورت ہوتی تھی تو پوری قوم آتی تھی اور جتنے لوگوں کی ضرورت ہوتی تھی' میدان میں نکل آتے تھے۔ آپ یہاں جبری فوجی بھرتی اور جبری فوجی ٹریننگ نافذ کیجیے۔ ہر مسلمان شہری کو فوجی بنا دیجیے۔ خلافتِ راشدہ کے دور کی یہ بات تو نظر نہیں آ رہی۔ اس کو اختیار کرنے کا کوئی مشورہ نہیں دے رہا! اس کے لیے دلائل دیے جا رہے ہیں کہ زمانہ بدل گیا' نظام بدل گیا' صورت حال متقاضی ہے' اس دور میں مسلح افواج نہ ہوں تو defence نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دلیل اس میدان میں کارگر ہے' اور یقیناً ہے' تو اسی دلیل سے آپ سیاسی میدان میں کام کیوں نہیں لیتے! اس میدان میں آپ سیاسی جماعتوں کی موجودگی اور انتخابی عمل کو تمدنی ارتقا اور اس دور کا تقاضا قرار کیوں نہیں دیتے! آپ صرف سیاسی میدان کے لیے خلافتِ راشدہ کے دور کو بطورِ دلیل لا کر اس کی نفی کرنا چاہتے ہیں! آخر کیوں؟

مَیں اس لیے اس کی وضاحت کر رہا ہوں کہ مَیں نے بھی قریباً پونے دو سال قبل جناب صدر مملکت کے نام جو خط لکھا تھا' اس میں غیر جماعتی انتخاب کی حمایت کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہوں کہ اس وقت مختلف گوشوں سے غیر جماعتی انتخاب کی جو حمایت ہو رہی ہے تو میں بھی اس کا حامی ہوں۔ لہٰذا میں یہ بات برملا کہتا ہوں اور اس کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میں غیر جماعتی انتخابات کا ہرگز حامی نہیں ہوں۔ اُس وقت مَیں نے جو غیر جماعتی انتخاب تجویز کیا تھا تو وہ تشکیل حکومت یا منتقلی اقتدار کے لیے نہیں تھا بلکہ اس لیے تھا کہ ملک کے سیاسی ڈھانچے اور نظام کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز صدر صاحب تنہا نہیں ہیں۔ ایک فرد اور اس کے اپنے چنے ہوئے چند رفقائے کار کو کوئی خدائی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک آزاد ملک کے سیاسی ڈھانچے اور نظام کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار بہرحال اس ملک میں بسنے والوں کو حاصل ہے۔ لہٰذا مَیں نے صرف اس نظام کے بارے میں طے کرنے کے لیے کہ انتخابات کس نہج پر ہوں' نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی' ووٹر اور امیدوار کی عمر اور اہلیت کے بارے میں کسی

تبدل وتغیر کی ضرورت ہے یا نہیں، طرزِ حکومت وحدانی ہو کہ وفاقی، غیر جماعتی انتخاب کا طریق تجویز کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی تجویز کیا تھا کہ جب یہ مسائل بحسن وخوبی طے ہو جائیں تو عوام کے ان منتخب نمائندوں کے منظور شدہ اصولوں کے مطابق ملک میں جلد سے جلد انتقالِ اقتدار اور حکومت کی تشکیل کے لیے انتخابات کرا دیئے جائیں، جو جماعتی بنیادوں پر ہی ہو سکیں گے۔ البتہ اگر آپ ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق انتخابات کراتے ہیں تو فبہا، کیونکہ اس کی پشت پر یہ سند موجود ہے کہ اس کو ایک منتخب اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ اسمبلی میں شامل تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس دستور پر توثیقی دستخط کیے تھے۔ اس طرح ''کچھ لو کچھ دو'' کے اصول پر ایک مصالحانہ دستاویز تیار کی گئی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جس شخص نے اتنا بڑا کریڈٹ لیا تھا، اسی نے پھر اس کو موم کی ناک بنا دیا۔ بہت سی ترمیمیں کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اگر ان ترامیم کو condone کر دیا جائے تو وہ قوم کی ایک متفق علیہ دستاویز ہے۔ میں نے متعدد بار اپنی تقریروں میں بھی صدر صاحب کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اگر اس ملک کی خیر خواہی کے لیے آپ کے پاس کسی بہتر سیاسی نظام کا نقشہ ہے تو آپ کو حق ہے کہ آپ اُسے پیش کریں لیکن فیصلے کا اختیار آپ کو نہیں ہے۔ فیصلہ یہاں کے رہنے والے اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے کریں گے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ معاملہ سیاسی ڈھانچے اور نظام کا ہے۔ اسے طے کرنے کے لیے غیر جماعتی انتخابات کے ذریعہ ایک گرینڈ اسمبلی تشکیل کرا لیجیے۔ اسے پیپلز کانگرس کہہ لیجیے یا کسی اور نام سے منسوب کر لیجیے، اُسے غیر جماعتی بنیاد پر منتخب کرا لیجیے اور وہ جو ڈھانچا اور نظام طے کرے اس کے مطابق پھر دوسرا انتخاب جماعتی بنیادوں پر ہو، جو تشکیل حکومت اور اقتدار کی منتقلی کے لیے ہو۔ میری تجویز کا اصل مفاد و مقصد یہ تھا۔

دینی عناصر کی مصلحت اندیشی

فی الوقت حکومت کی طرف سے بڑے شدّ ومدّ اور تیقن کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ انتخابات ۱۲ راگست ۱۹۸۳ء میں دیے ہوئے شیڈول کے مطابق ضرور ہوں گے۔ البتہ یہ بات ابھی تک غیر واضح ہی نہیں، معمہ بنی ہوئی ہے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں گے

یا غیر جماعتی بنیاد پر۔ کسی طریق سے بھی ہوں' اللہ کرے کہ سیاسی وانتخابی عمل کسی طور پر بھی جاری ہو جائے اور کوئی داخلی یا خارجی صورتِ حال اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بن جائے۔ بہر حال اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے یا ہونے کا امکان ہے' وہ درحقیقت میری اس تجویز کے تحت نہیں ہے جو مَیں نے خط کے ذریعہ صدر صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی بلکہ یہ ایک نیا فلسفہ ہے جو بعض دانشوروں اور علماء کے حوالے سے فضا میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض قابل لحاظ عناصر میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔ جب گھٹن اور حبس کی شدید کیفیت ہو تو جلد بارش ہونے کا قریباً یقین ہو جاتا ہے' اسی طرح بسا اوقات سیاسی طور پر گھٹن اور بے چینی کا ردِّعمل ظہور کرتا ہے۔ کراچی میں سندھ میڈیکل کالج میں عین ''یومِ استقلال'' کی تقریب کے دوران قومی پرچم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور ''سندھو دیش'' کے حق میں نعرے لگائے گئے ہیں' اس سے اندازہ کیجیے کہ اندرونِ سندھ صورتِ حال کیا ہوگی! اس ناسور نے کتنی گہری جڑیں پکڑ لی ہیں' اس کا اندازہ اس افسوس ناک واقعے سے کیا جاسکتا ہے۔ کراچی میں رہنے والوں کے لیے تو سندھی نیشنل ازم میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں۔ سندھی بے چارے تو اس آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہوں تو ہوں۔ وہ تو خالص مہاجرین کا شہر ہے اور یہی ہمارے سندھی بھائیوں کو شکایت بھی ہے لیکن اس شہر میں' اس گڑھ میں جسے بانی پاکستان قائداعظم کے مولد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے اور مدفن کا بھی' قومی پرچم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور نظریۂ پاکستان کے خلاف جس طرح ہنگامہ آرائی ہوئی ہے' وہ ایک بڑے خطرے کی علامت ہے۔ اگر یہ خبر اخبارات میں نہ آتی تو مجھے اور آپ کو کیا پتہ ہوتا! اندرونِ سندھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق یہی عرض کرسکتا ہوں کہ ع قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ اس پھوڑے کی گہرائی کا اندازہ کیجیے جس کے پیپ کے یہ چند قطرے باہر آئے ہیں' وہ بھی یومِ استقلال کو اور کراچی جیسے شہر میں۔ یہ لاوا اندر بھی پک رہا ہے اور حالات کے مشاہدے سے اندیشہ ہے کہ باہر کا طوفان اور سیلاب بھی آیا ہی چاہتا ہے۔

انہی خطرات کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام اور دینی جماعتیں

أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن کے فلسفے پر کاربند ہیں، جو عموماً ایسے حالات میں ان کے سامنے رہتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جو ہمارے معاشرے میں منکرات کے فروغ کے لیے ہو رہا ہے، مہر بر لب ہیں۔ کیا ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر کے بارے میں ان سب کی رائے وہ نہیں ہے جو مَیں نے پیش کی ہے؟ اسلام میں عورت کے اصل مقام، ستر و حجاب، قَرن فی البیوت اور ان کے علیحدہ دائرہ کار کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ مَیں نے دو ڈھائی سال قبل جو رائے پیش کی تھی، کیا ان مسائل کے بارے میں ان سب کی بھی وہی رائے نہیں ہے؟ آج آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے نام پر ہمارے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، آزاد خیال اور مغرب زدہ خواتین کو جس طرح معاشرے میں اونچا اٹھایا جا رہا ہے، انہیں کھلی چھوٹ دی جا رہی ہے، کیا ان کی رائے میں یہ سب کچھ اسلام کے مطابق ہو رہا ہے؟ لیکن وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش ہیں۔ کیا اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ فتویٰ نہیں دیا تھا کہ سرکاری دفاتر میں قائداعظم اور دوسرے اکابر کی تصاویر لگانا شرعاً صحیح نہیں ہے؟ اس پر کتنا عمل درآمد ہوا؟ کیا یہ سب کچھ ان کے علم میں نہیں ہے! ایسا نہیں ہے کہ ہمارے دینی عناصر ان تمام منکرات سے بے خبر اور ناواقف ہوں جو بڑے پیمانے پر ہمارے معاشرے میں ترویج اور فروغ پا رہے ہیں لیکن ایک مصلحت ہے، ایک اندیشہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر موجودہ regime ہٹ گئی جس کا سربراہ بذاتِ خود نماز اور روزے کا پابند ہے، اپنی ذات کے لحاظ سے پرہیزگار ہے، اسلام کو نافذ کرنے کی کوششوں کا مدعی ہے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا گروہ مسلط ہو جائے جو شاید ہماری ڈاڑھیاں بھی منڈوا دے، ہمارے دینی مدارس کی تالا بندی کرا دے۔ اس سے تو بہر حال موجودہ گروہ بہتر ہے۔ یہ أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن کا فلسفہ ہے جو موجودہ حکومت کے لیے سہارے کا موجب بن گیا ہے۔

مَیں ایک دوسرا خطرہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ صورتِ حال ہمارے عوام و خواص کو دین سے بالکل بدظن اور مایوس کر دے گی۔ پھر یہاں دین کا نام لینا بھی محال ہو جائے گا۔ حمیت اور غیرتِ دین کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ رجالِ دین اپنے آپ کو اس عمل اور کام

سے علی الاعلان بالکل علیحدہ کر لیں۔ عوام کو آگاہ کر دیں کہ اس process میں ہماری تائید شامل نہیں ہے۔ میں واضح طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ اسلام کی ترویج ونفاذ اور اس کی ترجیحات والا معاملہ نہیں ہے۔ اسلام کی ترجیحات تو یہ ہیں کہ اسے فی الواقع اور اخلاص کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ پہلے اُسے گھر کے نظام میں نافذ کرو' اس کے بعد دوسری باتوں کی باری آئے گی۔ اسلام کی ترجیحات میں یہ مقدم ہے۔ پھر اسلام کی ترجیحات میں اقامتِ صلوٰۃ مقدم تھی جبکہ زکوٰۃ کا نظام مؤخر تھا۔ یہاں زکوٰۃ کا نظام پہلے لایا گیا' اس کوتاہی کو اگر condone کر دیں تو وہ جس شکل میں لایا گیا اُسے میں بیان کر چکا ہوں۔ زکوٰۃ کا نظام تمام معاشی مشکلات کا حل ہے۔ یہ ہمارے اقتصادی نظام کا سب سے بڑا ستون ہے لیکن اس سے ہمارے معاشرے میں عملاً جو نتیجہ پیدا ہوا' اسے کون سی آنکھ نہیں دیکھ رہی! کون سا حساس انسان ہے جو اُسے محسوس نہیں کر رہا! یہ صورتِ حال نظامِ زکوٰۃ سے بدظن کرنے والی ہے' اس کی برکات کی قائل کرنے والی تو نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں بہت عرصے تک میرے ذہن میں اشکال رہا کہ کیا وجہ ہے جبکہ ایک بات بروقت کہہ بھی دی گئی۔ آخر صدر صاحب کو مجھ سے کوئی حسن ظن تھا کہ انہوں نے پہلے علماء کنونشن کے انعقاد سے دو روز قبل مجھے ایک خصوصی اجلاس میں بلایا۔ اس میں اور باتوں کے ساتھ مَیں نے زکوٰۃ آرڈیننس کے متعلق بات بھی کہی تھی۔ یہ ۱۸ راگست ۱۹۸۰ء کا واقعہ ہے۔ مَیں نے اللہ کا واسطہ دے کر یہ عرض کیا تھا کہ ''آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں۔ زکوٰۃ لوگوں کو اپنے اپنے طور پر ادا کرنے دیجیے۔ جن کو زکوٰۃ دینی ہوتی ہے' وہ اب بھی دے رہے ہیں۔ آپ اس میں یہ ترمیم نہ کیجیے گا کہ اہل تشیع کے بنک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی اور نہ ان سے اجتماعی طور پر عشر وصول کیا جائے گا۔ اس وقت جو لوگ زکوٰۃ اپنے طور پر ادا نہیں کرتے' وہ شیعہ ہونے کا ایک ڈیکلیریشن داخل کریں گے اور خود کو مستثنیٰ کرالیں گے۔ اس طرح دین سے صحیح طور پر واقفیت نہ رکھنے والے سنیوں کے شیعہ بننے کا دروازہ کھل جائے گا' جس کا نتیجہ بہت خطرناک نکلے گا۔'' مَیں سوچتا رہا کہ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آرڈیننس میں ترمیم کی گئی اور یہ عمل جاری ہے! یہ

عقدہ کھلا جب کراچی سے صدر صاحب سے منسوب ایک خبر شائع ہوئی جس میں ان کے مستقبل کے سیاسی عزائم کی نشان دہی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ جو سارے نظام اور اقدام ہیں در حقیقت ان کی پشت پر اپنا ایک سیاسی face اور امیج بنانا ہے۔

یہی بات انہوں نے ایک دوسرے انداز میں شوریٰ کے دوسرے اجلاس میں فرمائی تھی کہ ''شوریٰ کا قیام سیاسی عمل کا آغاز ہے! اس طرح شوریٰ اقتدار میں شریک ہوگئی ہے۔'' اسی تقریر کے بعد میں نے شوریٰ سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے اسی اجلاس کے دوران صدر صاحب سے ملاقات کا وقت مانگا تھا' جو مجھے نہیں ملا۔ ۵ مئی ۱۹۸۳ء کو مجھے لاہور میں یہ موقع میسر آیا جس میں' میں نے اپنا استعفیٰ بھی صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور چند ضروری معروضات بھی زبانی پیش کیں' جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔

میں مجلس شوریٰ میں گیا تھا' اسے واقعی ''شوریٰ'' سمجھ کر۔ جب صدر صاحب ایک جمعہ میں میرے سامنے تشریف فرما تھے تو میں نے چند مشورے اُن کی خدمت میں پیش کیے تھے' اس لیے کہ وہ صدرِ مملکت ہیں۔ یہ نظام صحیح ہے یا غلط' اس سے قطع نظر de facto تو وہ موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے مشورے کے لیے شوریٰ قائم کی' مجھے بھی اس میں نامزد کیا تو مشورہ مانگنے والے کو دیانت سے مشورہ دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسی لیے میں نے اُسے قبول کرلیا تھا۔ اب آپ اسے سیاسی عمل اور اقتدار میں شرکت قرار دے رہے ہیں اور یہ رنگ دے رہے ہیں کہ شوریٰ کے ارکان میرے اتحادی اور حلیف ہیں۔ میں یہ پوزیشن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہ بات میں نے صراحت کے ساتھ اپنے استعفیٰ میں بھی تحریر کردی تھی۔

دنیا کو میرا یہ declared موقف معلوم ہے کہ میں انتخابی سیاست' یا اقتدار میں کسی نوع کی شرکت کو اس نہج اور نقشے کے خلاف سمجھتا ہوں جو میرے پیش نظر ہے۔ میں جو کام کر رہا ہوں' اس کا ابتدائی مرحلہ قرآن مجید کی دعوت اور پیغام کو پھیلانا ہے۔ اس کا فکر' اس کی حکمت' اس کا فلسفہ اتنا عام کر دیا جائے کہ لوگوں کے دلوں میں یقین والا ایمان پیدا بھی

ہو جائے اور راسخ بھی۔ پھر اس دعوتِ قرآنی کے نتیجہ میں جاں نثاروں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آجائے جو جہاد فی سبیل اللہ کے تمام مراحل طے کر کے دین کو نافذ کر سکے۔ میرے پیشِ نظر اصل کام یہ ہے۔ میری یہ رائے ضرور ہے کہ اس ملک میں سیاسی عمل ضرور بالضرور جاری رہنا چاہیے ورنہ حبس پیدا ہو جائے گا۔ یہ حبس ملک کے لیے خطرناک ہے۔ حقیقی سیاسی عمل صحیح طور پر اور صحیح خطوط پر جتنا جلد جاری ہو سکے اتنا ہی ملک کے استحکام اور اس کی بقا کے لیے مفید ہے۔

مجھ سے عموماً سوال کیا جاتا ہے کہ ایک طرف تم کہتے ہو کہ میں انتخابات میں حصہ نہیں لوں گا جبکہ دوسری طرف تم ملک میں انتخابی سیاسی عمل کے پُرزور حامی ہو' تو یہ تضاد (contradiction) ہے۔ میں نے اس کی ہمیشہ وضاحت کی ہے کہ یہ دونوں چیزیں بالکل علیحدہ ہیں۔ خلطِ مبحث نہ کیجیے۔ اس کی مثال میں یہ دیتا رہا ہوں کہ ایک ہے انسان کا زندہ رہنا' ایک ہے اس کا مسلمان بننا۔ یہ دونوں چیزیں علیحدہ ہیں۔ زندہ رہنے کی ضروریات یہ ہیں کہ اُسے ہوا ملے' پانی ملے' کھانے کو غذا ملے۔ مسلمان ہونے کے لیے اُسے ایمان چاہیے۔ اللہ پر ایمان' رسول پر ایمان' قرآن پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ آپ اگر زندہ رہنے کے لیے ایمان کی بات شروع کر دیں گے تو وہ غریب مارا جائے گا۔ جس دَور میں ہم سانس لے رہے ہیں' اس میں کسی ملک کی بقا کے لیے وہاں رہنے والوں کا اطمینان ضروری ہے۔ ان کا یہ احساس کہ ملک کے معاملات میں' اس کے انتظام و انصرام میں ہماری بھی رائے شامل ہے' ہمارا بھی اس میں عمل دخل ہے' ہمارے حقوق بھی محفوظ و مامون ہیں۔ یہ سب کچھ اگر نہیں ہوگا تو جس طرح انسان بغیر ہوا' پانی' غذا ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح ایسا ملک باقی نہیں رہتا' ختم ہو جاتا ہے یا وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ حادثہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رونما ہو بھی چکا ہے۔ یا براہِ راست کسی طاقتور ملک کے زیر اثر چلا جاتا ہے اور اسے اپنے خارجی' داخلی' معاشی نظام حتیٰ کہ دفاعی امور میں اس کی بالادستی قبول کرنی پڑتی ہے۔ اس کا اپنا ذاتی وقار اور ذاتی اختیار دھیلے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ ہمیں اپنے ملک میں حقیقی اور صحیح اسلامی نظام قائم و نافذ

کرنا ہے' اس کے لیے ضرورت ہے کہ یہاں رہنے والوں کو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال کیا جائے۔ حقیقی ایمان کا منبع وسرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا مَیں اور میرے ساتھی اپنی توانائیاں' اپنی صلاحیتیں قرآن حکیم کی تعلیمات کو پھیلانے میں لگا رہے ہیں' کیونکہ ہمارے نزدیک یہی واحد ذریعہ اور راستہ اس ملک کو حقیقی اسلام کی طرف لانے کا ہے۔ اس ملک کے استحکام اور بقا کے لیے سیاسی عمل اور انتخابی عمل کا جاری رہنا ضروری ہے۔ میری اس بات پر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو وہ تضاد آپ کو ہرگز نظر نہیں آئے گا جو بادی النظر اور بظاہر احوال محسوس ہوتا ہے۔

سیاسی اور انتخابی عمل

آج کی تقریر آپ نے ناقدانہ بھی محسوس کی ہوگی اور اس میں کچھ تلخی بھی ہے۔ مرزا غالب کے اس شعر کے مصداق ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

مَیں اس نوع کی تقاریر سے شعوری طور پر گریز کرتا ہوں لیکن ایک تو بدعات و منکرات کے فروغ کے فوری مشاہدے کا ردِعمل ہے' اور دوسرے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ وقت جلد یا بدیر آ کر رہے گا جب چار و ناچار کسی نہ کسی درجے میں سیاسی گہما گہمی کی اجازت دے دی جائے گی۔ مَیں چاہتا ہوں کہ میرا یہ موقف واضح ہو جائے اور ریکارڈ پر آ جائے کہ اسلام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلام کی خیر خواہی نہیں ہے۔ موجودہ اربابِ اقتدار اس ملک کی بقا کے لیے' اس کے خیر کے لیے' اس کے استحکام کے لیے اپنی صواب دید کے مطابق جو کچھ کر رہے ہیں' کریں لیکن ''اسلام'' جس کا نام شد و مد کے ساتھ موجودہ حکومت کی طرف سے لیا جا رہا ہے' اس کی اپنی ترجیحات ہیں۔ انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ان پر خود بھی عمل کرنا ہوگا اور لوگوں سے بھی عمل کرانا ہوگا۔ اسلام نے کس چیز کو مقدم رکھا ہے اور کس چیز کو مؤخر' اس کو سامنے رکھ کر چلنا ہوگا۔ کُل کا کُل اسلام لانا ہوگا۔ اگر جزوی لیبل لگا کر ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا کہ اسلام آ گیا ہے' اسلام آ گیا ہے جبکہ اس کی عملی برکات کا دُور

دُور تک بھی پتہ نہیں تو اس سے شدید اندیشہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کو بہت بڑا نقصان پہنچے گا۔ اس ملک کی بقا اور استحکام کے لیے صرف ایک ہی مثبت اساس و بنیاد ہے اور وہ اسلام ہے۔ جب تک اسلام کی آس رہے گی تب تک سانس بھی چلتا رہے گا۔ اگر خدانخواستہ یہاں اسلام کے نفاذ کی آس بھی ختم ہو گئی اور عوامی سطح پر اسلامی نظام سے مایوسی اور بددلی پیدا ہو گئی تو پھر ہماری عاقبت کی بربادی اور تباہی تو ہے ہی' اس ملک کی بربادی اور تباہی بھی یقینی ہے۔ لہٰذا میرے اور میری جماعت کے لیے ضروری ہے کہ واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیں کہ ہم نہ کسی کے سیاسی حلیف ہیں اور نہ کسی کے سیاسی حریف۔ جو عمل یہاں چل رہا ہے یا جلد یا بدیر کھلم کھلا چلنے والا ہے' اس میں ہم کسی نوع کا حصہ نہیں لیں گے۔ البتہ ان شرائط کے ساتھ ووٹ دیں گے جن کا ذکر مَیں کر چکا ہوں۔

اگر لوگوں میں سیاسی شعور ہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنے حقوق حاصل کر لیں گے' لیکن اللہ کے لیے اسلام کے نام کو اس طرح اور اس طرزِ عمل کے ساتھ استعمال نہ کیجیے کہ جو اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ وہ روش ہے جو عوام کو اسلامی نظام سے بالکل بدگمان' بدظن اور مایوس کر دے گی۔ اس سے ان خطروں کے لیے فضا ہموار ہو جائے گی جو ہماری سرحدوں پر منڈلا رہے ہیں۔ ایک طرف سرخ سامراجی سیلاب ہے جو افغانستان پر فوج کشی کے نتیجے میں ہماری مغربی سرحدوں میں درۂ خیبر تک پہنچ گیا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً آتے ہیں' بمباری کر کے چلے جاتے ہیں اور ہم ان کے ناظم الامور کو بلا کر اپنا ایک احتجاج رجسٹر کرانے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہے۔ اسی طرح ہندوستان سے ملنے والی ہماری سرحدوں پر برہمنی سامراج تاک لگائے بیٹھا ہے جس نے آج تک ذہناً پاکستان کا قیام قبول نہیں کیا۔

دوسرا خطرہ ہے وہ لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا ہے' خاص طور پر سندھ اس کا بہت بڑا مرکز ہے۔ صوبہ سرحد کا معاملہ اب اتنا تشویش ناک نہیں رہا ہے۔ بلوچستان کا مسئلہ بھی اس وقت اتنا خطرناک نہیں ہے۔ ایک تو وہاں کی آبادی بہت کم ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں کوئی مڈل کلاس نہیں ہے جو علاقائی تحریکوں سے متاثر ہوتی ہے اور اس میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ وہاں یا تو بہت غریب لوگ ہیں یا اونچے اونچے قبائلی سردار ہیں۔ تیسرے یہ کہ

وہاں سرداروں کا اثر کچھ کم ہو گیا ہے۔ چوتھے یہ کہ سابقہ حکومت کے دور میں بلوچستان میں ترقیات کا جو عمل شروع ہوا تھا' موجودہ حکومت کے دور میں بہت آگے بڑھ کر یہ کام ہوا ہے۔ سماجی بہبود' معاشی اصلاحات' ترقیاتی سکیموں پر مناسب منصوبہ بندی اور توجہ کے ساتھ کام ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے وہاں ایک عام آدمی کے لیے روزگار کی فراہمی کا میدان کافی وسیع ہو گیا ہے۔ بیشتر افراد مصروف ہو گئے ہیں' لہٰذا وہاں پہاڑوں پر چڑھنے کا اب اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا بہت سا کریڈٹ موجودہ حکومت کو جاتا ہے' جس کی ہمیں تحسین کرنی چاہیے۔ وہاں اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ باہر سے ہے' اندر سے نہیں۔ البتہ سندھ اس وقت ایک بہت بڑا آتش فشاں بنا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ وہ کسی حد تک پھٹ کر سامنے آ چکا ہے۔ اُس وقت معاملہ لوئر سندھ تک محدود رہا تھا' اپر سندھ تک نہیں آیا تھا۔ اب اگر خدانخواستہ اَپر سندھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو بہت خطرناک، اور خوف ناک صورت بن سکتی ہے۔ لوئر سندھ میں ہماری لائف لائن سرحد کے قریب نہیں ہے۔ یہ اَپر سندھ ہے جس میں لائف لائن بھارت کی سرحد کے بہت قریب ہے۔ اندرا گاندھی بھارت میں جس تیزی سے آمریت کی طرف جا رہی ہے' اس کے عزائم کو سامنے رکھیے تو خارجی خطرات ہماری سرحدوں پر منڈلا رہے ہیں۔ ایسی نازک صورت حال میں اگر کوئی داخلی دھماکا ہو گیا تو پھر نتائج خوف ناک نکل سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہاں کے عوام بھی نام نہاد اسلامی نظام سے مایوس اور بددل ہو چکے ہوں اور اگر وہ حوصلہ ہار بیٹھیں تو کتنی تباہ کن صورتِ حال سے سابقہ پیش آ سکتا ہے' اس کا تصور کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینے سے صحرا میں طوفان ٹل نہیں جاتے۔ اگر عوام میں کوئی مضبوط تحریک مزاحمت پروان چڑھ سکتی ہے تو وہ اسلام کے نام پر ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے عوام کو اسلام سے بدظن' بددل اور مایوس کر کے اس کی بنیاد بھی ختم کر دی تو ہمارے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جائے گا۔

میرے پیشِ نظر نہ کسی کی شخصی مخالفت اور نہ کسی کے جماعتی حلیف، ہونے کا کوئی تعلق ہے۔ میرے سامنے وہ حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) نصح کہتے ہیں

خلوص کو۔ یہ کسی بڑی شخصیت کے ساتھ ہو گا تو اسے وفاداری کہیں گے‘ برابر کے لوگوں کے ساتھ ہو گا تو اسے خیر خواہی کہیں گے۔ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا: لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ اے اللہ کے رسولؐ! کس کی وفاداری؟ کس کی خیر خواہی؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ)) وفاداری اللہ کے ساتھ‘ وفاداری اُس کی کتاب کے ساتھ اور وفاداری اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ۔ آگے فرمایا: ((وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) اور خیر خواہی کا تعلق مسلمانوں کے اماموں کے ساتھ۔ جو بھی اولوالامر ہیں‘ جن کے ہاتھ میں بھی زمام کار ہے‘ ان کی بھی خیر خواہی۔ ان کو بھی صحیح بات بروقت بتاؤ۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ سے اس بات پر بھی بیعت کی تھی کہ اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ ”یہ کہ ہم حق کہتے رہیں گے۔ أَيْنَ مَا كُنَّا ”جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہم ہوں۔“ ((لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) ”اللہ کے معاملے میں ہمیں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے نہ کوئی خوف ہو گا نہ اندیشہ ہو گا۔“ چنانچہ یہ خیر خواہی لیڈروں کے ساتھ بھی‘ حکمرانوں کے ساتھ بھی اور عامۃ الناس کے ساتھ بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ اس ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ نصائح کا حکم دیا۔ ان میں سے پہلی تین کا تعلق اللہ‘ اُس کی کتاب اور اُس کے رسول ﷺ سے وفاداری کے ساتھ ہے جبکہ بعد کی دو کا تعلق مسلمانوں کے ائمہ اور عامۃ الناس کی خیر خواہی کے ساتھ ہے۔

میں نے آغاز میں سورۃ الحج کی تین آیات تلاوت کی تھیں۔ اس میں آخری آیت یہ تھی:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ؀﴾

”یہ (اہل ایمان) وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے‘ زکوٰۃ دیں گے‘ نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے۔ اور انجام کار کے طور پر تمام معاملات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔“

آج کل اس آیت کا اقامتِ صلوٰۃ کے نظام کے ساتھ سرکاری طور پر کافی شہرہ

ہے۔ اس کا جو رُخ میرے سامنے ہے' وہ مَیں نے آپ کے سامنے رکھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس میں تقدیم وتاخیر کیوں ہے؟ اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف سے صرف اعراض ہی نہیں' اس کے برعکس رُخ کیوں ہے؟ ہمیں سیرت مطہرہ ﷺ سے معلوم ہے کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' (صَلَّى اللّٰه علیہ وسلَّم ورضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکن عطا فرمایا تھا تو پہلے ہی دن سے سیدھی منزل کی طرف پیش قدمی ہوتی چلی گئی تھی۔ سب سے پہلا کام ''اَقَامُوا الصَّلٰوةَ'' کا کیا گیا ہے۔ اگر قُبا میں چند دن قیام فرمایا ہے تو مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ جب مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر کا کام شروع کیا ہے۔ اقامتِ جمعہ کا نظام حضور ﷺ نے قائم کیا ہے۔ پھر ایتائے زکوٰة کی باری آئی۔ یہ کام یہاں پر اسی ترتیب کے ساتھ کیوں نہیں ہو رہا؟ ترجیحات میں تغیر وتبدل کیوں ہے؟ صرف سطح پر اور ظاہری طور پر کوئی کام کر کے اصل حقیقت کو نہ بدلنے کا طرزِ عمل کیوں ہے؟ اس کا جواب مجھے اسی آیت مبارکہ سے ملا ہے' جسے آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل وہ لوگ سخت ترین مصیبتیں جھیل کر' مصائب برداشت کر کے' آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر' جان اور مال کی قربانیاں دے کر تختِ حکومت پر آئے تھے۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ جنہوںؐ نے طائف کی گلیوں میں اپنے جسم اطہر پر پتھر اؤ جھیلا تھا' جنہوںؐ نے شعب ابی طالب میں تین برس تک محصور رہ کر شدید فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کی تھی۔ یہ وہ صحابہ کرامؓ ہیں جو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے تھے۔

ان بھٹیوں سے گزر کر جو لوگ آئے ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کو تمکن فی الارض عطا کرے' پھر وہ اسلام نافذ کریں تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کوئی شخص یا کوئی گروہ اپنی تمام مراعات کے ساتھ مسندِ اقتدار پر اچانک' حالات سے فائدہ اٹھا کر متمکن ہو جائے تو یہ وہ لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾۔ یہ الفاظ آئے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ ؓ کے لیے۔ اسی لیے اس سے پہلے فرمایا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ

يُقْتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے‘ ان کو جور وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پھر ان لوگوں کے متعلق اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ یہ وہ لوگ تھے جو ناحق اپنے گھروں سے بے دخل کر دیئے گئے تھے اور جو اپنے اہل وعیال اور مال ومتاع کو صرف اللہ کے دین کے لیے چھوڑ کر آئے تھے۔ انہوں نے دین کے لیے مصائب جھیلے تھے۔ پس اگر کوئی گروہ‘ کوئی جماعت ان شدید مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر‘ آزمائشوں کے الاؤ میں سے گزر کر آئے تو پھر یقیناً اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر وہ مصلحتوں کو نہیں دیکھے گا۔ پھر وہ ان اندیشوں میں مبتلا نہیں ہوگا کہ یہ کروں گا تو وہ ہو جائے گا اور وہ کروں گا تو یہ ہو جائے گا۔ اس اقدام سے وہ ناراض ہو جائے گا اور اس سے یہ ناراض ہو جائے گا جبکہ مجھے تو بہرحال سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ ؏ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس پاکیزہ ماحول کی چیزوں کو اس بگڑے ہوئے ماحول پر apply کر دینا درحقیقت دین حق کو بدنام کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے‘ آپ کو اور موجودہ حکومت کو بچائے!

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

***

قصاص و دیت کا مسودۂ قانون

* خطاب جمعہ، مسجد دارالسلام (۲۴ اگست ۱۹۸۴ء)
* ''میثاق'' نومبر ۱۹۸۴ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی اَفْضَلِھِمْ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ الْاَمِیْنِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ :

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ : وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَۃً وَّجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ، وَذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! کَاَنَّھَا مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ: اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ، وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ، فَاِنَّہٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرَی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا، فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ، تَمَسَّکُوْا بِھَا، وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ، وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ

(اخرجه ابوداؤد والترمذی وابن ماجه واحمد باختلاف یسیر)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

گزشتہ جمعہ میں، میں نے اپنے ان بعض مشاہدات کا ذکر کیا تھا جو ایک طویل سفر سے واپسی پر مجھے وطن عزیز میں ہوئے تھے اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات اور احساسات قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے رکھے تھے۔ انہی میں ایک مسئلہ قصاص و دیت کے مسودہ قانون سے متعلق ہے جس کے بارے میں ایک controversy ہمارے ملک میں عرصۂ دراز سے چل رہی تھی۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ اس دوران اس مناقشہ میں

بہت شدت پیدا ہوئی۔ ایک خاص نقطۂ نظر کے حق میں خواتین کی بعض تنظیموں کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالے گئے اور جلسے کیے گئے۔ اخبارات میں کثرت سے مضامین' بیانات اور مراسلات شائع ہوئے۔ جواباً دوسرے نقطۂ نظر کی جانب سے بھی جلسے ہوئے اور اخبارات' خاص طور پر دینی رسائل میں اپنی رائے کا اسلامی نقطۂ نظر سے مدلّل اظہار رائے کیا گیا۔ اس سے پہلے ہمارے معاشرے میں ''روشن خیال'' خواتین کی طرف سے قانونِ شہادت کی ایک شق کے بارے میں بحث و تمحیص اور مخالفانہ آرا کا اظہار اخباری بیانات' مراسلات' مضامین کے ذریعے ہوتا رہا جبکہ احتجاجی جلسوں' جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا تھا۔ اس کے ضمن میں بہت سے احباب کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہوگا اور بعض حضرات نے مختلف مواقع پر مجھ سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا۔ وہ یہ کہ میں ان موضوعات و معاملات میں کیوں خاموش رہا ہوں اور میں نے ان مسائل پر اپنی کسی تفصیلی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا! حالانکہ ایک خاص اعتبار سے لوگوں کو توقع تھی کہ شاید ان معاملات میں سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ میری طرف سے اظہارِ خیال ہوگا۔ ایسے معاملات میں نقطۂ نظر کا جو بنیادی اختلاف کارفرما ہے وہ مردوں اور عورتوں کے مابین کامل مساوات کا نظریہ ہے جو مغرب کی جدید فکر' فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی نظریے سے مرعوب و مسحور ہمارے معاشرے میں ایک فعال طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ عددی اعتبار سے یقیناً ایک چھوٹی اقلیت ہے' لیکن بہرحال متحرک ہے۔ وہ مساواتِ مرد و زن کے نظریے پر پورا ایمان رکھتی ہے اور وہی اقلیت ہے جو ایسے تمام مسائل میں جہاں ان کے نظریے کے مطابق عورت کا درجہ کسی نوعیت سے مرد کی برابری کا نہ ہو' سراپا احتجاج بن جاتی ہے۔ پھر اسی اقلیت کے بیشتر افراد چونکہ یا تو حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہیں یا بڑی بڑی صنعتوں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس طبقے کے احتجاج' خاص طور پر اس کی خواتین کے احتجاج' مخالفانہ بیانات' مراسلات اور مضامین کو ہمارے ذرائع ابلاغ بڑی نمایاں حیثیت سے کوریج دیتے ہیں۔ ان کی تشہیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے موضوعات

معاشرے میں ایک شدید ردّ و قدح اور بحث و مباحثے کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔

یہ مساواتِ مرد و زن کا جو اصل مسئلہ ہے' اس کے ضمن میں آج سے قریباً دو سال قبل جو سب سے بڑی controversy زور شور سے اٹھی تھی وہ میرے ہی حوالے سے شروع ہوئی تھی' یعنی ستر و حجاب اور عورت کے جُداگانہ دائرہ کار کا مسئلہ۔ اگرچہ وہ مسئلہ مَیں نے اپنے کسی شعوری ارادے' فیصلے یا اپنی کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شروع نہیں کیا تھا بلکہ ایک نیم دوستانہ اور نیم صحافیانہ گفتگو تھی جس کی رپورٹنگ ہوئی اور اس کے حوالے سے ہمارے ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ تاہم جب یہ مسئلہ چھڑ گیا اور سوال اُٹھ کھڑا ہوا تو اس مسئلہ پر مَیں اسلام کا جو نقطۂ نظر سمجھتا ہوں اور ہمارے دین کی جو تعلیمات ہیں' مَیں نے اُن کو بھرپور انداز اور پوری قوت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ چنانچہ مساواتِ مرد و زن کے مسئلے کے بارے میں controversy کے اُس دور میں ''روشن خیال'' طبقے کے نزدیک نمایاں ترین اور متنازعہ ترین شخص مَیں بن گیا تھا۔ البتہ جب اُسی مساواتِ مرد و زن کے مسئلہ کا ان دو اعتبارات یعنی قانونِ شہادت کی ایک شق اور مسودّہ قانونِ قصاص و دیت کے حوالے سے مزید ظہور ہوا تو اس پر میں خاموش رہا۔ یقیناً یہ ایک سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا ہو گا اور بعض حضرات نے اس کے بارے میں مجھ سے باضابطہ استفسار بھی کیا۔ میری اس خاموشی کا جو سبب ہے' پہلے میں اُسے بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ پھر قصاص و دیت کے مسئلہ پر اپنی رائے پیش کر دوں گا جو ان شاء اللہ کتاب و سنت پر مبنی ہو گی۔

ہمارے معاشرے کی اصل کمزوری

اصل سبب یہ ہے کہ میری تشخیص کے مطابق ہمارے معاشرے میں جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ہیں' بحیثیتِ مجموعی مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا داعیہ اور ارادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ کسی فرد میں' کسی قوم میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اُسے مسلمان جینا ہے' مسلمان مرنا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو اب خود اُس کی طرف سے یہ بات بالکل معروضی انداز میں پوچھی جائے گی' تلاش کی جائے گی کہ اسلام کیا

کہتا ہے! میں مسلمان رہنا چاہتا ہوں' مسلمان مرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کیا ہے! اللہ کا حکم کیا ہے! اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم کیا ہے! ہمارے ائمہ عظام جنہوں نے اسلام کو سمجھنے میں اپنی پوری زندگیاں کھپا دی ہیں' انہوں نے فلاں مسئلہ میں کیا رائے ظاہر کی ہے! اس وقت ایسے شخص کا رویہ ہوگا اتباع کا۔ اس کے اندر ایک جذبہ ہوگا اطاعت کا۔ ایسا شخص کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کرے گا تو اس لیے کہ اس کے اپنے اندر ایک داعیہ پیدا ہو چکا ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے تاکہ وہ اس پر چلے۔ اُسے معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کیا ہے تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ تبدیل کرے۔ اُسے معلوم ہو کہ اہل علم کا کیا کہنا ہے تاکہ وہ اس کے مطابق عمل کرے۔ یہ رویہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انفرادی یا اجتماعی سطح پر یہ ارادہ وجود میں آ چکا ہو۔ اگر یہ ارادہ موجود نہ ہو تو مختلف مسائل کے بارے میں یہ ساری بحثیں کہ قرآن کیا کہتا ہے' رسولؐ کی سنت کیا ہے' امام ابوحنیفہؒ کا قول کیا ہے' امام شافعیؒ کی رائے کیا ہے' امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا موقف کیا ہے' خلفائے اربعہؓ کا تعامل کیا ہے' تابعین و تبع تابعین کا مسلک کیا ہے' محض علمی بن کر رہ جاتی ہیں جن کی عملی اعتبار سے کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی زبانی کلامی مدح سرائی کے سوا عملی اعتبار سے اس کے حق میں وہ collective will کہ ہمیں مسلمان جینا ہے' مسلمان مرنا ہے' موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جو فی الواقع درپیش ہے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ایک اجتماعی ارادے کو پیدا کیا جائے۔ The will to be a Muslim۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو اب شریعت کے تمام احکام کو ذہناً بالکلیہ قبول کرنا اور ان پر عمل کرنے کی پیہم اور مخلصانہ سعی و کوشش کرنا بڑا آسان ہو جائے گا۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے اعتبار سے جو حکمتِ دین ہے' اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ابتداء میں حلال و حرام کے احکام نہیں دیے گئے۔ بارہ تیرہ برس جو مکہ مکرمہ کے ہیں' ان میں اس ارادے کو تقویت دی گئی۔ اللہ کی

توحید پر، رسولؐ کی رسالت پر اور وقوعِ قیامت و آخرت پر ایمان پیدا کیا گیا، یقین پیدا کیا گیا۔ اس ایمان و ایقان کے نتیجے میں اِرادہ اُبھر کر سامنے آیا اور عمل کا ایک شدید داعیہ اہل ایمان کے قلوب میں موجزن ہو گیا۔ گویا کہ ایک strongest collective will وجود میں آ گئی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد جب اہل ایمان کا اپنا ایک معاشرہ وجود میں آ گیا تو وہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایمان کے مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کی شدید طلب اور پیاس پیدا ہو گئی۔ ایک urge پوری قوت سے اُبھر آئی۔ لہٰذا مدنی سورتوں میں سب سے پہلی اور سب سے طویل سورت سورۃ البقرہ میں کئی جگہ بہت سے احکام کا ذکر اس طرح ملتا ہے کہ ''یَسْـَٔلُوْنَكَ'' اے نبیؐ یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ جیسے ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''اے نبیؐ! یہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں۔'' ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۱۵) ''اے نبیؐ یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں!'' ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ﴾ (المائدۃ:۴) ''اے نبیؐ! یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں ان کے لیے حلال ہیں!'' معلوم ہوا کہ جب وہ collective will پیدا ہو گئی تو خود بخود سوال پیدا ہوئے اور پوچھا گیا کہ زندگی کے مختلف معاملات اور مقتضیات میں ہم کیا کریں! کون سا رویہ اختیار کریں! یہ داعیہ اتنی شدت سے اُبھرا کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے کے بارے میں جستجو اور اصرار پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد احکام دیے گئے اور معاشرہ چونکہ پہلے سے تیار تھا، وہ قبول کرتا چلا گیا اور یوں احکام کی تنفیذ ہوتی چلی گئی۔ اُس معاشرے میں یہ بات قطعی نظر نہیں آتی کہ کسی مسئلہ میں کوئی controversy پیدا ہو گئی ہو۔ سوائے سود کی حرمت کے حکم کے، اور کسی حکم کے متعلق یہ بات بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی عقلی دلیل طلب کی گئی ہو۔ سود کی حرمت کے حکم پر یہ عقلی اعتراض وارد کیا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵)۔ بیع میں بھی تو کچھ منفعت ہو جاتی ہے، کچھ نفع ہو جاتا ہے۔ سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دی یا سو

روپے کسی کو قرض دے کر اس سے ایک سود بھی لے لیے تو آخر اس میں فرق کیا ہے! اس کے سوا ہمیں نظر نہیں آتا کہ عقلی استدلالات یا اشکالات پیش کیے گئے ہوں اور بحث و تمحیص کے دروازے کھل گئے ہوں۔ موجودہ دور میں جس طریقے سے ''دانشوروں'' اور علماء کے مابین دینی مسائل کے بارے میں بڑی ہی رنگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ رنگارنگ اختلافی مضامین چھپتے اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں اس قبیل کی کسی شے کا اُس دور میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ پہلے وہ will پیدا کر دی گئی وہ ارادہ پیدا کر دیا گیا تھا جس کے بعد جو بھی احکام دیئے گئے تو ''سرتسلیم خم ہے'' والا رویہ اختیار کیا گیا۔ ان کو اس طور سے قبول کیا گیا کہ جیسے وہ پہلے ہی سے منتظر تھے کہ حکم آئے اور وہ فوراً اس پر عمل شروع کر دیں۔

خدا نا آشنا تہذیب سے مرعوبیت

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اجتماعی سطح پر وہ collective will موجود نہیں ہے۔ ہے بھی تو وہ بہت مضمحل ہے۔ اس کی وجہ کو بھی سمجھ لیجیے۔ یہ اصل میں مغرب و مشرق کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ وہ جدید خدا نا آشنا تہذیب اور فکر جو یورپ سے آیا تھا' اس کی تاریخ قریباً دو سو برس پرانی ہے۔ جیسے ہی انگریز قوم کا برصغیر پاک و ہند پر پورا تسلط قائم ہو گیا اور یہ ملک براہِ راست اس کی سیاسی غلامی میں چلا گیا' ویسے ہی تصادم شروع ہو گیا۔ یہ ایک بالکل نئی تہذیب آئی تھی' مادّہ پرستانہ تہذیب۔ اس میں چمک دمک تھی۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی\
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ہمارے یہاں ایک خاص طبقے نے اس تہذیب پر لبیک کہا اور اُسے اختیار کیا۔ یہ بھی بلاسبب نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حکمران قوم کی تہذیب تھی۔ محکوم قوموں میں حاکم قوم سے مرعوبیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے ایک طبقے نے اِس تہذیب کو' اس کے اصول کو' اس کے مظاہر کو' اور اس کے فکر و فلسفہ کو ایک سہمی ہوئی اور خوف زدہ ذہنیت کے

ساتھ قبول کرنا شروع کیا۔ پھر یہ مظہر (phenomenon) مشترک طور پر ہر محکوم قوم میں نظر آئے گا کہ اس میں سے جو طبقہ حکمران قوم کی تہذیب کو آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے' اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگنے اور اُسی سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتا ہے تو وہ طبقہ حاکم قوم کے قریب ہوجاتا ہے۔ اس سے مفادات حاصل کرتا ہے۔ اس کی حکومت کی مشین میں پرزہ بنتا ہے۔ اس سے وفاداری کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سے خطابات حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت دنیوی ترقی کے لیے یہی راستہ سب سے زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طبقے کے لیے معیشت کے دروازے کشادہ ہوتے چلے جاتے ہیں جبکہ جولوگ قریب نہیں آئیں گے وہ معاشی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جائیں گے اوران کا سوشل سٹیٹس بھی کم رہ جائے گا۔

نتیجۃً ہمارے یہاں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے آپ کو بالکلیہ انگریزی تہذیب میں رنگ لیا۔ سر سید احمد خاں کے قول کے مطابق اس طبقہ کا طرزِ عمل یہ ہوگیا کہ چمڑی کی رنگت کے سوا ہمیں ہر اعتبار سے ''انگریز'' بن جانا ہے۔ یہ گویا کہ objective تھا جو اس دور میں دیا گیا۔ چمڑی تو اختیار سے باہر کی شے ہے' اُسے بدلا نہیں جاسکتا۔ یہ اگرچہ ایک محدود طبقہ تھا' بالکل اقلیت میں تھا' لیکن چونکہ یہی حکمران طاقت کے قریب تر ہوتا چلا گیا' لہٰذا اس کا نفوذ اور اثر ہمارے معاشرے میں مسلسل بڑھتا چلا گیا۔

البتہ آج مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ایک خاص بات نوٹ کرلیں۔ وہ یہ کہ ہمارے معاشرے پر مغربی تہذیب کا بحیثیت مجموعی عمل دخل انگریزی کی براہِ راست سیاسی غلامی کے دور میں اتنا نہیں ہوا جتنا کہ آزادی کے بعد ہوا ہے۔ یہ جو سینتیس برس ہم نے آزادی کے بتائے ہیں' ان میں یہ عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ بہت وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ پہلے صورت حال یہ تھی کہ وہ جو ایک محدود طبقہ تھا جس کا انگریزی حکومت سے بڑا قریبی تعلق تھا' ہمارے عوام ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عوام الناس کو اس طبقے سے عموماً نفرت تھی۔ دوسرے یہ کہ محکوم قوم کے جذبات حکمران قوم کے لیے خیر سگالی اور پسندیدگی کے نہیں ہوا کرتے۔ مزید برآں عالم اسلام کو انگریزی حکومت سے جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے بھی

بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے اندر انگریز اور انگریزی تہذیب سے واضح نفرت برقرار رہی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اُس وقت اس جدید تہذیب کے ساتھ کوئی close contact نہیں تھا۔ اس وقت آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع اتنے آسان نہیں تھے۔ معدودے چند لوگ ہوتے تھے جو ولایت جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ واپس آتے تھے تو مغربی تہذیب میں پورے رنگے رنگائے۔ البتہ تعداد کے اعتبار سے وہ اتنے کم ہوتے تھے کہ اگر مجموعی لحاظ سے ہم جائزہ لیں تو اُس دور میں ان کا معاشرے پر بہت کم اثر تھا۔ عوام الناس ان کو طنزیہ انداز میں پھبتی کے طور پر ''لندن پلٹ'' کہا کرتے تھے۔

یہ معاملہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے بعد ہوا ہے کہ ایک طرف تو ہمارے حکمران اگرچہ ہم میں سے ہی ہیں لیکن وہ کلیۃً اُسی تہذیب کے پروردہ ہیں' اسی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اسی کو انہوں نے عملاً اختیار کیے رکھا ہے۔ ہمارے سرکاری محکمہ جات کے عمال یعنی بیوروکریسی اور ہماری ملٹری کی ٹاپ کلاس' یہ سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ یہی اونچا طبقہ بہت سے اعتبارات سے ہمارے یہاں انگریز کا وارث بنا ہے۔ ان میں sir رہے ہیں۔ اب ان کی اولاد ہے۔ خان صاحبوں اور خان بہادروں کی نسل بھی چل رہی ہے۔ ان سب کی اکثریت اُسی انگریزی تہذیب کے رنگ میں مزید رنگ گئی ہے جو ان کے آباء و اجداد نے اختیار کی تھی۔ اُس وقت انگریزی تہذیب کے فروغ اور اثر و نفوذ میں کم از کم وہ نفرت روک اور آڑ بنی ہوئی تھی جو حاکم اور محکوم قوم کے مابین طبعاً موجود ہوتی ہے۔ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی۔ نفرت کا وہ barrier بھی راستہ سے ہٹ گیا۔ اب تو وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے افراد ہیں۔ ان میں سے کوئی سید زادہ ہے' چاہے وہ فکری اور عملی اعتبار سے سرتاپا مغربی تہذیب میں غرق ہو چکا ہو' لیکن بہرحال نسلی اعتبار سے وہ سید ہے۔ کوئی ہے جو خلفائے راشدینؓ یا دیگر اصحابِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام و رضوان اللہ علیہم اور اہل بیت رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی اور خاندانوں سے خود کو منسوب کرتا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ صدیقی' فاروقی' عثمانی' علوی' حسنی' حسینی' زیدی' جعفری وغیرہم کے لاحقے ہوتے ہیں لیکن فکر و عمل

کے اعتبار سے نام کے سوا اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا' اِلا ماشاء اللہ۔ یہ لوگ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے عملاً بھی داعی اور نقیب ہوتے ہیں اور قولاً بھی۔ پھر اسی طبقے سے عموماً وہ لوگ ابھرتے ہیں جو ہمارے یہاں ''دانشور'' کہلاتے ہیں۔ اس طرح حاکم قوم کی تہذیب اور اس کی فکر سے محکوم قوم کو جو طبعاً نفرت ہوتی ہے' وہ barrier اب ہمارے معاشرے میں سرے سے موجود نہیں ہے۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے محکمہ جات کے جو وارث بنے ہیں ان کا معاملہ وہ ہے جو ہمارے یہاں بطور محاورہ کہا جاتا ہے کہ ''شاہ سے بڑھ کر شاہ کا خیر خواہ''۔ یہ طبقہ انگریزی دور میں انگریز سے بڑھ کر مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا جبکہ آزادی کے بعد اس میں کوئی کمی یا اصلاح کے عمل کے بجائے وہ اور ان کی اولاد اِسی میں پختہ تر ہوتی چلی گئی' اِلا ماشاء اللہ۔

دوسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع رسل و رسائل آسان ہو گئے' آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو گئی۔ آزادی کے بعد سے ہمارے لوگ کثیر تعداد میں یورپ اور امریکہ گئے اور وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں تو وہاں کے افکار اور تہذیبی اقدار کے جراثیم بھی ساتھ لے کر آئے۔ ظاہر بات ہے کہ ان حضرات کے بود و باش' وضع قطع اور خیالات و رجحانات' میلانات و تاثرات کا اثر ہمارے معاشرے پر پڑنا ہی تھا۔ لہٰذا اصل تصادم اِس وقت ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم مغرب کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں لیکن مغربی افکار اور اس کی تہذیبی اقدار کا غلبہ اِس وقت زیادہ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے اثرات اب زیادہ نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے اب وہ تصادم مزید گہرا اور شدید ہو گیا ہے۔

تیسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع ابلاغ (media) نے نہایت وسعت حاصل کر لی۔ پہلے اگر کوئی روزنامہ' ماہنامہ یا ہفت روزہ دس پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا تو وہ کثیر الاشاعت کہلاتا تھا۔ اب اخبارات و رسائل لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ بعض ایک ہی وقت میں کئی شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ ڈائجسٹوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کے ناموں کا شمار اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ اُن پر بھی مغربی تہذیب و افکار سے مرعوب ذہنیت رکھنے والوں کی اکثریت

قابض ہے۔ پھر اخبارات و رسائل کی اشاعت اب باقاعدہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ ان کے مابین مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا ہر ایک اس کوشش میں مصروف نظر آتا ہے کہ عوام الناس کو لذت کوشی اور اباحیت پسندی میں مزید مبتلا کر کے زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرے۔ ان کی بلا سے کہ ہماری قوم میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو ضعف پہنچتا ہے تو پہنچا کرے' وہ مزید مضمحل ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ بلکہ یہ بات منفعت کے لحاظ سے ان کے لیے مفید ہے۔ لہٰذا ان کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے کہ قوم کس پستی میں گر رہی ہے۔ یہی حال اُن ذرائع ابلاغ کا ہے جو مکمل طور پر حکومت کے زیر انصرام و انتظام ہیں' یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ ان میں ڈراموں' راگ اور موسیقی اور اسی قبیل کے تفریحی پروگراموں کی پذیرائی ہوتی ہے جو sugar coated طریق پر معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو ضعف پہنچا رہے ہیں۔ رہی سہی کسر وہ اشتہارات پوری کر دیتے ہیں جو کثرت کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔ مذہبی پروگرام برائے بیت ہوتے ہیں اور محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ٹی وی نشریات میں اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے مختص ہیں۔ ایسے دینی پروگراموں کی رسائی مشکل ہے جن سے قوم میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا اجتماعی داعیہ پیدا ہو۔ پھر ان ذرائع ابلاغ پر hold اسی طبقے کی اکثریت کا ہے جن کے اذہان وقلوب پر خدا نا آشنا مغربی افکار اور تہذیب کی بالادستی نقش و ثبت ہے۔

یہ ہیں وہ اسباب اور یہ ہے اطراف و جوانب سے ہمارے معاشرے پر یلغار جس کی وجہ سے اجتماعی سطح پر collective will to be a Muslim پہلے کے مقابلے میں کمزور ہو چکی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ فی الوقت ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب' مغربی اقدار' مغربی تمدن' مغربی بود و باش اور مغربی طرزِ فکر کی زیادہ گرفت میں ہے اس کی بہ نسبت جب کہ آج سے چالیس برس قبل ایک مغربی قوم ہم پر براہِ راست حکمرانی کر رہی تھی۔

جب تک وہ اجتماعی ارادہ پیدا نہیں ہو جائے گا' یہ بحثیں محض علمی رہیں گی۔ لہٰذا، controversy کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔

اجتماعی ارادے میں تبدیلی

اب یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس collective will کو اسلام کی طرف لانے کا طریقہ کیا ہے! دوسرے یہ کہ اس کا ظہور کس طور سے ہوتا ہے! یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں collective will اسلام کے حق میں پیدا ہو چکی ہے۔ نظری طور پر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتخابات کا عمل کسی ملک میں جاری ہو اور صحیح نہج پر جاری ہو۔ یہ نہ ہو کہ جس طرح گاڑی knocking کرتی ہو' قدم قدم پر رکتی ہو' ایک انتخاب ہو یا ہونے والا ہو تو ایک ہنگامہ بپا ہو جائے جس کے نتیجے میں فوج ٹیک اُوور کر لے۔ پھر کسی نئے اسلوب اور نئے اصولوں پر انتخابات کا ڈھونگ رچایا جائے اور پھر اس کی وجہ سے کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو۔ پہلے کی جگہ دوسرا مارشل لاء آ جائے اور فوج کو تسلسل یا وقفے وقفے سے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا موقع اور جواز ملتا رہے۔ ایسا نہیں۔ اگر کسی ملک میں واقعتاً انتخابی عمل مسلسل جاری رہے تو اس کے ذریعے بھی collective will کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا چلا جائے گا کہ لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! وہ کیا چاہتے ہیں! میرے نزدیک نظری طور پر یہ بھی ایک طریقہ ہے لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ یہاں کے موجودہ حالات میں یہ طریقہ قریباً ایک ناممکن العمل معاملہ بن گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرا طریقہ وہ ہے جسے آج کل ''انقلاب'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ میری عدم موجودگی میں لاہور کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں بڑی آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ ایک کانفرنس ہوئی ہے۔ اگرچہ تا حال پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس نے منعقد کی تھی' اس کے داعی کون لوگ تھے لیکن اس کانفرنس میں بڑی دھواں دھار تقاریر ہوئی ہیں کہ یہاں ایران کی طرح کا انقلاب آنا چاہیے اور ہمیں اس میدان میں ایران کی قیادت کو قبول کر لینا چاہیے۔ کسی معاشرے کی collective will کے ظہور کا دوسرا طریقہ یقیناً انقلابی ہے' لیکن انقلابی طریقہ سے مراد کیا ہے! وہ یہ کہ اگرچہ ایک نقطۂ نظر اور آئیڈیالوجی کے حامل اور قائل لوگ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوں لیکن وہ دعوت و تبلیغ سے' اپنے ایثار

سے' اپنی تنظیم سے' مصائب برداشت کر کے ایک موثر اکثریت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ effective majority ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ numerically وہ ایک اقلیت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جدوجہد' اپنے ایثار' اپنی استقامت و مصابرت اور اپنے موقف پر ایمان و ایقان کی طاقت سے کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی پسند کا نظام قائم کر دیتے ہیں۔

اس وقت ہمارے یہاں ان دو میں سے کسی بھی ذریعے سے اسلام کے حق میں collective will کا ظہور نہیں ہوا بلکہ بالفعل صورتِ حال یہ ہے کہ ایک مارشل لاء گورنمنٹ ہے۔ اس کی legitimacy ہی متنازعہ ہے کہ یہ حکومت ہے تو کیوں ہے! آئی تھی تو کس دلیل سے آئی تھی! کس وعدہ کے تحت آئی تھی! سپریم کورٹ نے اسے تسلیم کیا تھا تو کن کڑی شرائط کے ساتھ کیا تھا! کیا کیا حدبندیاں اس پر عائد کی تھیں! اس حکومت نے اپنے تسلسل کے لیے وجہ جواز یہ قرار دی ہے کہ ہم نے اس ملک میں اسلام قائم و نافذ کرنا ہے۔ اس وجہ جواز کو ثابت کرنے کے لیے اس نے کچھ نیم دلانہ قسم کے اقدامات کیے ہیں' جن کی وجہ سے قیل وقال' بحث و مباحثہ' controversies اُبھر آئی ہیں۔ اس کے سوا اسلام کی طرف کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہو رہی۔ نظر تو یہ آ رہا ہے کہ دونوں نظریات کے حاملین کو اطمینان دلایا جا رہا ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور دوسری طرف والوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ آپ مطمئن رہیں' میں کٹر آدمی نہیں ہوں۔ علماء کو تسلی دی جاتی ہے کہ میں یہاں اسلام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھ لو میری نماز' میرا روزہ' ٹوپی مصلے کا میرے ساتھ رہنا۔ میرا پختہ عزم ہے کہ یہاں مضبوط بنیادوں پر اسلام کو نافذ کروں۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو جو اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بھی اکرام کے بہرحال مستحق نہیں ہیں' یہ دلاسا دیا جاتا ہے کہ میں اتنا کٹر نہیں ہوں' آپ کو مجھ سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ان کی جس طرح حکومت کے ایک ایوان میں پذیرائی ہوئی ہے اور صدر مملکت صاحب نے جن کی منصبی مصروفیات کا سب کو علم ہے' ان فن کاروں کے ساتھ تبادلۂ خیال میں اخباری رپورٹ کے مطابق قریباً سات گھنٹے گزارے ہیں' جس گرم جوشی کے ساتھ ملک کی

سب سے مقتدر اور بلند و بالا شخصیت نے اس طائفے کا استقبال کیا ہے' وہ ان لوگوں کے لیے ایک لمحۂ فکر یہ ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس regime کے ہاتھوں پاکستان میں اسلام آ رہا ہے۔

یہ جو تضادات ہیں' دو عملی ہے' دوُر خاپن ہے اور دوطرفہ عمل ہے اُس نے محب دین عناصر میں شدید مایوسی پیدا کر دی ہے۔ مزید یہ کہ اسلام کے ان مسلمات کے بارے میں جو چودہ صدیوں سے مجمع علیہ اور متفق علیہ چلے آ رہے ہیں' ناقابلِ برداشت نوعیت کی controversies کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے باعث ہمارے تعلیم یافتہ طبقے خاص طور پر نئی نسل میں سخت ذہنی انتشار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام کس کو سمجھا جائے! اُسے جو خیر القرون سے نسلاً بعد نسل علمائے حقانی کے توسط سے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے یا اُسے جو آج کل کے نام نہاد جدید مفسرین بالخصوص جدید ''مفسرات'' کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے؟ ان میں چند ہی افراد ایسے ہوں جو قرآن حکیم کی ایک چھوٹی سی سورت کی بھی صحیح طور پر تلاوت کر سکیں' یا ان کو دین کے روزمرہ کے معمولات کی ذرا بھی شد بد ہو۔

نفاذِ اسلام کا موجودہ عمل

اگر بنظر انصاف Islamisation کے اس پراسس کا جائزہ لیا جائے جس کا پانچ چھ سال سے بڑا چرچا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ ہر قدم نیم دلی سے اور انتہائی ناقص انداز میں اٹھایا گیا ہے۔ حدود آرڈیننس کا جو حشر ہوا' وہ کس سے پوشیدہ ہے! کیا سرقہ پر آج تک کسی کو قطع ید کی سزا ملی ہے! کیا ڈاکا زنی کے مجرموں میں سے کسی پر اسلامی حد جاری ہوئی ہے! زکوٰۃ آرڈیننس کے معاملہ پر مَیں گزشتہ تقریر میں اظہار رائے کر چکا ہوں۔ اسلام کے کسی معاملہ میں بھی فیصلہ کن انداز کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اسلام کے قصاص و دیت کے قانون کو مدون کر کے اپنی مکمل رپورٹ اور سفارشات اسلامک آئیڈیالوجی کونسل نے چار سال قبل صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دی تھیں۔ یہ کونسل انہی لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں اس حکومت کے اربابِ حل و عقد نے یہ سمجھ کر نامزد کیا تھا کہ یہ دین کے جاننے

والے' سمجھنے والے ہیں۔ ہمارے یہاں جو مختلف فقہی مسالک یا فرقے ہیں' یہ حضرات ان کے معتمد علیہ نمائندے ہیں۔ پھر علماء کے ساتھ اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک ہی کے نہیں بلکہ دوسرے چند اہم ممالک کے دساتیر اور قوانین سے بخوبی واقف ماہرین کو بھی شامل کیا۔ اس کونسل نے متفقہ طور پر مسوّدہ تیار کر دیا' جسے تمام فقہی مکاتب فکر اور فرقوں کے علماء کی تائید بھی حاصل تھی۔ جدید آئینی ماہرین کی توثیق بھی اُسے حاصل تھی۔ گویا قصاص اور دیت کے مسئلہ میں ایک متفقہ سند حکومت کو حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایک ''شوریٰ'' وجود میں آ گئی تو یہ مسوّدہ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ وہاں اس پر بحث ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہاں تو دینی اور سیکولر دونوں قسم کا ذہن رکھنے والے لوگ جمع ہیں۔ وہ وکلاء بھی ہیں جو اسلام پر پھبتیاں چست کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ پھر وہ علمائے کرام بھی ہیں کہ جن کے فہم دین پر لوگوں کی اکثریت کو اعتماد ہے۔ للہٰذا محسوس ہوا کہ یہاں تو معاملہ آسانی سے نہیں چکے گا تو ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ اس کی رپورٹ آئی تو پھر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کمیٹی کے چیئرمین صاحب پر علماء کی طرف سے شدید الزامات عائد کیے گئے۔ جو علماء اس کمیٹی میں شامل تھے انہوں نے رپورٹ کو پوری طرح disown کر دیا کہ اس میں ہمارے نقطہ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی' جس کی رپورٹ کابینہ میں زیر بحث آئی لیکن وہاں بھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ تا حال معلق ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب اس مسئلہ کے بارے میں عالم اسلام کے علماء سے رائے لینے کے مرحلے تک بات آ گئی ہے۔ یہ سارا عمل غمازی کر رہا ہے کہ اصل میں پختہ ارادہ موجود نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتا تو بہت سے ضروری اسلامی قوانین کو اب تک حقیقی طور پر نافذ ہو جانا چاہیے تھا۔ درحقیقت اصل مسئلہ وہی ہے کہ ان کو بھی راضی رکھنا ہے' اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے۔ یہ بھی ناراض نہ ہوں اور وہ بھی ناراض نہ ہوں۔

اس طرز پر جو بھی کام ہوگا' اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی اور عملی اعتبار سے انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ للہٰذا میں نے اس controversy میں اسی لیے اپنے آپ کو

ملوث نہیں کیا کہ میرے نزدیک اس کا حاصل کچھ نہیں۔ یہ بالکل ایک بے محل بحث ہو رہی ہے۔ یا تو وہ اجتماعی ارادہ موجود ہوتا یا اس کو پیدا کرنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جاتے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی حکومت قائم ہوئی اور انہوں نے نوے دن میں انتخاب کرانے کے بجائے اس عزم کا اعلان کیا کہ ان کی حکومت یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے اپنی تمام قوت صَرف کرے گی۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں اسی شہر لاہور میں ہماری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ مجھے جنرل صاحب کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک دین دار مسلمان ہیں۔ یہ بھی علم تھا کہ وہ ماہنامہ ''میثاق'' کے اس زمانہ سے خریدار ہیں جب وہ ملتان میں جی او سی تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے تفسیر ''تدبر قرآن'' منگائی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا دینی ذوق ہے۔ انہوں نے ہماری قرآن کانفرنس کے لیے پیغام بھی ارسال کیا تھا۔ لہٰذا اُس وقت میں نے عرض کیا تھا کہ ''اب اللہ نے آپ کو اس آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ آپ کے ہاتھ اس ملک کا اختیارِ کلی آ گیا ہے''۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ مختارِ مطلق اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ امریکہ کا صدر بھی اتنا با اختیار نہیں ہے۔ وہ اگرچہ ایک بڑی شخصیت ہوتی ہے لیکن اختیارات کے اعتبار سے اس پر قیود ہیں' پابندیاں ہیں۔ بہت سے امور میں اُسے کانگریس سے منظوری حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اس نے یا اس کی پارٹی کے دوسرے نامزد کو اگلا صدارتی انتخاب لڑنا ہوتا ہے۔ ووٹوں کی بھیک مانگنی ہوتی ہے۔ ان تمام حدود و قیود اور احتیاطوں سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ اُسے ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔

انہی اعتبارات کے پیشِ نظر مَیں نے ان سے عرض کیا تھا کہ ''آپ کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہے۔ اب آپ واقعتاً اس آیت پر عمل کریں: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (الحج: ۴۱) ''وہ لوگ کہ اگر انہیں ہم زمین میں تمکن عطا کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں

گے''۔ پورے کے پورے اسلام کو نافذ کیجیے۔ اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا کہ ایک حصہ نافذ کر دیا' دوسرا نہیں۔ اس میں اپنی priorities بنا لینا اور دین کی ترجیحات کو نظر انداز کر دینا ٹھیک نہیں۔ معاشرے کا رنگ دیکھ کر نفاذِ اسلام میں تدریج اختیار کرنا' اس کا تجزیہ کرنا' اس کے اجزاء کرنا کہ دین کا ایک حصہ اس وقت نافذ کیا جائے اور دوسرے حصوں کو تعویق میں ڈالنا کہ پھر دیکھا جائے گا' یہ طرزِ عمل اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ ذہن میں رکھیے گا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج﴾۔

اب تدریج کے لیے مکی دور سے دلیل نہیں لائی جا سکتی کیونکہ اُس وقت مکمل شریعت موجود نہیں تھی۔ اب وہ دَور دوبارہ نہیں آئے گا۔ قرآن پورا کا پورا ہمارے سامنے ہے' سنتِ رسولؐ ایک روشن آفتاب کی صورت میں موجود ہے۔ ہماری تاریخ تاریک رات کے مانند نہیں ہے بلکہ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا اس کی تو راتیں بھی اتنی روشن ہیں جتنے کہ دن روشن ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعید سے متصلاً بعد خلافت راشدہ کا زریں دور ہے۔ اس کے بعد ائمہ فقہاء اور ائمہ حدیث کا دَور ہے۔ ان سب کو سامنے رکھ کر ہمیں کامل دین کو لینا ہوگا۔ اس کے اجزاء کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ یہود کی اسی روش کے بارے میں ہی فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج﴾ ''کیا تم ہماری کتاب یعنی ہماری شریعت اور ہمارے دین کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے''۔ ﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج﴾ ''پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ روش اختیار کرے گا اس کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اُسے ذلیل و خوار کر دیا جائے۔'' ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط﴾ ''اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔'' اس آیت میں ایک اٹل اصول' ضابطہ اور قاعدہ بیان کر دیا گیا ہے۔ شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مکمل شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا اب تو take it all or leave it all والا معاملہ ہے۔ شریعت لینی ہو گی تو پوری لینی ہو گی ورنہ چھوڑ دیجیے۔ اللہ کو کوئی احتیاج

نہیں ہے' کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے کہ اس کی شریعت میں سے تھوڑی سی چیز مان لی جائے تو اس کا کام چل نکلے گا ورنہ وہ ایسے ہی رہے گا۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! اسی لیے میں نے زور دے کر کہا تھا کہ ''آپ پورا اسلام نافذ کیجیے' اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا۔''

ساتھ ہی مَیں نے صاف صاف یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ یہ کریں گے تو اس وقت معاشرے کی جو مجموعی کیفیت ہے' اُسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ معاشرہ آپ کو اٹھا کر پھینک دے۔ آپ کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ سکتا ہے' لیکن اس کے باوجود اگر آپ یہ کریں گے تو یہ بہت بڑی قربانی ہوگی۔ اللہ کے یہاں بھی آپ ماجور ہوں گے اور تاریخ میں بھی یہ بات ایک کارنامے کے طور پر درج ہوگی۔ اگر ایک انگریز بادشاہ عورت کے لیے برطانیہ کے تاج و تخت کو ٹھوکر مار سکتا ہے تو آج کا کوئی حکمران اگر اس لیے اقتدار سے محروم کر دیا جائے کہ وہ خود مسلمان جینا اور رہنا چاہتا ہے اور ملک میں بھی اسلام لانا چاہتا ہے تو یہ ایک بڑی شان دار اور تابناک مثال قائم ہو جائے گی۔'' اس سے ایک جوش پیدا ہوگا' ولولہ اُبھرے گا۔ اُمنگیں جوان ہوں گی اور کروٹیں لیں گی۔ اسلام کے حق میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا۔

آج سات سال پورے ہو چکے ہیں اور اب آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے۔ ان سات سالوں کا جو ماحصل ہے' اس کی بیلنس شیٹ کو دیکھتے ہیں تو شدید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آتا کہ کچھ controversies ہیں' کچھ بحثیں ہیں جو بڑے زور شور سے اخبارات و رسائل اور پبلک پلیٹ فارمز پر جاری ہیں جن کا حاصل ذہنی الجھاؤ' پراگندگی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بالکل ایک منفی کام ہے۔ عملی اعتبار سے ایک قدم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ زکوٰۃ کے بارے میں مَیں گزشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں کہ اس نے کیا شکل اختیار کی ہے۔ اب اقامتِ صلوٰۃ کا اقدام کیا گیا ہے۔ صلوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل کے متعلق اخبارات میں بیانات اور خبریں آ رہی ہیں۔ ٹی وی پر بھی اس کی بڑے زور شور سے تشہیر کی جا رہی ہے۔ جو لوگ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ اصل

میں الیکشن کے لیے تمہیدی قدم ہے' تو جس انداز سے یہ کام ہو رہا ہے اس کے پیش نظر اس خیال کو غلط قرار دینا مشکل ہے۔ یہ رمز بھی اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام فوج ہی کے ذریعے قائم کیا جا رہا ہے۔ اسے سول بیوروکریسی کے بجائے فوجی نظام کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ regime کا جو معہودِ ذہنی ہے' ان کے پیش نظر آئندہ کے لیے جو نقشہ ہے' اس میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ اس کی کوئی افادیت اور مصرف ہے۔ گویا نظام زکوٰۃ اور نظام اقامتِ صلوٰۃ کی پشت پر ایک سیاسی face اور image بنانا ہے' اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی وجوہ ہیں کہ مَیں سوچتا ہوں کہ ان معاملات میں اگر بولوں تو اس کا فائدہ کیا ہے! حاصل کیا ہے! پردے کے سلسلہ میں بھی گفتگو میرے اپنے کسی منصوبے اور ارادے کے تحت نہیں تھی' لیکن جب پوچھا جائے گا تو جو بات کتاب وسُنّت کے مطابق ہوگی وہ کہنی پڑے گی۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر اپنی دونوں تقریروں میں اپنی استعداد کی حد تک کتاب وسُنّت کی تعلیمات پیش کیں۔ یہ تقریریں ''میثاق'' کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع ہوئیں۔ ملک کے ایک مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت روزنامہ میں وہ قسط وار شائع ہوئیں۔ کتابی صورت میں بھی وہ اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ میں کیا اور میری بساط کیا! اس موضوع پر ہمارے نامور اور جید علمائے کرام کی نہایت مبسوط کتابیں پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن کیا موجودہ حکومت نے ان کتب سے کوئی استفادہ کیا! کیا اسلامک آئیڈیالوجی کونسل سے استصواب کیا کہ ستر وحجاب کے متعلق شریعت کے احکام کیا ہیں! مجھے یہ کہنے پر معاف کیا جائے کہ جو کام ترکی میں اتاترک نے اور ایران میں رضا شاہ پہلوی کا نام رکھنے والے دونوں بادشاہوں نے قانون' طاقت اور ڈنڈے کے زور سے کیا تھا' وہ موجودہ regime بڑی حکمتِ عملی سے انجام دے رہی ہے۔ ان سارے سالوں میں مغربی ذہن رکھنے والی خواتین کو نہ صرف یہ کہ کھلی چھوٹ دی گئی کہ نظام معاشرت کے خلاف وہ جتنا چاہیں زہر اُگلیں بلکہ انہیں نمایاں طور پر آگے بڑھایا گیا ہے اور بڑھایا جا رہا ہے۔ مختلف طور پر ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اس دور میں یہ کام جس پیمانے پر

ہوا ہے اس کا عشر عشیر بھی پہلے کے تیس برسوں میں نہیں ہوا تھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر قانونِ شہادت میں عورتوں سے متعلق شق پر اور قصاص و دیت کے مسودہ کے متعلق میں کچھ کہوں تو کیا کہوں! چونکہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے' پھر میرے سامنے حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث کا وہ حصہ بھی ہے جس پر صحابہ کرامؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے کہ عَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَانَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ لہٰذا اس مسئلہ پر قرآن و حدیث سے اپنی استعداد اور اپنے فہم کے مطابق جو کچھ مَیں نے سمجھا ہے وہ مَیں ان شاء اللہ بعد میں عرض کروں گا۔ اس وقت بطورِ یاددہانی اس کام کا اعادہ کر رہا ہوں' جس کے لیے مَیں نے اپنے آپ کو کھپا رکھا ہے۔ شاید کہ میری بات چند لوگوں کے دل میں اتر جائے اور وہ جمود کو ختم کر کے آگے بڑھیں۔ اس کام میں میرے اعوان و انصار بنیں یا اپنے طور پر منظم ہو کر اسی کام کی انجام دہی کی دھن ان کے سروں پر سوار ہو جائے۔

میری ترجیحات

مَیں نے قرآن حکیم اور سیرتِ مطہرہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو بھی معروضی مطالعہ کیا ہے اس کے نتیجے میں میرے سامنے کرنے کا اصل کام اور نہج یہ آیا ہے کہ دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو اُس وقت تک بطور نظامِ حیات نہ نافذ کیا جا سکتا ہے نہ وہ مستحکم رہ سکتا ہے جب تک معاشرے کے معتدبہ افراد میں مسلمان جینے' مسلمان مرنے کی collective will پیدا نہ ہو جائے۔ میں تو اس اجتماعی ارادے کو پیدا کرنے اور اِسے قوی کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس داعیہ کا براہِ راست تعلق ایمان سے ہے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اسی سرچشمہ رُشد و ہدایت کو عام کرنے کے لیے مَیں نے ۱۹۶۵ء سے اب تک تقریباً بیس سال اپنی جوانی کے کھپائے اور لگائے ہیں۔ اس کا کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں' یہ علیحدہ معاملہ ہے۔ میرے پیشِ نظر حالات کو بدلنے کی کوشش ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیت ہے۔ میری اُخروی نجات کے لیے شاید میری یہ حقیر کوشش کام آ جائے۔ مَیں اس کام میں ہمہ تن لگا ہوا ہوں اس لیے کہ میرا ایمان و یقین ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت کے پیغام اور

اس کے ساتھ صحیح تعلق ہی تجدید ایمان کا ذریعہ بنے گا۔ اسی سے ایمان کو تقویت حاصل ہو گی۔ یہی کام درحقیقت ہمارے معاشرے میں collective will کو پیدا کرنے کا موثر ترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر انفرادی سطح پر یہ ارادہ اور داعیہ پیدا ہو چکا ہے انہیں جمع کیا جائے' منظم کیا جائے اور اسلامی انقلاب کے لیے قرآن کے علوم و معارف اور اس کی حکمت کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے علمی و فکری سطح پر کام ہو۔ اسی منزل کی طرف پیش قدمی کے لیے سمع و طاعت کے اسلامی اصول پر ایک جماعت وجود میں آئے۔ میری پہلی کوشش کے لیے عنوان ہے: ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' جبکہ دوسری کوشش کا نام ہے: ''تنظیم اسلامی'' ۔ مَیں اپنی ساری مساعی' ساری صلاحیتیں ساری توانائیاں ان دونوں کاموں میں صَرف کر رہا ہوں۔

قصاص اور دیت

جہاں تک دِیت کا مسئلہ زیر بحث ہے' اس میں ایک اہم بات شاید لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ یہ قصاص والی دیت نہیں ہے۔ دِیتیں دو ہیں۔ ایک دیت تو وہ ہے جو قصاص کے ساتھ bracket ہو کر آتی ہے۔ ایک دیت بالکل علیحدہ ہے۔ ان دونوں کو جب تک آپ علیحدہ علیحدہ نہیں سمجھیں گے تو جو باتیں کہی جا رہی ہیں اور عقلی میدان میں جو گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں اس کا توڑ آپ کے لیے مشکل ہو گا۔ ایک ہے قتل عمد کا معاملہ' کہ ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی دوسرے شخص کو قتل کیا۔ اس کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے۔ قانونِ اسلامی میں اس کا عنوان ہے: قصاص۔ جان کے بدلے جان۔ اس میں جان بالکل برابر اور مساوی ہے' عورت کی بھی اور مرد کی بھی۔ اس میں کوئی فرق وامتیاز نہیں ہے۔ مقتول چاہے مرد ہو چاہے عورت' قاتل چاہے مرد ہو چاہے عورت' ان چاروں حالتوں میں مرد و عورت میں کوئی فرق وامتیاز نہیں ہو گا اس لیے کہ جانیں سب کی برابر اور مساوی ہیں۔ یہ قصاص جان کے بدلے جان ہے کہ قاتل کی جان اب مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم اور ان کی صوابدید پر منحصر کر دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو قاتل کی جان لینے ہی کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو قاتل یا اس کے لواحقین سے کوئی معاوضہ قبول کر کے اس کی جان بخشی کر دیں۔ ان دو میں سے کوئی

ایک فیصلہ کرنے کا بالکلیہ اختیار مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ اس میں حکومت کا عمل دخل یہ ہے کہ اس نے قاتل کو پکڑا۔ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے لیے یہ ممکن نہیں' اس کے لیے حکومت کی مشینری کی ضرورت ہے' جس میں پولیس ہے' عدالت ہے۔ پولیس نے قاتل کو پکڑا' تفتیش کی۔ قانون اور عدل کے تقاضوں کو پورا کیا۔ مقدمہ قائم ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ تمام processes سے گزر کر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا' ملزم کا جرم ثابت ہو گیا تو اس کے بعد حکومت کا اختیار اور عمل دخل ختم۔ اب اس میں صدرِ مملکت کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اگر ہے تو یہ بالکل غلط ہے' خلافِ اسلام ہے۔ (۱)

اسلامی قانون کے مطابق یہ اختیار بالکلیہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ وہ چاہیں تو قاتل یا قاتلہ کی جان لینے کا فیصلہ کریں۔ حکومت اس کو execute کرے گی۔ اگر چاہیں تو قاتل یا قاتلہ کی بلا دیت وقصاص جان بخشی کر دیں۔ اگر چاہیں تو قاتل یا مقتولہ یا ان کے ورثاء سے کوئی رقم بطورِ دیت قبول کر لیں۔ ایک اہم بات نوٹ کیجیے کہ یہ دیت جو قصاص کا قائم مقام بنتی ہے' اس کا تعین نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ جانبین کی باہمی

---

(۱) اس کی خلافت راشدہ میں نمایاں مثال ملتی ہے۔ ابولولو فیروز نے حضرت عمر فاروقؓ کو شہید کیا۔ اس کے بعد فوراً خودکشی کر لی۔ وہ گرفتار نہیں ہو سکا لیکن قرائن اور واقعاتی شہادتیں یہ تھیں کہ اس سازش میں ہرمزان بھی شریک تھا۔ وہ خلافت فاروقی میں مسلمان ہو چکا تھا اور مدینہ منورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھا۔ حضرت عبید ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رنج وغصہ سے مغلوب ہو کر ہرمزان کو قتل کر دیا جب کہ اس کو سازش میں ملوث ثابت کرنے کے لیے عدل وقانون کے متعلق کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت عبیدؓ کو گرفتار کیا گیا' ان پر قتل عمد کا مقدمہ چلا اور وہ مجرم قرار دیے گئے۔ ہرمزان کا کوئی وارث نہیں تھا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اسلامی قانون کے مطابق خلیفہ وقت اس کا وارث قرار پاتا ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت وارث دیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عبیدؓ کے مالی وسائل دیت ادا کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی نے اپنی جیب خاص سے مقرر کردہ دیت ادا کی اور وہ بیت المال میں داخل کی گئی۔ حضرت عبیدؓ کے لیے جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند ہیں' رحم کرنے کی کوئی اپیل خلیفۂ وقت کو پیش نہیں کی گئی۔ لہٰذا قاتل کو صوبائی گورنر یا صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کا حق دینا خلافِ اسلام ہے۔

رضامندی سے طے ہوگا۔ اس سارے معاملے میں اصل میں جان کا بدلہ تو جان ہی ہے' دیت کی رقم مقتول یا مقتولہ کی جان کی قیمت ہرگز نہیں ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاتل یا قاتلہ نے اپنی جان بچائی ہے اپنی جان کی قیمت ادا کر کے۔ دیت درحقیقت قاتل کی جان کا معاوضہ ہے نہ کہ مقتول کی جان کی قیمت۔ یہ ہے قتل عمد کا معاملہ۔ اس میں مرد کی پوری اور عورت کی آدھی دیت کا سرے سے مسئلہ زیر بحث آتا ہی نہیں۔

دوسرا مسئلہ ہے قتل خطا کا جس میں قاتل یا قاتلہ کا اپنا کوئی ارادہ شامل تھا ہی نہیں۔ آپ گاڑی میں جا رہے ہیں کہ اچانک اور ناگہانی کوئی شخص آپ کی گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا' آپ کی اس سے دشمنی نہیں تھی۔ یا یہ کہ آپ کی دیوار کے نیچے کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا' وہ دیوار گر گئی اور اس کے نیچے بیٹھا شخص ہلاک ہو گیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یا آپ نے گولی چلائی تھی کسی شکار پر' وہ جا لگی کسی انسان کو۔ آپ کا قطعاً کوئی ارادہ اس شخص کو مارنے کا نہیں تھا۔ قتل خطا کی اور بھی بہت سی شکلیں اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ اسلامی قانون کا ضابطہ یہ ہے کہ قتل خطا کے معاملے میں جان کے بدلے جان نہیں ہے' اس لیے کہ جان لینا اس قاتل کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔

قتل خطا میں مقتول یا مقتولہ کے لیے جو دیت مقرر کی جائے گی وہ اس بنیاد پر ہے کہ اس خاندان کا نقصان کتنا ہوا ہے۔ قاتل کا جرم اس اعتبار سے تو نہیں ہے کہ اس کا قتل کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ کسی اعتبار سے بھی قتل عمد کا مرتکب نہیں ہے' لہٰذا اس قتل کی سزا کا ضابطہ جان کے بدلے جان نہیں ہے۔ البتہ اس خاندان کا تو نقصان ہو گیا ہے جس کا فرد مقتول ہوا ہے۔ اس نقصان کی تلافی تو ہونی چاہیے۔ اس کا compensation تو ہونا چاہیے۔ اس کی تلافی حکومت اپنے بیت المال سے بھی کر سکتی ہے جب کہ قتل خطا کا مجرم خود یا اس کے قریب ترین اعزہ اس کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اصلاً یہ تلافی اسلام نے اُس پر ڈالی ہے جو اس قتل خطا کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ حکمت ہے کہ اس سے احتیاط کا عنصر پیدا ہوگا۔ اگر اسے ہر صورت میں حکومت کے ذمے ڈال دیا جائے تو لوگوں میں احتیاط پیدا نہیں ہو گی۔ البتہ مستثنیات میں یہ تلافی بیت المال سے حکومت کر سکتی ہے'

لیکن یہ جان کی قیمت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ اس نقصان کی تلافی ہے جو کسی فرد کے ہلاک ہوجانے کے سبب سے اس کے خاندان کو پہنچا ہے۔

اس دیت میں اسلام کے نزدیک مرد اور عورت میں فرق ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام میں معاش کا بوجھ عورت کے ذمے نہیں ڈالا گیا جب کہ مرد کسی خاندان کا ایک earning member ہے۔ وہ خاندان کی کفالت کے نظام کا ایک رکن ہے۔ لٰہذا خاندان کے کسی مرد کا قتل خطا کے نتیجے میں ہلاک ہوجانا بڑا نقصان ہے بہ نسبت اس کے کہ اس طور پر اس خاندان کی کوئی خاتون ہلاک ہوجائے۔ چنانچہ شریعت نے اس میں یہ فرق رکھا ہے کہ قتل خطا میں مرد کی دیت کے مقابلے میں عورت کی دیت آدھی ہوجائے گی۔

اس کی حکمت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہر سلیم العقل انسان اس کی معقولیت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے خلاف ایک عقلی دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں تو عورتیں بھی کمانے والی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ شریعت کی کسی نص کے خلاف کوئی عقلی دلیل دینا ایمان کے بالکل منافی ہے' اس طرزِ فکر سے ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے' میں یہ کہتا ہوں کہ بِناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ اسلام کے منشا کے خلاف آپ نے ایک کارروائی شروع کی ہے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا کہ عورت پر معاش کی ذمہ داری ڈالی جائے' اس پر کچھ اور ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔ آپ نے خود یہ ذمہ داری عورت پر بھی ڈال دی اور اپنی اس غلط روش کو اسلام کے ایک دوسرے قانون کے خلاف دلیل بنا رہے ہیں۔ اسلام کا نظام اور قانون تو پورا کا پورا منطقی طور پر اور مربوط طور پر ایک وحدت ہے' ایک اکائی ہے۔ وراثت میں بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دگنا حصہ دیا ہے' اس لیے کہ بیٹے کو اپنے خاندان کی کفالت کرنی ہے جب کہ بیٹی کی کفالت اس کے شوہر کے ذمہ ہو گی۔ عورت کا ایک قانونی تشخص ہے' لٰہذا وہ بھی اپنے والدین کے ترکے کی حق دار تو ہے لیکن بھائی کے مقابلے میں اس کا حصہ نصف کردیا گیا۔ لٰہذا اسلامی قانون کو جس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مربوط حکیمانہ نظام ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ ہے' اور یہ فلسفہ تمام جزئیات کو govern کرتا ہے۔ اب اگر اس پورے قانون سے ہٹ کر

کوئی روش اختیار کریں گے، پھر اس سے اسلام کے کسی دوسرے قانون کے خلاف دلیل لائیں گے تو یہ میرے نزدیک بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ ایک غلط چیز پر بنیاد رکھ کر دوسری صحیح چیز کو غلط قرار دینا ہے۔ یہ درحقیقت اسی قبیل کی شے ہے جو آج کل قصاص و دیت کے مسئلہ میں سامنے لائی جا رہی ہے۔

عقل و نقل کا معاملہ

اب آیئے ایک اہم اصول کی طرف۔ جہاں تک نقل کا معاملہ ہے تو ہمارے دین میں نقل کو عقل کے مقابلے میں اقدمیت واولیت حاصل ہے جس کے قدرے تفصیلی دلائل میں دورانِ گفتگو پیش کروں گا۔ اس ضمن میں مَیں نے رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں رجم کے متعلق گفتگو میں ایک بڑی علمی شخصیت جو عالم دین ہونے کے ساتھ صاحب تفسیر بھی ہیں، رجم کے بارے میں ان کی رائے پر تنقید کی تھی۔ پھر ان کے ایک شاگرد جوان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں، انہوں نے غامدیہ خاتون کے متعلق یہ نازیبا بات کہی تھی بلکہ بہتان گھڑا تھا کہ ''وہ چکلا چلاتی تھی اس لیے اُسے رجم کیا گیا تھا۔'' یہی نوجوان ہیں جنہوں نے چند سال پہلے اپنے رسالے میں لکھا تھا کہ اسلام کے صحیح قانون وراثت اور کلالہ کے صحیح معنی ومفہوم اور قانون کو آج تک کسی نے سمجھا ہی نہیں۔ اس کو بس انہوں نے ہی سمجھا ہے جسے وہ اب بیان کر رہے ہیں۔ تو بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ والا معاملہ سامنے آ رہا ہے۔

شریعت کے معاملے میں یہ بات جان لیجیے کہ جہاں کہیں بھی یہ آمادگی پیدا ہو جائے گی کہ مجھے مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے اس کے لیے سب سے پہلی دلیل یقیناً قرآن مجید ہے۔ البتہ دین میں وہ تنہا دلیل نہیں ہے، اسی لیے مَیں نے اُسے پہلی دلیل کہا ہے۔ جو قرآن حکیم کو تنہا اور واحد دلیل سمجھتا ہے اس کا راستہ ہم سے جدا ہے۔ ہم ہیں اہل السنہ کہ جنہوں نے سنت کو دوسری دلیل مانا ہے۔ ہمارے نزدیک دلیل اوّل ہے قرآن مجید اور دلیل ثانی ہے سنت رسول ﷺ۔ یہ بھی جان لیجیے کہ درحقیقت سنت رسول ﷺ قرآن کے تابع ہو کر دلیل نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ ایک برابر کی دلیل ہے۔ یہ دوستون (ہیں)

جن پر شریعت کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ سنتِ رسول ﷺ میں کسی معاملہ میں ابہام ہے۔ کہیں دو چیزیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ یہاں بظاہر کے لفظ کو پیشِ نظر رکھیے' اس لیے کہ یہ چیز ثابت ہے کہ محدثینِ عظام نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا کر چھان پھٹک کی ہے اور پھر فقہاء کرام نے اس کے اندر عقلی اعتبار سے' استدلال کے ذریعے سے مطابقت پیدا کی ہے۔ ایک حدیث عام بات بیان کر رہی ہے' دوسری حدیث کے اندر خاص بات بیان ہوئی ہے تو پہلی حدیث گویا دوسری حدیث کے اتنے حصے کی ناسخ ہو جائے گی جو اس میں خصوص کا پہلو ہے۔ عام والا حصہ باقی رہ جائے گا' خاص والا معاملہ اب اس دوسری حدیث کی رو سے طے ہو گا۔ یہ معاملہ دنیا میں ہر جگہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی ہے عام و خاص۔ یہی حدیث کے اندر معاملہ ہے۔

اس کے بعد تیسری دلیل ہمارے یہاں سنتِ رسول ﷺ کے بعد ہے سنتِ خلفاء راشدین مہدیین۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ایک طویل حدیث کے دوران یہ ارشاد آیا ہے:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ' عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))

''تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو جو میرے ہدایت یافتہ ہیں۔ پکڑو ان کو مضبوطی سے اپنے دانتوں کے ساتھ' داڑھوں اور کچلیوں کے ساتھ۔''

یہ فرمانِ محمدی ہے ﷺ! یہاں کلمہ ''فا'' بہت معنی خیز ہے' جو تمام اختلافات کے لیے پناہ گاہ کی طرف دلالت کر رہا ہے۔ خلفاء راشدین کی سنت دراصل رسول اللہ ﷺ کی سنت ہی کا تتمہ ہے۔

اس کے بعد ہمارے پاس چوتھی دلیل ہے ائمہ دین' فقہاء استنباطات' ان کی تعبیرات اور ان کے قیاسات و اجتہادات۔ شاید کچھ لوگ سمجھتے ہوں کہ ان پر قرآن آج نازل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اُسے interpret کر دیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے' جو تاریک نہیں بلکہ بہت روشن ہے۔ اس میں ایسے ائمہ دین گزرے ہیں جنہوں نے بڑی

باجبروت حکومتوں کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اُس رائے کا اظہار کیا ہے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ حکومتِ وقت کے خلاف رائے دے رہے ہیں۔ اُن کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ چہرے پر سیاہی مل کر اور گدھے پر بٹھا کر پورے مدینہ میں پھرایا جا رہا ہے لیکن اس حال میں بھی وہ کہہ رہے ہیں: ''جو مجھے جانتا ہے' وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ مَیں مالک ابن انس ہوں اور میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کر کے اگر طلاق دلا دی جائے تو وہ طلاق ہوگی یا نہیں ہوگی!

یہ علیحدہ بحث ہے کہ کسی کو امام مالکؒ کی رائے سے اختلاف ہو لیکن ہمارے ائمہ دین وہ ہیں جو کسی جبر اور تشدد کے سامنے نہیں جھکے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جیلیں کاٹی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انہیں زہر دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے سختیاں برداشت کی ہیں' کئی بار شہر بدر کیے گئے۔ امام ابن حنبلؒ نے وہ ماریں کھائی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہاتھی کی پیٹھ پر وہ مار پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ امام ابن تیمیہؒ دو مرتبہ محبوس کیے گئے۔ قید کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ تو کیا ان ائمہ کے بارے میں ہم یہ سمجھیں کہ دین اور شریعت کے بارے میں غور و فکر اور صحیح تر رائے تک پہنچنے میں انہوں نے کوئی کسر چھوڑ دی ہوگی؟ انہوں نے کیا یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہوگی کہ فلاں فلاں مسائل میں قرآن کا صریح تقاضا کیا ہے اور سنت کی نصوص کون کون سی ہیں؟ وہ مسائل کون کون سے ہیں جن پر خیر القرون سے اجماع اور تواترِ عمل چلا آ رہا ہے؟ رہے ایسے مسائل جن کی تعبیر و قیاس کے بارے میں اختلاف ہے' ان کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ ان میں البتہ ایک گنجائش ہوگی۔ میرے لیے بھی' آپ کے لیے بھی۔ خلف کے علماء کے لیے بھی گنجائش ہوگی کہ وہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں' یہ بھی امام دین' اور امام فقہ ہیں' امامِ حدیث ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے' ان کی رائے یہ ہے۔ تو فقہی مسائل میں میدان وسیع ہو گیا۔

البتہ یہ بات جان لیجیے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل ہو' ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو' سلفی مسلک رکھنے والوں کا اتفاق ہو ان سے باہر نکلنا

میرے نزدیک فتنہ ہے۔

یہ محض جذباتی بات نہیں ہے بلکہ نہایت غور وفکر کے نتیجے میں میری پختہ اور اٹل رائے ہے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل موجود ہو‘ ائمہ اربعہ کا اتفاق موجود ہو‘ محدثین متفق ہوں‘ تمام واجب الاحترام اور معتمد ترین رجال دین کی رائے جن مسائل میں یکجا ہو جائے وہ مجمع علیہ مسائل کی فہرست میں ہیں۔ اسی کا نام اجماع ہے۔ یہ اجماع بھی دین میں حجت ہے۔ یہ چوتھی دلیل کا حاصل ہے۔ اُس کے خلاف رائے دینا اور اپنی رائے پر اصرار کیے جانا میرے نزدیک یقیناً اور لاریب فتنہ ہے۔

میرے بعض احباب کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہے کہ مَیں شاید ایک خاص معاملے میں سختی کر رہا ہوں۔ بعض نے مجھ سے کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ مَیں ان تمام حضرات سے گزارش کروں گا کہ خدارا شخصیتوں کو سامنے رکھ کر نہ سوچیے بلکہ یہ سوچیے کہ مجمع علیہ مسائل یا اجماع سے ہٹ کر کسی نص‘ کسی دینی مسئلہ اور متفق علیہ حدود شرعیہ کے خلاف راستہ نکالنا‘ رائے دینا اور اجتہاد کرنا اسلاف کے ساتھ قطع تعلق ہے یا نہیں! ان تمام کی متفق علیہ رائے پر اظہار عدم اعتماد ہے کہ نہیں! اس معاملے میں‘ مَیں کسی مداہنت کا روادار نہیں۔ مَیں اسے حمیت وغیرتِ دین کے منافی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک خلفاء راشدین‘ مجتہدین‘ محدثین کرام کی مجمع علیہ‘ متفق علیہ رائے اور مسائل کے خلاف اب کوئی رائے دینا اور کوئی نئی راہ نکالنا یقیناً فتنہ ہے۔

یہ ہیں وہ اصل الاصول جن کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیے۔ یہی معاملہ رجم کا ہے۔ زنا کی حد آیتِ قرآن کے بموجب سو کوڑے غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے لیکن اُسے سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے‘ اور سنت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے شادی شدہ مرد اور عورت کی طرف سے زنا کے ارتکابِ جرم پر رجم کو مستقل حد قرار دے کر خاص کر دیا۔ اس پر اجماع چلا آ رہا ہے۔ خلفاء راشدین مہدیین کے تعامل وتواتر کی پوری طرح تحقیق کے بعد فقہ کے مشہور ائمہ اربعہ نے شادی شدہ مرد وعورت کے لیے رجم کو ''حد'' قرار دیا۔ لہٰذا اس پر تواتر کے ساتھ اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل ہے۔ یہ ثابت شدہ سنت

ہے۔ احادیث نبویہ ہیں۔ سنت اور حدیث دونوں جمع ہو گئیں۔ پھر یہ کہ خلفاء اربعہؓ کا اس پر عمل ہے۔ ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ نہ صرف ائمہ اربعہ' بلکہ امام بخاریؒ' امام مسلمؒ امام ابن حزم ظاہریؒ الغرض اہل سنت کے تمام معتمد علیہ محدثین کا اس مسئلہ میں کامل اتفاق ہے۔ اسی طرح اہل تشیع جو بالکل علیحدہ فرقہ ہے' اس کے مستند ائمہ فقہ جن میں امام جعفر صادقؒ اور امام زیدؒ شامل ہیں' سب کے سب اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی اسلامی مستقل حد ''رجم'' ہے۔ خوارج اور گنتی کے چند معتزلہ ہیں جو اسے حد تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فرقے اہل سنت والجماعت سے علیحدہ تسلیم کیے گئے ہیں اور تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے۔ اب آپ خود ہی نتیجہ نکال لیجیے کہ اس متفق علیہ اور مجمع علیہ مسئلے کے خلاف ایک نیا راستہ نکالنا اگر فتنہ نہیں تو کیا ہے!

قصاص و دیت کے مسئلہ کو بھی انہی دلائل سے سمجھ لیجیے جو رجم کے اسلامی حد ہونے کے بارے میں مَیں نے پیش کیے ہیں چونکہ اصول تو ایک ہی ہیں۔ قرآن مجید میں قصاص والا مسئلہ سورۃ البقرہ میں زیرِ بحث آیا ہے اور قتل خطا کی دیت کا ذکر سورۃ النساء میں ہے' لیکن مقادیر وغیرہ کا کوئی ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں عورت اور مرد میں فرق ہے یا برابری' اس کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ قرآن مجید کے دو اصول اور ہیں جن کو دینی اصطلاح میں ''نص'' کہا جاتا ہے' یعنی اس کی لفظ بلفظ (literally) تعمیل ہو گی۔ ایک عورت کی شہادت کا معاملہ ہے تو وہ مرد کی شہادت سے نصف ہو گئی۔ دوسرے وراثت کے پورے قانون کو دیکھیں گے تو عورت ترکہ میں مرد کے مقابلے میں نصف کی حق دار بنتی ہے۔ دلالۃ النص سے اگر کوئی چیز ثابت کرنا چاہیں تو یہ دو اصول قرآن میں موجود ہیں' لیکن اور کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف آیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث quote ہو رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث ہے جسے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت عمرو بن حزمؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تحریر لکھوا کر دی' وہی quote ہو رہی ہے۔ اس میں ایک کلی قانون بیان ہوا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ فِي النَّفْسِ الْمُؤْمِنَةِ مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ ''ایک مومن جان کی

دیت قتل خطا کی صورت میں سو اونٹ ہوں گے"۔ ایک مومن جان یہاں چونکہ عام ہے لہٰذا اس کا اطلاق دونوں پر ہو سکتا ہے' مؤمن مرد پر بھی اور مؤمن عورت پر بھی۔ ایک دوسری حدیث میں یہ بات بھی موجود ہے: دية المرأة على النصف من دية الرجل "عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہے"۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک حدیث نے دوسری حدیث کو خاص کر دیا۔

ایک میں عام یہ ہے کہ قتل خطا کے مقابلے میں ایک مومن جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ دوسرا قولِ نبوی ﷺ موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ ہم عام و خاص کی نسبت سے دونوں حدیثوں کو مانتے ہیں۔ دونوں کے مابین ایک ربط قائم ہے کہ ایک عام بات حضور ﷺ نے فرمائی جس کے ایک جزو کی حد تک کی خصوص دوسرے قول سے ہو گیا۔ لہٰذا ان دونوں کو سامنے رکھیے تو مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا۔ جو شخص اتباعِ رسول کا جذبہ رکھتا ہو گا اُسے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ملے گی۔ وہ کوئی اپنا قول نہیں لگائے گا' اپنی کوئی دلیل نہیں دے گا۔

ہمارے چار خلفاء راشدین مہدیین میں سے تین کے اقوال موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے اقوال موجود ہیں کہ قتل خطا میں عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ اسی پر ان کا قول' اسی پر ان کا عمل۔ صحابہ کرامؓ میں سے تین عبادلہ بہت مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وہ صحابی ہیں جن سے ساری فقہ حنفیہ چلی ہے۔ اسی لیے اس کو فقہ عبداللہ ابن مسعودؓ بھی کہا جاتا ہے' چونکہ کئی واسطوں سے ان ہی کے پیرو ہیں امام ابوحنیفہؒ۔ دوسرے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جن کے لیے حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ اس نوجوان کو قرآن کا علم عطا فرما دے"۔ وہ حبرالامۃ کہلاتے ہیں' امت کے سب سے بڑے عالم۔ لہٰذا جو اکثر تفسیری روایات ہیں' عموماً ان کے متعلق ہر معتمد تفسیر میں آخری بات حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی ملے گی۔ تیسرے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حدیث کے سلسلے میں جو سلسلۃ الذہب مشہور ہے' جو سنہری زنجیر ہے' اس کی پہلی کڑی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہیں۔ یہ تین عبادلہ اس اعتبار سے

بہت مشہور ہیں۔ ان تینوں کے اقوال بھی اس کے حق میں موجود ہیں۔ پھر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَفْرَضُ أُمَّتِي زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ)) ''میری امت میں قانونِ وراثت کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں۔'' ان کا قول اس کے حق میں موجود ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جس میں یہ جذبہ پیدا ہو چکا ہو کہ مجھے اسلام پر چلنا ہے' اس مسئلہ میں اتنے شواہد کے بعد بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

ائمہ اربعہ امام امالک' امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا اس پر اتفاق ہے۔ مزید یہ کہ اہل تشیع کے دو ائمہ امام جعفر صادق اور امام زید رحمہا اللہ کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ جس شخص کے دل میں کوئی رمق بھی ایسی موجود ہو کہ وہ اسلام کے مجمع علیہ' متفق علیہ تمام مسائل کو تسلیم کرنا چاہتا ہے' وہ اس مسئلہ میں کوئی اپنی علیحدہ رائے رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے؟ یوں تو کوئی شاذ رائے اکثر معاملات میں مل جائے گی۔ مجمع علیہ اور متفق علیہ آراء کے مقابلے میں شاذ رائے کی کھوج کرید کرنا اور اس سے دلیل پکڑنا چاہے وہ رائے الاصم کی ہو چاہے ابن علیہ کی ہو' آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کا علمی اعتبار سے مقام ومرتبہ کیا ہے! ان کی حیثیت کیا ہے! اہل سنت کے چار مسلک ہیں' سلفی اور ظاہری مسلک ہیں' کیا ان میں سے کسی میں ان کی رائے اور قول کی کوئی اہمیت اور حیثیت ہے! صحابہؓ بالخصوص تین خلفاء راشدین کے قول وعمل' تابعینؒ' تبع تابعین' ائمہ اربعہ اور تمام معتمد فقہائے اسلام کی مجمع علیہ اور متفق علیہ رائے کے مقابلے میں اِدھر اُدھر سے کھود کرید کر کے کسی شاذ اور غیر معروف قول پر استدلال کی عمارت کھڑی کرنا اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ اصل میں پیروی تو کرنی نہیں' وہ ارادہ موجود ہی نہیں کہ ہم کو اسلام پر چلنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ لہٰذا یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ آدمی کے پاس زبان ہے اور گز گز بھر کی زبان بھی موجود ہے اور لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے جن کو اخبارات نے گزوں لمبا کر دیا ہے۔ پہلے قلم کا اتنا فتنہ نہیں تھا' اس دور میں اخبارات کے ذریعے سے یہ فتنہ شدید تر ہو گیا ہے۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ controversies زیادہ

سے زیادہ پیدا ہوں۔ سیاست کا میدان تو بند پڑا ہے۔ اس کے حوالے سے جو گرما گرمی ہوتی تھی' نمک مرچ ملتا تھا اور اخبارات کی زینت بنتا تھا' وہ موجود نہیں۔ اب جہاں سے بھی بحث و تمحیص کا دروازہ کھل جائے اسے وہ نمایاں کریں گے' چونکہ اس میں ان کے قارئین کی دلچسپی کا سامان ہے۔ اس کے سوا ان کے پیش نظر کوئی مثبت یا منفی مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی منفی تعلق ہو تو ہو' باقی مثبت تعلق کا تو ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں ملے گا۔ یہ ہے اصل معاملہ کہ اگر کسی کو بات سمجھنی ہو اور فی الواقع سمجھنا ہو تو اس میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قتل خطا میں مرد کے مقابلے میں عورت کی دیت نصف ہے۔

یہ ذہن میں رکھیے کہ دو چیزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر وہ will ہے یا نہیں؟ فیصلہ کن بات یہ ہے۔ دوسری یہ کہ جب انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ خواہش پیدا ہو جائے تو پھر عمل کے لیے ترتیب یہ ہے کہ پہلے اللہ کی کتاب ہے' پھر سنت رسولؐ ہے۔ اس میں صحابہ کرامؓ کے اقوال بھی آ جائیں گے' اس لیے کہ انہیں بھی احادیث کہا جاتا ہے۔ جو مرفوع نہیں موقوف ہیں وہ بھی حدیث کے درجے میں شمار ہوتی ہیں اور سنت کا ایک جزو ہیں۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے دو ارشادات دلالت کرتے ہیں۔ پہلا ارشاد ایک حدیث کا آخری حصہ ہے: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) ''ہدایت یافتہ اور راہ یاب لوگ وہ ہوں گے جو میرے (یعنی نبی اکرم ﷺ) طریقے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلیں گے۔'' دوسرا ارشاد ہے: ((أَصْحَابِي كَالنُّجُوْمِ فَبِأَيِّهِم اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ)) ''میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں' ان میں سے تم جس کی بھی پیروی اختیار کرو گے راہ یاب ہو گے۔'' پھر خاص طور پر خلفاء اربعہؓ کی سنت ہے' جس کے سنت ہونے پر ہمارے تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقانی بلکہ پوری اُمت کا اجماع ہے۔ اس کے لیے دلیل رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جو مَیں نے آغاز میں آپ کو سنائی تھی۔ اس کی تشریح کی اس پُرفتن دور میں ہم کو سخت احتیاج ہے۔

یہ حدیث حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ امام ابوداودؒ اور امام ترمذیؒ نے اسے ''حدیث حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ راوی ہیں کہ

وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَةً وَّجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ
''رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اور نصیحت ایسی تھی کہ اس سے قلوب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ لرز گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔''
فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا ''ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ نصیحت تو ایسے محسوس ہو رہی ہے جیسے آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں! (اگر یہ اسی نوعیت کی ہے) تو ہمیں مزید وصیت و نصیحت فرمائیے''۔ قَالَ: ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ)) ''حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور سمع و طاعت کی روش پر کاربند رہنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ تمہارا امیر ایک غلام ہی کیوں نہ ہو!'' اس وصیت کے آخری حصے میں یہ حکمت ہے کہ غلام یا غلام زادے کا امیر بننا عرب جیسی آزاد اور خودسر قوم کے نفس پر بڑا شاق گزرنے کا احتمال تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کی پیش بندی فرما دی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ''تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا۔'' آگے حضور ﷺ ہدایت اور راہنمائی فرما رہے ہیں کہ اختلافات کے زمانے میں امت کے لیے مشعلِ راہ کون سی ہے، روشنی کا مینار کون سا ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''پس تم پر واجب ہے، لازم ہے کہ میری سنت اور میرے تربیت و ہدایت یافتہ، صراطِ مستقیم پر گامزن خلفاءؓ کی سنت کو کچلیوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامنا۔'' آگے فرمایا: ((وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''اور دیکھنا دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہو گی اور بدعت گمراہی ہوتی ہے۔''

اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہاء کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے علیحدہ اور اُس سے باہر کوئی نیا راستہ کوئی ایسا شخص نہیں نکالے گا جس کے دل میں حقیقی دین پر عمل پیرا ہونے کے جذبے کی کوئی رمق بھی موجود ہو۔ اگر نکالے گا تو وہ

اسی دائرے اور اسی زمرے میں آجائے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ (آل عمران) ''جو شخص بھی فرماں برداری (اسلام) کے سوا کوئی اور طریقہ اور راستہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامراد و خاسر رہے گا۔'' لہٰذا جو بھی اسلام کے احکام وقوانین کے علاوہ کسی دوسرے ضابطے اور طریقے کا متلاشی ہے' وہ تو باہر اِدھر اُدھر جھانکے گا اور اپنی رائے کے لیے عقلی اور نقلی دلیلیں گھڑے گا۔ یوں وہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا کے زمرے میں آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب اور تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے!

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو مَیں پورے انشراحِ صدر سے کہتا ہوں کہ عقل بھی اس کے حق میں ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے کہ قوتِ کار کے اعتبار سے اور معاشی کفالت کے لحاظ سے مرد کی منفعت عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس دلیل سے میراث' قانونِ شہادت اور قتل خطا کی صورت میں عورت کی دیت میں نصف کی نسبت عقل کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح رجم کے ''حد'' ہونے کے منکرین بھی عقل کے اعتبار سے اندھے اور کور چشم ہیں کہ عقلی اعتبار سے یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی برابر کے مجرم ہیں۔ ذرا ان کی عقل پر ماتم کیجیے۔ ایک پیٹ بھرا انسان چوری کرے اور ایک بھوکا انسان چوری کرے' کیا یہ برابر ہو جائیں گے؟ ایک چوری ہیرے جواہرات کی ہے' ایک چوری روٹی کی ہے یا راہ چلتے کسی باغ کے پھل توڑ کر اپنا پیٹ بھرا گیا ہے۔ کیا یہ چوریاں برابر سمجھی جائیں گی؟ شریعت نے انہیں برابر نہیں رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں قحط کی حالت میں قطع ید کی سزا بالکل ساقط کر دی تھی' اس لیے کہ شبہ موجود تھا کہ انسان چاہے چوری کسی شکل میں کر رہا ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ بھوک اس کا اصل سبب بن گیا ہو۔ تو کہاں ایک پیٹ بھرے انسان کا چوری کرنا اور کہاں ایک بھوکے انسان کا چوری کرنا! اسی پر قیاس کیجیے کہ کہاں ایک شادی شدہ انسان کا زنا کرنا اور کہاں ایک غیر شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! کیا عقل اس کو برابر تسلیم کر سکتی ہے! میں سمجھتا

ہوں کہ اُن لوگوں کی عقل پر آنسو بہایئے اور ان کے حق میں دعا کیجیے جو ان دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں' حالانکہ وہ بڑے عقل پسند اور عقل پرست ہونے کے دعویدار ہیں۔

یہی معاملہ قصاص اور دیت کا ہے کہ اس مسئلہ میں خلطِ مبحث کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا کی دیت جان کی قیمت ہے ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ قتل عمد میں آتا ہے اور وہاں بھی اصل الاصول یہ ہے کہ جان کی قیمت جان ہے' پیسہ نہیں ہے۔ قاتل کی جان تو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اب قاتل کی جان ان کے رحم وکرم پر ہے۔ وہ چاہیں تو اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں' چاہیں تو قاتل کی جان کا معاوضہ قبول کر لیں۔ گویا قتل عمد کی دیت دے کر قاتل اپنی جان بچاتا ہے' وہ مقتول کی جان کا معاوضہ نہیں ہے اس لیے کہ مقتول کی جان کے بدلے تو قاتل کی جان حاضر ہے۔ البتہ قتل خطا میں جان کی قیمت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ کسی حد تک اس نقصان کی تلافی ہے جو مقتول کے خاندان کو پہنچا ہے۔ اس میں یقیناً عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے اور وہ اس ذمہ داری اور اسلام کے فلسفہ عمرانیات کے اعتبار سے ہے کہ مرد earning hand ہے' عورت نہیں ہے۔ کسی خاندان کے مرد کا خطا سے کسی کے ہاتھوں یا کسی کی بے احتیاطی سے ہلاک ہو جانا زیادہ بڑا نقصان ہے بمقابلہ عورت کے۔ یہ عقلی بنیاد بھی موجود ہے جس کے باعث شریعت میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔

یہاں ایک اور اہم بات عرض کر دوں۔ اگر عقل حاکم ہو جائے گی نقل پر تو یہ اسلام کے خلاف راستہ ہے۔ اسلام اصلاً عقل پر نہیں بلکہ نقل پر قائم ہے۔ وحی نقل ہے' جو اللہ کی جانب سے بذریعہ جبریل امین علیہ السلام منقول کی گئی ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ قرآن بھی منقول ہے' یہ بھی ایک روایت ہے۔ اس کے راوی اوّل جبریل امینؑ اور راوی دوم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر یہ روایت چلی آ رہی ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن صحابہ کرام کو دیا' صحابہ سے تابعین کو ملا' ان سے تبع تابعینؒ نے لیا اور اس طرح نسلاً بعد نسل قرآن مجید روایت اور نقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا اور اسی طرح یہ نقل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ قرآن نقل ہے' اس کی اساس عقل پر نہیں ہے۔ البتہ جب آپ عقل کو اس کے

تابع رکھ کر اس سے کام لیں گے تو یہ بڑی مفید شے ہے' بڑی طاقت ور شے ہے۔ یہ عقل آپ کو اس نقل پر مطمئن کرے گی۔ اس بات کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے

قرآن مجید میں بھی بار بار دعوت ہے کہ قرآن کو پڑھو' اس پر غور و تدبر کرو' اس کے فہم کے لیے عقل سے کام لو۔ متعدد آیات میں سے دو کے حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۃ الروم میں فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی (کی چمک) دکھاتا ہے خوف اور اُمید کے ساتھ اور وہ برساتا ہے آسمان سے پانی' پھر زندہ کرتا ہے اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔'' سورۃ یٰسٓ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ﴾ ''اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اس کی خلقت میں ضعف پیدا کر دیتے ہیں۔ تو کیا یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟'' قرآن جو اصلاً نقل ہے اس کے لیے عقل کلید اور دلیل کا کام دے سکتی ہے لیکن مجرد عقل معرفتِ الٰہی' شریعت کے حکم اور رموز' صحیح فہم و ادراک کے لیے ہرگز کفایت نہیں کرے گی۔ اس کو بھی علامہ اقبال نے خوب ادا کیا ہے

عقل گو آستاں سے' دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

لیکن! یہ ''لیکن'' نہایت قابلِ غور ہے۔ it is a very big but اگر آپ نے اس نقل یعنی قرآن پر عقل کو حاکم بنا دیا تو جان لیجیے چاہے آپ کہتے رہیں کہ آپ قرآن کو مانتے ہیں' درحقیقت آپ اسے نہیں بلکہ اپنی عقل کو مانتے ہیں اور اسی کی رو سے قرآن کو interpret کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں عملی اعتبار سے قرآن کی interpretation

بالکل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ پھر اگر ہماری تاریخ کے ادوار میں حضور ﷺ سے تاامروز جن مسائل میں تسلسل‘ تواتر اور اجماع موجود ہو تو دوسری کوئی بات کہنے کا کسی کو کوئی حق ہی نہیں ہے‘ اِلّا یہ کہ قرآن پر کسی وجہ سے اعتماد نہ رہا کہ یہ مُنَزَّل من اللہ ہے اور دل میں شک اور ریب کے کانٹے چبھ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس گمراہی اور ضلالت سے مجھے‘ آپ کو اور جمیع المسلمین کو اپنی حفظ وامان میں رکھے!

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

***